آج

٦٧

علاء الاسوانی

شاندور مارئی

اینا کیون

ایوان بونین

ڈورِس لیسنگ

علی اکبر ناطق

ترتیب

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 67

جولائی 2010

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 600 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 70 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,

Ontario M1V 3G1, Canada.

Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374

E-mail: bbakht@rogers.com

Scanned with CamScanner

ترتیب

علاء الاسوانی

7

جو قریب آیا، جس نے دیکھا

(ناولا)

❁

شاندور مارئی

103

ایستھر کا ورثہ

(ناولا)

❁

اینا کیون

205

گمشدہ چیزوں کے درمیان

ایوان بونین

213

سان فرانسسکو کا شریف زادہ

Scanned with CamScanner

ڈورس لیسنگ
239
بوڑھا سردار مشلانگا

❁

علی اکبر ناطق
259
معمار کے ہاتھ
274
شہابو خلیفہ کا شک
285
مومن والا کا سفر
292
شاہ مدار کی پازیبیں
302
تابوت
309
شریکا

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج
(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

تیسری جنس
سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

ریت پہ بہتا پانی
(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

Rs.100

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ
ارشد محمود

R s.200

شہزادہ احتجاب
(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

اردو کا ابتدائی زمانہ
(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

اِنکی کے دیس میں
(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

دوسری زبانوں کے ناول

خیمہ
میرال الطحاوی
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.75

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل
لیلیٰ العلمی
انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن
Rs.100

سرزمین مصر میں جنگ
یوسف القعید
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.125

پہلی بارش
خولیولیامازاریس
انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال
Rs.95

درخت نشیں
اتالوکلوینو
انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی
Rs.175

اِنکی کے دیس میں
ولاس سارنگ
مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال
Rs.150

Scanned with CamScanner

علاء الاسوانی

جو قریب آیا، جس نے دیکھا

(عصام عبدالعاطی کے کاغذات)

(ناولا)

عربی سے ترجمہ:

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

علاء الاسوانی (ولادت 1957) ایک مصری ادیب ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے دنداں ساز ہیں۔ انھوں نے دانتوں کے علاج معالجے کی تعلیم مصر اور پھر شکاگو میں حاصل کی۔ اب تک ان کے دو ناول (عمارت یعقوبیان اور شکاگو) ایک افسانوی مجموعہ ("نیران صدیقة") شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادب اور سیاست اور معاشرتی موضوعات پر مصری اخباروں میں متعدد مضامین بھی لکھے ہیں۔ وہ مصر کی سیاسی تحریک "کفایة" کے بنیاد نہاد ارا کین میں سے ہیں جس کے زیر سایہ مختلف سیاسی جماعتیں، انسانی حقوق اور غیر حکومتی تنظیمیں آتی ہیں۔ یہ اکثر قاہرہ کی شاہراہوں پر صدر مملکت حسنی مبارک کی حکومت کے خلاف احتجاجی مظاہرے کرتی رہتی ہیں۔ عمارتِ یعقوبیان، جس میں معاصر مصری معاشرے اور اس کی دردناک اخلاقی پستی کو ہدفِ طنز بنایا گیا ہے، نہ صرف مصر میں بلکہ عرب اور مغربی ممالک میں بھی بے حد مقبول ہوا۔ مغرب کی گیارہ بارہ زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اسے ٹیلی وژن سیریل اور 2007 میں فلم کی شکل میں بھی پیش کیا گیا۔

اپنے ہم وطن ناول نگار نجیب محفوظ کی طرح الاسوانی کو بھی مصری زندگی کے حسن وقبح کے مشاہدے میں غیر معمولی حدتِ نظر حاصل ہے۔ اس ناول میں، جس کا اردو ترجمہ عنقریب آج کے زیر اہتمام شائع ہو گا، مصری معاشرے کا جو فکشنی عکس پیش کیا گیا ہے اس میں ہم خود اپنے معاشرے کے خدوخال کا مشاہدہ بھی کر سکتے ہیں کیونکہ دونوں معاشروں کے بہت سے محرکات اور مظاہر ملتے جلتے ہیں اور انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ایک جیسے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ اسی ناول کی طرح آئندہ صفحات پر پیش کیا جانے والے ناولا الذی اقترب و رأی (جو قریب آیا، جس نے دیکھا: عصام عبدالعاطی کے کاغذات) میں بھی ایسے معاشرے کی صورت گری کی گئی ہے جس میں پیسے اور اقتدار کی غیر مساوی تقسیم ہر انسانی تعلق کو بڑی بے دردی سے مسخ کر دیتی ہے۔

یہ ترجمہ Humphrey Davies کے کیے ہوئے انگریزی ترجمے *The Isam Abd el-Ati Papers* سے کیا گیا ہے، اور اس میں ناولا کے اصل عربی متن سے مسلسل مدد لی گئی ہے۔ یہ تحریر الاسوانی کے مجموعے نیران صدیقة (*Friendly Fire*) میں شامل ہے۔ اردو ترجمے میں اس کے عربی اور انگریزی عنوان دونوں قائم رکھے گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

پیش لفظ

1

تاریخ کا سب سے پہلا فلمی شو پیرس کی شارع کیپوسین (Rue des Capucins) پر واقع گرانڈ کیفے کے انڈین سلون میں دسمبر 1895 میں پیش کیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد مصر میں سینما کی آمد ہوئی۔ پہلی فلم اسکندریہ میں نومبر 1896 میں دکھائی گئی، اُس ہال میں جس کا مالک ڈیلو استرولوگو (Dello Strologo) نامی ایک اطالوی تھا۔ یہ مصریوں اور مصر میں رہنے والے غیر ملکیوں دونوں ہی کی زندگی کا ایک نادر واقعہ تھا، اور صحافتِ وقت اس نئی ایجاد کے بارے میں پرجوش تبصروں سے پُر ہوگئی تھی۔ ٹکٹ کے جو استحصالی دام مقرر کیے گئے تھے وہ بھی لوگوں کی ہمت شکنی نہ کر سکے۔ فلمی شو لگ بھگ آدھا گھنٹہ جاری رہتا اور کئی فلمائے گئے ٹکڑوں میں کٹا بٹا ہوتا، جن میں سے کوئی ٹکڑا بھی چند منٹوں سے زیادہ طویل نہ ہوتا اور زیادہ تر گھریلو زندگی کے مناظر پر، یا سڑک، جنگل اور سمندر کے مناظر پر مشتمل ہوتا۔ موضوعات کی سادہ لوحی اور فلمی عملیات کی ابتدائی، غیر ترقی یافتہ نوعیت کے باوجود، لوگ سینما کے سحر میں آ گئے تھے۔ ٹکٹ خریدتے اور سرعت سے ہال میں پہنچ جاتے اور قطاروں میں کرسیوں پر بیٹھ کر اس طلسمی لمحے کا انتظار کرتے جب بتیاں گل کر دی جاتیں اور ہر چیز پر سیاہی اتر آتی اور پردے پر منظر اجاگر ہونے لگتے۔ یقیناً، ان اولین ناظرین کو پہلی بار پردے پر حقیقی زندگی کے مناظر دیکھتے ہوئے جو لطف محسوس ہوا ہوگا وہ اس سے کہیں زیادہ تھا جو آج ہم سینمائی آرٹ سے اٹھاتے ہیں؛ تاہم وہ نادر لطف اس وقت ایک عجیب سی مصیبت بھی

Scanned with CamScanner

ساتھ لے آیا تھا۔ اس شدید ہیجان کے عالم میں جو تماش بین کو فلم دیکھتے ہوئے اپنی گرفت میں لے لیتا،، وہ فلمائی ہوئی واردات میں اتنے ڈوب جاتے کہ محسوس کرتے جو دیکھ رہے ہیں وہ سچ مچ واقع ہو رہا ہے۔ چنانچہ، اگر سمندر متلاطم نظر آتا، موجیں آسمان کو چھو رہی ہوتیں، تو وہ خوفزدہ ہو جاتے، اور اگر کوئی تیز رفتار ریل گاڑی دھویں کے گاڑھے بادل اڑاتی پردے پر نمودار ہوتی، تو سچ مچ ہیبت کے مارے بہت سے چیخیں مارنے لگتے اور ہال کے دروازے کی طرف بھاگ اٹھتے کہ ریل گاڑی کہیں کچل نہ ڈالے۔ جب ایسے افسوسناک واقعات بار بار ہونے لگے تو دیلو استرولوگو نے ایک نئی روایت کی بنا ڈالی: وہ ہال کے سامنے تماش بینوں کا انتظار کرتا اور پھر انھیں پردے کے پاس لے جاتا اور اُسے اپنے ہاتھ میں لے کر کہتا، ''یہ پردہ صرف کپڑے کا ایک پارچہ ہے، بستر کی چادروں سے بہت زیادہ مختلف نہیں۔ وہ تصویریں جو آپ عنقریب دیکھنے والے ہیں، وہ پردے پر منعکس ہو رہی ہیں، اس میں سے نکل نہیں رہی ہیں۔ جلدی ہی ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی ریل گاڑی آپ کو نظر آئے گی۔ حضراتِ کرام، یاد رکھیے کہ یہ ریل گاڑی کی صرف تصویر ہے، اس لیے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔''

آج، سو سال سے اوپر، جب ہم ان واقعات کے بارے میں پڑھتے ہیں تو اُن ناظرین کا خوف ہمیں بڑا بے تکا اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ تاہم، آج بھی ادب کے بہت سے قاری بدقسمتی سے تخیل اور حقیقت کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مشکل ہے جس کا آزار، بہت سے دوسرے ناول نگاروں کی طرح، خود میں بھی اٹھاتا رہا ہوں۔ اپنے ناول، عمارتِ یعقوبیان میں میں نے دو بھائیوں، اسٹرون اور مَلاک، کے کردار پیش کیے ہیں جو نادار قبطی گھرانے کے افراد ہیں، اور اپنی حیلہ سازی، سنکی پن، اور لیک جھپک کے لحاظ سے منفرد ہیں۔ بقائے حیات کی شدید جدوجہد کے دوران یہ دونوں دروغ گوئی اور چوری چکاری سے مبرا نہیں۔ ناول کی اشاعت کے بعد میں ایک قبطی دوست کی ملامت زنی پر ہکا بکا رہ گیا، ''تمھیں قبطی کردار کا اتنا اہانت آمیز عکس پیش کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟'' میرا جواب (جو اسے بالکل قابلِ قبول معلوم نہیں ہوا) یہ تھا کہ میں مصری قبطیوں کا عام کردار نہیں پیش کر رہا تھا، بلکہ ایسے فرضی افراد کا جو اتفاق سے قبطی تھے۔ اسی طرح ناول میں ایسے مسلمان کرداروں کی بھرمار بھی ہے جو بڑے فاسد اور بداعمال ہیں۔ اس

Scanned with CamScanner

سے یہ نتیجہ نکالنا کہ سارے مسلمان انھیں جیسے بداعمال ہیں، ناممکن ہے۔ اسی طرح، اپنے ناول شکاگو میں میں نے شیما نامی کردار پیش کیا ہے، جو سر پر حجاب باندھنے والی نوجوان عورت ہے اور مصر کے دیہی علاقے سے پڑھنے کے لیے آئی ہے، اور اس کے امریکی قیام نے اسے اپنی قدامت پسندانہ نشو ونما پر نظرثانی کرنے کی تحریک دلائی ہے۔ نتیجے میں اسے اپنے ہمکار سے محبت ہو جاتی ہے، جس کے ساتھ اس کا جسمانی تعلق بتدریج نمو پاتا ہے۔ چونکہ یہ ناول ایک اخبار الدستور میں قسط وار شائع ہو رہا تھا، مجھے ہر ہفتے متشدد مذہبی خیالات رکھنے والے قاریوں کی جانب سے گالیوں اور کوسنوں کی بڑی دبنگ خوراک موصول ہوتی، اس لیے کہ میں نے ایک حجاب باندھنے والی نوجوان عورت کا کردار پیش کیا تھا جو اپنے اخلاقی اصولوں سے منحرف ہو گئی تھی، اور یوں میں نے ساری محجوب مسلمان عورتوں کے عکس کو، اور ٹھیک اسی لیے بذاتہٖ اسلام کو، ضرر پہنچایا تھا۔

میں نے اس سوال پر کافی طویل غور کیا: ''ایک پڑھے لکھے، ذہین قاری کو آخر کیا چیز یہ سوچنے پر اکساتی ہے کہ ایک من گھڑنت نگارش کے کسی فرضی کردار کا طرزِ عمل مذہب یا معاشرے کے کسی حلقے کو نقصان پہنچا سکتا ہے؟'' انصاف کا تقاضا ہے کہ اس خلط ملط کی کامل ذمے داری قاری کے سر نہ ڈالی جائے۔ اس کے برعکس، یہ معاملہ بے حد مہین تاروں سے خود ادب کی سرشت سے دو وجہوں سے جڑا ہوا ہے۔ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ مطالعے کے وافر حصے کو اس بات سے منسوب کیا جا سکتا ہے کہ یہ ہمارے تخیل کو مہمیز کرتا ہے۔ ہم ناول کے واقعات اور کرداروں کا اپنے حسبِ منشا طریقوں پر تصور کرتے ہیں۔ یہ تصورات واہمے (make-believe) کی مداخلت کے بغیر حقیقی نہیں بنائے جا سکتے، یعنی ہم اس وقت تک مطالعے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جب تک خود کو یہ التباس نہ ہونے دیں، چاہے یہ کتنا ہی گریز پا کیوں نہ ہو، کہ یہ جو پڑھ رہے ہیں گھڑنت نہیں بلکہ وہی ہے جو حقیقت میں پیش آیا۔ (اسی واہمے کی خاطر تھیٹروں میں روشنیاں گل کر دی جاتی ہیں، چاہے یہ تھیٹر ڈراما دکھانے والے اسٹیج کا ہو یا فلم دکھانے والے سینما کا۔) اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعضوں کے ذہن میں تخیل اور حقیقت کے درمیان پیدا ہونے والی یہ گڈمڈ آرٹسٹ کی فنی مہارت کی نشان دہی ہے، کیونکہ وہ قاری کو اپنا واہمہ حقیقت سمجھوانے میں کامیاب ہو گیا ہے، اگرچہ اس صورت میں واہمہ مبالغہ ہے اور ہیئت اور حقیقت کے درمیان تمیز کرنے کی قاری کی صلاحیت کو سلب کر لیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

دوسری وجہ کا تعلق اس بات سے ہے کہ ادب زندگی کا فن ہے۔ ناول کا غذی زندگی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی سے مشابہ ہے، لیکن اس سے زیادہ گہری، اہم، اور حسین۔ نیتجتاً، ادب یکہ وتنہا فن نہیں ہے۔ اس کے برخلاف، اس کا مواد خود زندگی ہے اور انسانی علوم، جیسے تاریخ، سماجیات، اور خلقیات (ethnology) اور ادب ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے گزرتے ہیں۔ یہ باہمی تقاطع دودھاری تلوار ہے۔ ایک طرف تو یہ ناول نگار کو لکھنے کے لیے غیر مختتم مواد فراہم کرتی ہے، اور دوسری، منفی، طرف، یہ بعض لوگوں کو فکشنی نگارشات کو اس طرح پڑھنے کی ہوک اٹھاتی ہے گویا یہ سماجیاتی مطالعے ہیں، جو بنیادی طور پر غلط ہے۔ فکشن نگار محقق نہیں ہے، بلکہ ایک فنکار ہے جو زندگی میں رونما ہونے والے کرداروں سے جذباتی طور پر متاثر ہوتا ہے، پھر انھیں اپنی نگارش میں پیش کرتا ہے۔ یہ کردار ہمیں انسانی صداقت کے روبرو لاتے ہیں لیکن لازماً معاشرتی صداقت کی نمائندگی نہیں کرتے۔

ایک فکشنی پارہ اس لحاظ سے فائدہ مند ہوتا ہے کہ یہ ہمیں کسی معاشرے کے بارے میں کچھ اشارے دیتا ہے لیکن اس کے جوہر کو، اس اصطلاح کے علمی معنی میں، پیش کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔ سماجیات میں، جس کی بنیاد محلی اور نظری مطالعوں، شماریات، اور ترسیمی خاکوں پر ہوتی ہے، بہر حال کسی مخصوص معاشرے کے جوہر کو علمی اعتبار سے پیش کرنے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن یہ ناول یا شاعری کا فرضِ منصبی نہیں ہے۔ ناول میں کسی مصری حجاب پہننے والی عورت کا کردار ہمیں حجاب پہننے والی بعض عورتوں کے احساسات اور الجھاووں کا اندازہ تو کرواسکتا ہے، لیکن یہ مصر کی تمام حجاب پہننے والی عورتوں کی نمائندگی کرنے سے یقیناً قاصر ہے۔ کوئی بھی شخص جسے حجاب کے مظہر کی ''صداقت'' کی تلاش ہے، اسے چاہیے کہ اس موضوع پر سماجیات کے ماہروں کے تحقیقی مطالعات سے رجوع کرے۔

میں یہ خامہ فرسائی کیوں کررہا ہوں؟

اس لیے کہ تخیل اور اور صداقت کے درمیان، فکشنی نگارش اور سماجیاتی مطالعے کے درمیان جو پراگندگی پائی جاتی ہے، اس کا اطلاق میرے ناولا جو قریب آیا، جس نے دیکھا: عصام عبدالعاطی کے کاغذات پر بھی کیا گیا تھا، زیادہ تر کوسنوں کی شکل میں، جس کے نتیجے میں مدت مدید تک اس کی اشاعت پر بندش لگادی گئی۔

Scanned with CamScanner

2

جب میں 1980 کی دہائی کے اواخر میں، ریاستہائے متحدہ سے اپنی پڑھائی ختم کر کے لوٹا تو میں نے اپنی ساری جدوجہد ادیب بننے کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کیا، جبکہ کسبِ معاش کے لیے دندان سازی کے کام پر بھی مجبور رہا۔ نتیجتاً میری زندگی دو بالکل جداگانہ حصوں میں بٹ کر رہ گئی— ایک باعزت ڈینٹسٹ کی باوقار، منظم زندگی، اور ایک ادیب کی آزادہ روز زندگی، جو تمام سماجی بندشوں اور پہلے سے بنے بنائے ضابطوں سے آزاد تھی۔ ہر روز طبی کام سے فارغ ہو کر میں دل و جان سے زندگی کے مستند ترین اور ولولہ انگیز قالب کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا۔ عجیب عجیب جگہوں پر جاتا اور غیر معمولی کرداروں سے پہچان پیدا کرتا، جس کی وجہ نہ صرف میرا ناقابلِ تسکین تجسس تھا بلکہ لوگوں کو سمجھنے اور ان سے سیکھنے کی سچی ضرورت کا دباؤ بھی۔ میں نے جانے کتنی راتیں ایسے کرداروں کے ساتھ، بےڈھنگی، لبڑ دھنگ پارٹی بازی میں گزاری ہیں جنھوں نے میرے تجسس کو ہوا دی، جس کے بعد مجھے مجبوراً گھر جا کر نہانا اور جلدی جلدی پیالی بھر قہوہ پی کر، ایک لمحہ سوئے بغیر، اسپتال جا کر اپنا کام شروع کرنا پڑتا۔ میں ہر روز بڑے انوکھے کرداروں کا اپنا حلقہ بناتا رہا۔ میں نے مفلسوں سے دوستی لگائی اور امیروں سے بھی، سبکدوش سیاستدانوں اور قلاش سابقہ رئیسوں سے، شراب کے دھتیوں، سابقہ ملزموں، عصمت باختہ عورتوں، متدین متشددوں، دھوکے بازوں، ٹھگوں، اور غنڈوں کی ٹولیوں کے گروگھنٹالوں سے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی رات اور دن کی دنیاؤں کے درمیان کم و کاست اور کٹر فاصلہ بھی قائم رکھا۔ کبھی کبھار، اپنے علی الرغم، مشکلات اٹھ کھڑی ہوتیں: ایک رات جب میں ڈاؤن ٹاؤن کی کسی رڈی سی بار میں بیٹھا پی رہا تھا تو دو مستوں کے درمیان بڑی خونخوار جنگ چھڑ گئی، اور ایک مدہوش دوسرے کو گھسیٹ کر باہر لے گیا اور سڑک پر اسے زدوکوب کرنے لگا۔ بعض دوسرے نیک طینت گاہکوں کے ساتھ ساتھ میں بھی جلدی سے باہر آیا اور جھگڑا رفع دفع کرانے اور دونوں میں مصالحت کرانے کی کوشش کی۔ شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ پورا منظر شدید شور و غوغا، چیخ و پکار اور غلیظ، اخلاق سوز گالیوں اور ہتک آمیز جملوں کی یورش سے بھرا تھا۔ زیادہ دیر نہیں لگی تھی کہ ہمیں سامنے کی عمارت کی کھڑکی کے کھلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک آدمی، صاف لگ رہا تھا کہ اس کی

Scanned with CamScanner

نیند ٹوٹ گئی تھی، ظاہر ہوا اور غصے سے چلّانے لگا، دھمکی دی کہ اگر فوراً شور مچانا بند نہیں کیا تو پولیس بلالے گا۔ جب میں نے نظر اٹھا کر اس آدمی کو دیکھا تو اسے پہچان لیا: وہ میرے کلینک کے مریضوں میں سے تھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے، میں خاموشی کے ساتھ وہاں سے کھسک لیا۔ چند دنوں بعد مجھے اس کے واسطے دانتوں کا ایک نیا چوکھٹا تیار کرنے کے لیے ناپ لینا تھا۔ میں نے حسبِ معمول اس کی پیشوائی کی۔ جب میں اپنے کام میں مصروف تھا، وہ مجھے چوری چھپے شک و شبے سے دیکھتا رہا۔ بالآخر، جب اس سے نہ رہا گیا تو مجھ سے پوچھا، ''ڈاکٹر صاحب، معاف کیجیے گا، کیا آپ کبھی کبھار راتیں ڈاؤن ٹاؤن کے علاقے میں گزارتے ہیں؟'' میں اس سوال کا متوقع تھا، سو جواب میں معصومیت کے ساتھ مسکرادیا اور کسی پیشہ ور دروغ گو کے لہجے میں بولا، ''ہفتے کے دوران مجھے باہر نکلنا کہاں نصیب ہوتا ہے کیونکہ، آپ جانتے ہی ہیں، آپریشن کرنے کے لیے مجھے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے۔''

مریض نے اطمینان کا لمبا سانس لیا اور کہا، ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ چند دن پہلے ہی، صبح کے چار بجے سڑک پر ایک آپ سے ملتا جلتا آدمی دکھائی دیا تھا، لیکن میں نے اپنے سے کہا کہ یہ آپ نہیں ہوسکتے۔''

خوش قسمتی سے ایسے واقعات اکثر رونما نہیں ہوتے تھے۔ ایک رات، جب میں اپنی سحر انگیز شبانہ سٹرگشت پر نکلا ہوا تھا، میری مڈبھیڑ 'تہرے محمود' (Triple Mahmoud) سے ہوگئی۔ ایک دوست نے اس کا تعارف کرایا تھا اور میں فوراً ہی اس کی غیر معمولی ذہانت اور اس کے خیالات کے مولکپن (originality) سے سحر زدہ ہوگیا تھا۔ وہ ان سبھوں سے مختلف تھا جن سے میری واقفیت رہی ہے۔ اس کا نام تک منفرد تھا، اس کے دادا اور باپ کسی وجہ سے ناموں میں ''محمود'' کو ترجیح دیتے تھے، سو اس اعتبار سے اس کا نام ''محمود محمود محمود'' ہوگیا۔ اس بات نے اس کے ہم مدرسہ لڑکوں کو اس کی تضحیک پر اکسایا اور انھوں نے اس کا نام ''محمود ضرب تین'' رکھ دیا، یعنی ''تہرا محمود۔'' یہ نام اس سے چپک گیا، یہاں تک کہ وہ خود بھی اسے استعمال کرنے لگا۔ جب میری محمود سے ملاقات ہوئی، اس وقت اس کی عمر چالیس سے کچھ اوپر عمر تھی اور اس کی زندگی کو، مختلف شعبوں میں پرعزم لیکن ناکام کوششوں کا حاصل جمع کہا جاسکتا ہے۔ یونیورسٹی میں اس نے یکے بعد دیگرے انجینئرنگ، فنونِ لطیفہ،

Scanned with CamScanner

اور سینما کی تعلیم حاصل کی اور پھر انھیں چھوڑ چھاڑ دیا۔ جب میں نے اس کی وجہ پوچھی، تو جواب دیا، ''مجھے محسوس ہوا کہ مصر کا درسی نظام طالبعلم کی ساری اپج کا ستیاناس کر دیتا ہے اور، اس کے علاوہ، نفسیاتی طور پر بھی اسے نقصان پہنچاتا ہے۔'' پھر یہ دیکھ کر کہ میں متشکک ہوں، اس نے وضاحت کی، ''مصری سینما کے عظیم فنکاروں اور روّاد نے سینما کی داغ بیل پہلے ڈالی اور سینما کا ادارہ بعد میں بنایا، جس سے یہ ثابت ہوا کہ انھیں سینما قائم کرنے کے لیے کسی ادارے میں کلاسیں پڑھنے کی ضرورت نہیں تھی۔''

یہ عجیب، اور انوکھی منطق، جس کا بہرحال اپنا جواز تھا، زندگی کی بابت محمود کے نظریات کی مثال تھی، اور اس کے کم و بیش سارے افعال اور خیالات مساوی طور پر سنکی پن اور مولک فکر کا آمیزہ تھے۔ حماقت، نوکرشاہی، اور سماجی ریاکاری سے نبھاؤ اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ کھرا، بے باک، اور اپنے خیالات یا وقار کو گزند پہنچانے والی ہر بات کے معاملے میں بے حد حساس واقع ہوا تھا — یہ سارے اوصاف، مصر کی جس فاسد صورت حال میں ہماری گزر اوقات ہے، لامحالہ ناکامی کا باعث ہی ہو سکتے ہیں۔ تاہم تعلیمی نظام کو ٹھکرانے کے باوجود وہ کاہل نہیں تھا۔ جب کوئی خیال اسے قائل کر لیتا تو اسے عمل میں لانے کے لیے وہ پوری دیانتداری سے غیر معمولی جدوجہد کرتا۔ وہ بڑا مستعد قاری بھی تھا جس سے میں اپنی زندگی میں کبھی ملا ہوں۔ اس نے خود کو اتنی وافر تعلیم دی تھی کہ آرٹ، تاریخ، اور ادب میں وسیع معلومات حاصل کر لی تھیں۔ مصوری کی خداداد صلاحیت کا مالک تھا لیکن اس کی اولین نمائش وہ توجہ حاصل کرنے میں ناکام رہی جس کی اسے توقع تھی، چنانچہ اس نے فرانس لے جا کر ان کی نمائش کرنے کا فیصلہ کیا، اور اپنے دوستوں سے کہا، ''میں اپنا آرٹ ان لوگوں کے پاس لے جاؤں گا جو آرٹ کی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔'' کسی نے پوچھا، ''تمھیں تو فرانسیسی کا ایک لفظ نہیں آتا، فرانس کیسے جاؤ گے؟'' سوال کرنے والے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے، جیسے اس کی ابلہی پر آسمانی عذاب اتروا رہا ہو، بولا، ''تو کیا فرانس بولنے کے لیے جا رہا ہوں؟''

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ وہ فرانس میں ناکام رہا، جہاں دریائے سین کے کنارے ایک فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے، اس نے اپنی صورت حال کا نقشہ ملی جلی تلخی اور طنز کے ساتھ یوں کھینچا، ''ایک بھوکا قلاش، جس پر اور جس کی تصویروں پر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔''

محمود سے میری دوستی کافی مدت تک رہی، اور اس نے مجھ پر اثر چھوڑا۔ میں اس کا گرویدہ تھا

Scanned with CamScanner

اور جس طور پر اس کی قسمت محدود ہو کر رہ گئی تھی اس پر آزردہ ہوتا تھا۔ چند برس بعد، محمود اعصابی خلل کا شکار ہو گیا؛ ایک سے زائد بار مختلف کلینکس میں اس کا علاج ہوتا رہا۔ پھر وہ منشیات کے کیچڑ میں لت پت ہو گیا جس کی وجہ سے اس کا اچانک، پچاس سال سے کم عمر میں، انتقال ہو گیا۔ اس کی بابت میرا رنج و غم ذاتی بھی تھا اور عمومی بھی۔ ایک طرف مجھے ایک ایسے شخص کی آزمائشوں سے ہمدردی تھی جسے مستند خداداد صلاحیتیں ملی تھیں، جو بڑی بڑی امیدیں رکھتا اور آخراً ان کی دردناک پسپائی کا سامنا کرتا۔ دوسری طرف مجھے یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ تقریباً سبھی شعبوں میں محمود جیسے اعلیٰ صلاحیتوں اور قوتوں کے مالک افراد کو مصر اپنی اخلاقی گراوٹ اور جبر و تعدی کے ہاتھوں کھوتا جا رہا ہے۔۔ اگر محمود کی پیدائش کسی جمہوریت میں ہوتی، جس کے شہریوں کو انصاف اور آزاد نشوونما کے مواقع حاصل ہوتے، تو آرٹ اور زندگی دونوں میں اس کی قسمت بالکل مختلف ہوتی۔ میں نے محمود کے المیے کی بابت اتنا زیادہ غور کیا کہ ایک دن میں سوتے سے جگ پڑا اور اپنے سے پوچھنے لگا، ''کیوں نہ اس کے بارے میں لکھوں۔ وہ کیا محسوس کرتا ہوگا اور کیا سوچتا ہوگا، اور کس طرح وہ عمیق، استہزائی، ذہین تبصراتی جملے برجستہ اچھال دیتا تھا جو چاقو کی دھار پر دانش اور جنون کے درمیان فروکش ہوتے؟'' میں نے محمود کا کردار اختیار کر لیا، گویا کہ کوئی اداکار ہوں، اور یہ کوئی خاص مشکل کام نہیں تھا کیونکہ وہ میرے خیالات میں بڑی شدت سے رچ بس گیا تھا۔ جس لمحے میں نے کورے کاغذوں کا دستہ سامنے رکھ کر قلم کھولا تو ارادہ کیا کہ لکھوں گا اور ایک ہی نشست میں متعدد صفحات لکھ بھی لیے۔ میں بڑے اشتیاق اور جوش سے لکھتا رہا، دن بہ دن، یہاں تک کہ کتاب ختم ہو گئی۔ اس کا مرکزی کردار، عصام عبدالعاطی ایک مایوس، اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان جو مصری معاشرے میں پھیلے ہوئے جور و ستم، فساد، اور ریاکاری کا شکار ہے اور ان کا موازنہ مصریوں کی عظمت اور ان کی ہزاروں سال پرانی تہذیب پر مبنی ان خودستائشی بیانات سے کرتا ہے جس کی تکرار حکومتی ذرائع ابلاغ کرتے نہیں تھکتے — تہرے محمود سے بڑے قریبی طور پر مشابہ ہے۔

واحد متکلم کی ضمیر میں لکھے گئے ناولا کا آغاز ہیرو سے ہوتا ہے جو بڑی تلخی سے قوم پرست لیڈر مصطفیٰ کامل کے ان مشہور فقروں کو استہزا کا ہدف بنا رہا ہے، ''اگر میں مصری نہ ہوتا، تو مصری ہونا چاہتا؛'' جس کے بعد مصریوں کے خلاف بڑی کاٹ دار تنقید کا سیلاب سا آ جاتا ہے۔ حقیقت میں،

Scanned with CamScanner

لکھتے وقت مجھے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ کتاب مجھے بڑی مشکلوں میں ڈال دے گی۔ میں نے اسے دوستوں کو دکھایا اور سبھوں نے بڑی گرمجوشی سے اس کی تعریف کی۔ اس حوصلہ افزائی کے باعث میں کتاب اس نیت سے مصر کے سرکاری اشاعتی ادارے جنرل ایجپشین بک آرگنائزیشن (GEBO) لے گیا کہ اسے اشاعت کے لیے داخل کروں۔ مجھے پورا اعتماد تھا کہ یہ ضرور ان کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگی، اور شاید گرمجوش پذیرائی بھی۔ لیکن وہاں، ساحل آب کے کنارے تنظیم کی پر تکلف عمارت میں، مصر کے اس اخلاق سوز ثقافتی ادارے نے مجھے زندگی کا پہلا دھچکا پہنچایا۔ مجھ پر یہ آشکارا ہوا کہ GEBO کے رواج کے مطابق ادیبوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے میں مشہور ادیب آتے ہیں، اور ان کی نگارشات فی الفور شائع ہو جاتی ہیں۔ دوسرے میں وہ ادیب جو کسی اہم سرکاری آدمی کی سفارش لے کر آئے ہوتے ہیں، اور ان کی چیزیں بھی چھپ جاتی ہیں، لیکن اس کا دارومدار سفارش کرنے والے کی حیثیت پر ہوتا ہے، نگارش کی قدر و قیمت یا ادیب کی صلاحیت پر نہیں۔ تیسرا زمرہ، جس میں ادیبوں کی اکثریت آتی ہے، گمنام ادیبوں پر مشتمل ہوتا ہے — یعنی وہ ادیب جو مشہور نہیں ہوتے اور سفارش بھی نہیں لائے ہوتے۔ ان کی نگارشات تبصراتی کمیٹیوں کو رائے لینے کے لیے بھیج دی جاتی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان تبصراتی کمیٹیوں کے اراکین ادب کے پروفیسر نہیں ہوتے بلکہ ادارے کے وہ عام اہلکار جن کے باس صاحبان انھیں خوش کرنے یا صلہ دینے کے لیے ان کمیٹیوں میں ڈال دیتے ہیں تاکہ اس سے ان کی کچھ اضافی آمدنی ہو جائے۔ بالفاظ دیگر، شعبۂ مالیات کا یا کارکنوں کے معاملات کا اہلکار فیصلہ کرتا ہے کہ آپ کا ناول شائع کیا جائے یا نہیں۔ حقیقت میں ادارے کی انتظامیہ تبصراتی کمیٹیوں کی رودادوں کو بہت زیادہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی، کیونکہ جن ادیبوں کی نگارشات انھیں بھیجی جاتی ہیں وہ گمنام ہوتے ہیں اور کسی افسر وفسر سے ان کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے کام کی اشاعت سے GEBO میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔

میں وہ نازک لمحہ کبھی نہیں بھولوں گا جب میں اہلکار کے سامنے بیٹھا ہوا تھا جو بذاتِ خود یک رکنی تبصراتی کمیٹی تھا۔ میری کتاب ڈیسک پر اس کے سامنے تھی اور اس کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا۔ بھنویں چڑھائے اور جارحانہ لہجے میں یکبارگی بولا، ''میں اسے کسی صورت میں شائع نہیں کر سکتا۔''

Scanned with CamScanner

''کیوں؟''

''یہ نہ کہو کہ تمھیں اس کا جواب معلوم نہیں۔''

''براہ کرم، آپ خود بتا دیجیے۔''

''کیونکہ اس میں تم نے مصر کی توہین کی ہے۔''

''میں نے مصر کی توہین نہیں کی۔''

''تم نے قائد مصطفیٰ کامل کا مذاق اڑایا ہے۔''

''میں نے ان کا مذاق نہیں اڑایا۔ میں مصطفیٰ کامل سے محبت اور ان کی عزت کرتا ہوں۔ جو شخص مصطفیٰ کامل کا مذاق اڑاتا ہے وہ عصام عبدالعاطی، ناول کا ہیرو ہے۔''

''تم مجھے یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ تم اس کے قول سے اتفاق نہیں کرتے، جبکہ اسے لکھنے والے تم خود ہو؟''

تبصراتی کمیٹی کے اس محترم رکن کے واسطے میں نے اُس فرق کی وضاحت کرنی شروع کی جو ایک مضمون اور ایک افسانے میں ہوتا ہے، کہ کس طرح مضمون اس کے لکھنے والے کی رائے کا آئینہ دار ہوتا ہے، جبکہ افسانہ تخیل کا کارخانہ ہوتا ہے جس میں متعدد کردار ہوتے ہیں جن کی آرا مصنف کے نقطۂ نظر کی حتماً اور ناگزیراً عکاسی نہیں کرتیں۔

اہلکار نے کچھ نہیں کہا۔ اپنے معاملے سے جوش میں آ کر میں نے کہا، ''آپ کی منطق کی پیروی کی جائے تو اگر ایک ادیب کسی چور کے بارے میں لکھتا ہے تو وہ خود بھی چور ٹھہرے گا اور اگر اپنے ناول میں کسی جاسوس کا کردار پیش کرتا ہے تو اپنے ملک کا غدار۔ اس قسم کی منطق ادب کی بنیاد ہی منہدم کر کے رکھ دیتی ہے۔''

افسر صاحب کچھ شرمندہ سے دکھائی دیے، پھر لبوں پر مکاری مسکراہٹ لا کر بولے، ''یعنی تم مصر کے بارے میں ہیرو کی رائے سے متفق نہیں ہو؟''

''بالکل نہیں۔''

''تمھیں یقین ہے؟''

ظاہر ہے، مجھے یقین ہے۔''

Scanned with CamScanner

''تو اس صورت میں برأت نامہ (disclaimer) لکھنے پر آمادہ ہو؟''

''برأت نامہ؟''

''ہاں، بالکل! میں کتاب چھاپنے پر رضامند ہوں اگر تم اپنے ہاتھ سے یہ لکھ دو کہ ہیرو جو کچھ مصر اور مصریوں کی بابت کہتا ہے، تم اس کی مذمت کرتے ہو۔''

''ٹھیک ہے۔''

میں نے اہلکار سے کاغذ قلم مانگ کر ''برأت نامہ'' کے عنوان کے نیچے یہ لکھ دیا: ''میں، اس ناولا کا مصنف، یہ اعلان کرتا ہوں کہ میں ہیرو عصام عبدالعاطی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ مصر اور مصریوں کے بارے میں میرے اپنے خیالات کا الٹ ہیں۔'' پھر اپنی طرف سے یہ اضافہ کر دیا، ''میں تصدیق کرتا ہوں کہ اس کتاب کا ہیرو ایک سر پھرا اور ذہنی طور پر غیر متوازن شخص ہے اور اس کا جو انجام ہوتا ہے اس کا مستحق ہے۔ یہ برأت نامہ میں نے General Egyptian Book Organization کی ایما پر لکھا ہے۔''

اہلکار نے برأت نامہ بڑی احتیاط سے پڑھا، اطمینان کا لمبا سانس بھرا، پھر کتاب پر اشاعت کی اجازت لکھ دی اور مجھ سے وعدہ کیا کہ جلد ہی چھپ جائے گی۔

3

مَیں وہ بیہودہ برأت نامہ لکھنے پر کیوں رضامند ہوا؟ اس لیے کہ اپنی کتاب شائع کروانا چاہتا تھا اور اس لیے کہ، میرے حساب سے، یہ ایک اسکینڈل کھڑا کر دے گی جو GEBO کے فساد اور جہالت کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ اسی لیے میں نے یہ اضافہ کیا تھا کہ برأت نامہ ان کی درخواست پر لکھ رہا ہوں۔ اس واقعے کے چند ہفتے بعد میں پھر وہاں یہ پوچھنے کے لیے گیا کہ کتاب کس مرحلے میں ہے۔ اس بار ایک مختلف اہلکار کا سامنا ہوا۔ جب میں نے اس سے گذشتہ معاملہ بیان کیا تو اس نے کتاب کی فائل نکالی (جو اس درمیانی عرصے میں دراز سے باہر نہیں نکلی تھی)۔ فائل کھول کر جیسے ہی اس نے برأت نامہ پڑھا تو فوراً اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے مجھ سے جرح کی اور جب میں نے پوری کتھا سنا دی، تو بولا، ''نہیں۔ یہ سب حماقت ہے۔''

اس نے برائت نامہ میرے سامنے ہی چندی چندی کر دیا اور آہستگی سے بولا، ''سنو۔ ناولا کا پہلا باب حذف کر دو تو ہم اسے چھاپ دیں گے۔ کیا خیال ہے؟''

میرا ردعمل، ظاہر ہے، یہی تھا کہ ڈیسک پر سے مسودے کو جھپٹ کر اٹھاؤں اور عمارت سے چلتا بنوں۔ میں اس کے بعد کبھی وہاں نہیں گیا۔ مجھ پر شدید مایوسی طاری ہوگئی لیکن کچھ دنوں میں میں اس بے دلی سے نکل آیا اور فیصلہ کیا کہ کتاب اپنے خرچ پر شائع کروں گا۔ چونکہ اسی دوران میں نے افسانوں کا ایک مجموعہ لکھ لیا تھا، میں نے ناولا کے ساتھ ان افسانوں کو بھی کتاب میں شامل کر لیا، صرف تین سو کاپیاں طبع کروائیں اور انھیں دوستوں اور نقادوں میں تقسیم کر دیا۔ کتاب کی پذیرائی حیرت انگیز گرمجوشی سے ہوئی اور بہت سے نقادوں نے اس کی تعریف کی۔ اس واردات نے مجھے کچھ مدت کے لیے عجیب صورت حال سے دوچار کیا — یعنی ایسے ادیب کی صورت حال جس کے پڑھنے والے مفقود تھے۔ نقادوں نے کتاب کی تعریف اخباروں میں کی تھی، لیکن جب ان مضامین کو پڑھ کر کوئی کتاب حاصل کرنے کے لیے نکلتا تو کہیں دستیاب نہ ہوتی۔ بدقسمتی اس تحریر کا سائے کی طرح پیچھا کرتی رہی۔ میرے ناول عمارتِ یعقوبیان کی کامیابی کے بعد پبلشر اصرار کرنے لگے کہ جو کچھ بھی لکھا ہو ان کے حوالے کروں۔ میں اپنا ناولا ایک بڑے ناشر کے پاس لے گیا، جس نے پڑھ کر کہا، ''یہ مجھے بے حد پسند ہے، لیکن دوٹوک بات یہ ہے کہ میں ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار نہیں جو اسے چھاپنے کے بعد رونما ہوں گے۔ اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ مجھے جیل بھجوا دیں گے۔'' اور حقیقت میں، ایک مشہور نقاد نے، جو ذاتی وجوہ کی بنا پر مجھ سے متنفر ہے، ادنیٰ سی شرمساری اور احساسِ جرم کے بغیر، ایک طول طویل مضمون لکھا جس میں جان بوجھ کر مجھے کہانی کے ہیرو سے خلط ملط کر دیا، اور اس خلط ملط کو بنیاد بنا کر مجھ پر اپنے ملک کو حقیر سمجھنے اور مغرب پر فریفتہ ہونے کا الزام عائد کیا۔

سو یہ اس کتاب کی واردات ہے جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میں چاہتا تھا کہ آپ کتاب پڑھنے سے پہلے اس واردات سے واقف ہو جائیں۔ مجھے اعتماد ہے کہ بیشتر قارئین یہ سمجھ لیں گے کہ ادبی کردار ادیب سے الگ اپنا آزاد وجود رکھتے ہیں۔ باقی رہے وہ قارئین جو مجھے ہیرو کی آرا کا ذمے دار اور جواب دہ سمجھتے ہیں، تو میں، ان کے لیے، بصد احترام، اطالوی سنیما کے مالک استرولوگو کا

Scanned with CamScanner

وہ قول دہراؤں گا جو اس نے ایک دن اپنے تماش بینوں کے سامنے کہا: ''یہ پردہ صرف کپڑے کا ایک پارچہ ہے، جس پر تصویریں منعکس ہوتی ہیں۔ جلدی ہی آپ ایک تیزی سے بھاگتی ہوئی ریل گاڑی دیکھیں گے۔... حضراتِ کرام، یاد رکھیے کہ یہ ریل گاڑی کی صرف تصویر ہے، اور اس لیے آپ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتی۔''

1

اگر میں مصری نہ ہوتا، تو مصری ہونا چاہتا۔

—مصطفیٰ کامل

میں نے اس قول کا اپنے ان کاغذات کے لیے اولین الفاظ کے طور پر انتخاب کیا ہے، اس لیے کہ میری رائے میں یہ وہ انتہائی احمقانہ بات ہے جو میں نے کبھی سنی ہو۔ یہ الفاظ اس قسم کی احمقانہ قبائلی عصبیت کی نمائندگی کرتے ہیں (اگر فرض کریں کہ انھیں کہنے والے کا مدعا واقعی یہی تھا) کہ ہر بار اس کا خیال آتے ہی میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر بھلے آدمی مصطفیٰ کامل چینی یا ہندوستانی پیدا ہوئے ہوتے تو؟ تو کیا انھوں نے اپنی چینی یا ہندوستانی قومیت پر فخر یہ یہی فقرہ نہ دہرایا ہوتا؟ اور کیا ایسے فخر کی، جو محض اتفاق کا نتیجہ ہو، کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟ اور اگر مصطفیٰ کامل اپنے مصری ہونے کا انتخاب کر سکتے — شعوری ارادے سے، جیسا کہ وہ ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں، تو پھر اس انتخاب کے پیچھے کچھ نہ کچھ اہم اسباب کا ہونا لازمی ہے۔ ان کے لیے مصریوں میں ایسے اوصاف کی تلاش ناگزیر ہو جاتی جو کسی دوسرے ملک کے لوگوں میں نہیں پائے جاتے۔ اچھا، تو یہ کون سے اوصاف ہو سکتے ہیں؟ کیا مصری، مثال کے طور پر، جاپانیوں اور جرمنوں کی طرح اپنی سنجیدگی اور کام کی لگن کے باعث ممتاز ہیں؟ کیا وہ امریکنوں کی طرح خطرات مول لینے اور تبدیلی کے شائق ہیں؟ کیا وہ فرانسیسیوں اور اطالویوں کی طرح تاریخ اور فنون کا احترام کرتے ہیں؟ مصریوں کے لیے اس قسم کے امتیازی اوصاف کا ہونا لازمی ہوتا۔ تو آخر مصریوں کو کیا چیز ممتاز کرتی ہے؟ میرا ہر ایک کو کھلا چیلنج ہے کہ مصریوں کی کوئی ایک صفتِ محمودہ ہی بیان کر دے۔ بزدلی اور ریاکاری، خفیہ پن اور

Scanned with CamScanner

عیاری، کاہلی اور کینہ توزی — یہ ہیں ہمارے خصائص۔ اور چونکہ ہم اپنی حقیقت سے خوب آگاہ ہیں، اس پر بڑبولے پن اور جھوٹ کا پردہ ڈال دیتے ہیں — ہماری ''عظیم'' مصری قوم کے بارے میں کھوکھلے، کان پھاڑ نعرے جنھیں ہم دن رات دہرائے جاتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہم نے ان نعروں کو اتنی بار دہرایا ہے کہ اب ان پر خود بھی یقین کرنے لگے ہیں۔ اور تو اور — اور یہ واقعی حیرت ناک ہے — ہم نے اپنے بارے میں ان جھوٹوں کو گیتوں اور قومی ترانوں کی شکل دے دی ہے۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ دنیا کے دوسرے لوگ بھی ایسا کرتے ہیں؟ مثلاً، کیا انگریز اس طرح گاتے ہیں، آہ انگلینڈ، ملک ہمارے؛ تیری ارض سنگِ مرمر، تیری خاک مشک و عنبر؟ ایسی مبتذل باتیں ہمارے حقیقی خصائص ہیں۔ ذرا تصور تو کیجیے، ابتدائی اسکول کی دوسری جماعت کی درسی کتاب میں مَیں نے یہ پڑھا: ''خدا کو مصر سے بے حد محبت ہے اور اس نے اپنی کتابِ کریم میں اس کا ذکر کیا ہے۔ اسی لیے اس نے ہماری آب و ہوا کو معتدل بنایا ہے، جو گرمی اور سردی میں دلکش ہوتی ہے، اور اسی لیے وہ ہمارے دشمنوں کے مکر سے اسے محفوظ رکھتا ہے۔''

آپ نے دیکھا، کس طرح نونہالوں کے دماغوں کو کذب کے انباروں سے بھرا جارہا ہے! ہماری یہ ''دلکش معتدل آب و ہوا'' حقیقت میں جہنم زار ہے۔ مارچ سے اکتوبر تک کے سات مہینوں میں جھلساتی گرمی ہماری کھال جھلس کر رکھ دیتی ہے، یہاں تک کہ ڈھور ڈنگر مر جاتے ہیں اور سڑک کا کولتار سورج کے آتشیں تلوے کے نیچے پگھل جاتا ہے — اس کے باوجود ہم اپنے رب کا اپنی دلکش آب و ہوا کے لیے شکر ادا کرتے ہیں! آگے چلیے، اگر خدا مصر کی اس کے دشمنوں کے مکر کے خلاف مدافعت کرتا ہے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے، تو یہ کیا بات ہے کہ دنیا کی ہر قوم ہم پر قابض رہی ہے؟ مصر کی تاریخ حقیقت میں پیہم ہزیمتوں کے ایک سلسلے سے زیادہ نہیں جو دنیا کی تمام قوموں کے ہاتھوں ہمیں لاحق ہوئیں، رومیوں سے لے کر یہودیوں تک۔

یہ ساری حماقتیں میرے اعصاب پر سوار ہو جاتی ہیں، اور جس بات سے اور زیادہ جھنجھلاہٹ ہوتی ہے وہ یہ کہ ہم — قابلِ نفرت مصری — فراعنہ کی منعکس شان میں نہانے کے دلدادہ ہیں۔ فراعنہ کے دورانِ حکومت مصری واقعی ایک عظیم قوم ہوا کرتے تھے، لیکن اُن مصریوں سے ہمارا کیا تعلق ہے؟ ہم تو فاتحین کی افواج اور ان کے ہاتھوں شکست کھائی ہوئی آبادیوں کے قیدیوں کے مخلوط جنسی

Scanned with CamScanner

تعامل کا بگڑا ہوا، مجہول نتیجہ ہیں۔ مصری کسان ـــــ فلاح ـــــ جس کی زمین برابر صدیوں تک فاتحین کے ہاتھوں تاراج اور جس کی مردانگی بے حرمت ہوتی رہی، آج وہ سب کچھ کھو چکا ہے جو اسے اس کے عظیم آباواجداد سے منسلک کرتا تھا، اور اپنی بیکسی کے طویل تجربے سے گزر کر اب وہ اس سے مانوس ہو گیا ہے، اس نے خود کو اس کے سپرد کر دیا ہے، اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک خدمت گذار کی ذہنیت اپنا لی ہے۔ ذرا چند ہی ایسے واقعی دلیر مصریوں کو یاد کیجیے جن سے زندگی میں آپ کی ملاقات ہوئی ہو۔ مصری، خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو جائے اور کتنا پڑھا لکھا کیوں نہ ہو، اگر آپ طاقتور ہیں تو آپ کے سامنے گھگھیانے لگے گا، مسکرائے گا، مسکہ لگائے گا، اور اندر اندر آپ سے نفرت کرے گا اور کسی بے چوک خفیہ ذریعے سے، جس میں ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے، آپ کی ایسی تیسی کرنے کی فکر میں لگا رہے گا۔ محض ایک ادنیٰ خادم ـــــ یہ ہے آپ کا مصری! مجھے مصریوں سے نفرت ہے، اور مجھے مصر سے نفرت ہے۔ میں اس سے اپنے دل کی گہرائیوں کے ساتھ نفرت کرتا ہوں اور یہ امید رکھتا ہوں کہ اس کی حالت اور بھی ردّی اور منحوس ہو جائے۔ اگرچہ میں اس نفرت کو چھپانے کی پوری احتیاط کرتا ہوں (تاکہ احمقانہ مشکلات سے دامن بچا سکوں)، بعضے بعضے وقت اسے دبانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک دفعہ، اپنے ایک ہمکار کے گھر پر، میں مصر اور افریقی ملک زائیر کے درمیان ہونے والا فٹ بال کا میچ دیکھ رہا تھا۔ جب افریقی کھلاڑی نے جتا دینے والا گول کیا تو میں فرحت کے مارے خوب زور سے چلا اٹھا، جبکہ دوسروں کو ہمارے ہار جانے پر میری مسرت ناگوار گزری۔ میں نے ان کی کوئی پروا نہ کی اور ہارے ہوئے مصریوں کے چہرے مزے لے لے کر دیکھتا رہا، جن کا تاثر سپاٹ اور شکستہ تھا اور خدوخال سے غمزدگی اور بےبسی ٹپک رہی تھی ـــــ اور ہزارہا سال سے مصری ایسے ہی دکھائی دیتے ہیں۔

2

ایک ہی جھپاٹے میں میرے ذہن سے ساری خوش فہمیاں کوچ کر گئیں، جس پر مجھے فخر ہے، کیونکہ میں ایسے کئی بیدار مغز اور خوب پڑھے لکھے لوگوں سے واقف ہوں جنھوں نے اپنی زندگیاں خوش خیالیوں میں تباہ کر دی ہیں ـــــ عقائد اور نظریے، جن کا یہ الو سراب کی طرح پیچھا کرتے رہے: قوم پرستی، مذہب، مارکسزم ـــــ وہ تمام جگمگاتے لفظ جن کا کھوٹ مجھ پر کم عمری ہی

میں ظاہر ہو گیا تھا۔ مذہب سے پیچھا چھڑانا آسان تھا۔ مارکسزم ذرا زیادہ دیر حاوی رہا۔ مجھے اعتراف ہے کہ مارکسزم ایک اُچٹ پہلو کا حامل ہے، جو قابلِ احترام ہے، اور ساتھ ہی ساتھ یہ روح پر ایسا نقش چھوڑ جاتا ہے جو خود اس کے تصور سے زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ میں دو سال تک کٹر مارکسی رہا، لیکن مجھے یہ ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ میں آگے چل کر بدل جاؤں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر کیوں مزدوروں اور کسانوں جیسی سفلہ مخلوق کی خاطر قربانیاں دیتا پھروں۔ میں عام آدمیوں کو ایک دوسرے سے مبتذل مذاق کرتے دیکھا کرتا تھا۔ انھیں تہواروں کے موقعے پر حد سے زیادہ بھڑکے ہوئے وحشیوں کی طرح سڑکوں پر سیلاب کی طرح امڈتے اور ہر خوشنما چیز کو اپنے اندھے، بھاری پیروں کے نیچے روندتے مشاہدہ کرتا تھا، اور میری حقارت اور تنفر کے سامنے مارکس کی ان کے حق میں شاندار لن ترانیاں سکڑ کر رہ جاتیں۔ کیا میں ان جیسوں کی خاطر جدوجہد کروں گا اور مروں گا؟ یہ جانور تھے اور زیادہ سے زیادہ تضحیک اور دہشت کی حکمرانی میں جینے کے مستحق تھے؛ یہ وہ واحد زبان تھی جو وہ سمجھنے کے اہل تھے۔ صرف ایک بار ان میں سے کسی ایک کے سامنے خود کو کمزور دکھانے کا تجربہ کیجیے اور پھر دیکھیے کہ وہ آپ کا کیا حشر کرتا ہے۔

مارکسزم کے اثر سے نکلتے ہی مجھے اپنے ذہن اور اس کی رہائی پر پورا قابو حاصل ہو گیا، اور اب میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگا۔ اوہام، چاہے یہ آپ کو کتنا ہی فریب دیتے ہوں، آپ کی رفاقت بھی کرتے ہیں۔ دوسری طرف سرد مہر اور سنگین صداقت آپ کو ایک ظالم خرابے میں جا پھینکتی ہے۔ اپنے دماغ کو سدھانے میں میری کامیابی کے ٹھیک متوازی اپنے احساسات پر مکمل غلبہ پانے میں میری ناکامی تھی۔ ذہنی الجھاوے، خواہ یہ غایت درجہ پیچیدہ کیوں نہ ہوں، میری فکر کو آزمائش میں نہیں ڈالتے۔ لیکن لوگوں سے کوئی بھی معمولی سی برجستہ مڈھ بھیڑ مجھے سخت الجھن میں ڈال دیتی ہے اور میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہوں۔ آگاہی اور عمل کے درمیان ایک مصدقہ معکوس نسبت پائی جاتی ہے جس کے باعث عمل پر سب سے زیادہ قادر آدمی ذہنی اعتبار سے سب سے زیادہ کاہل اور گونگا نکلتا ہے — اور اس کا اُلٹ بھی صحیح ہے۔ جس رفتار سے آگہی بڑھتی ہے، اسی رفتار سے عمل کی قدرت مضطرب ہو جاتی ہے۔

میرا سر — جو کسی لحظے بھی سوچنے اور ہر امکان اور احتمال پر غور و خوض کرنے سے باز نہیں رہتا — یہی سر، ایسے موقعوں پر جنھیں دوسرے لوگ بالکل معمولی گردانتے ہیں اور بڑی آسانی سے

Scanned with CamScanner

ان سے نبٹ لیتے ہیں، مجھے موزوں طرزِ عمل اختیار نہیں کرنے دیتا۔ کسی دوست کے گھر پہلی مرتبہ ملاقات کے لیے جانے سے پہلے، مجھے یہ خیال سونے نہیں دیتا کہ دربان، جس سے میں واقف نہیں ہوں، مجھے روک دے گا اور پوچھے گا کہ کس اپارٹمنٹ میں جانا ہے۔ دربان کے سوال پر میری پریشانی کچھ اس طرح بھوت بن کر مجھ پر سوار ہو جاتی ہے کہ میں اکثر اپنے دوستوں سے ان کے گھروں کے بجائے کسی عوامی جگہ پر ملنے کے لیے کہتا ہوں (ظاہر ہے، انھیں اس کی وجہ بتائے بغیر)، اور جب بالآخر کسی اپارٹمنٹ بلاک کا پیش ایوان مجبوراً عبور کرنا ہی پڑ جائے جہاں میرے دوست کی رہائش ہو، تو میں کسی بچے کی طرح بے چین ہوتا ہوں، اور یہ دکھانے کے لیے کہ بالکل فکرمند نہیں، سیٹی بجانے لگتا ہوں، یا کلائی کی گھڑی دیکھنے لگتا ہوں، یا اپنی قمیص کی آستین کو یونہی درست کرنے لگتا ہوں۔ ایسے موقعوں پر دربان کی آواز تیزی سے مجھے آلیتی ہے، کیونکہ میں اس کے پاس سے گزر گیا ہوتا ہوں، اس کی پوچھ تاچھ کو نظر انداز کرتے ہوئے اور اس پر توجہ دیے بغیر سرعت سے آگے بڑھتے ہوئے؛ لیکن وہ میرے پیچھے لپکتا ہے، برابر آ جاتا ہے، اور بالآخر مجھے روک کر سوال کر دیتا ہے؛ اور، اس امر کے باوجود کہ میں اس کے سوال کا متوقع ہوتا ہوں، مجھے ہر بار ہر بات پر اپنی توہین کا شدید احساس ہوتا ہے۔ جب میں جواب دیتا ہوں تو بعض اوقات بڑی رُکھائی اور درشتی سے، اور بعض دوسری مرتبہ اس کے سامنے بالکل بھیگی بلی بن جاتا ہوں، ہکلانے اور اٹک اٹک کر ہلچل کے عالم میں بولنے لگتا ہوں؛ پھر دربان اپنے پورے قد سے تن جاتا ہے، اس کی آواز بلند ہو جاتی ہے اور مجھے اپنی طاقتور، پھٹی اس کھلی آنکھوں سے گھورنے لگتا ہے، کیونکہ اس نے میری کمزوری کو بھانپ لیا ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر جو بات میں کبھی نہیں کر سکتا وہ یہ کہ ایک پُراعتماد معزز آدمی کا تاثر دوں جو اپنی صلاحیتوں پر یقین رکھتا ہو، یا دربان کو مسکرا کر پُرسکون آواز میں جواب دوں، اور کہوں "میں فلاں بک سے ملنے آیا ہوں۔" اگر میں اس جیسے شخص کو اس طرح جواب دوں تو وہ فوراً پیچھے ہٹ جائے گا اور اپنے حقیقی حجم میں سمٹ جائے گا۔ مگر بس اسی پروقار انداز کی مجھ میں کمی ہے اور مجھ میں یہ تعین کرنے کی صلاحیت نہیں ہے کہ میرے غیر متوازن احساسات ضرورت سے زیادہ پختہ کار شعور کی بدولت ہیں یا پرورش کے طریقوں کی۔ میرے بچپن اور اوائل جوانی کی یادیں میرے حافظے میں کسی قدر 'تاریخی' انداز میں مرتسم ہیں۔ میں جب اپنی زندگی کے واقعات کو کریدتا ہوں تو مجھے یوں محسوس

ہوتا ہے کہ میں ایک المیہ ہیرو ہوں جو قضا و قدر کی ضربوں کو شجاعت مندی اور عالی ظرفی سے قبول کرتا ہے۔ عام آدمیوں کے برخلاف، ہیروؤں کا سامنا آنی جانی، معمولی واقعات سے نہیں ہوتا: انھیں جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ لازماً اہم اور قسمت ساز ہوتا ہے۔ اسی طرح، واقعات میرے حافظے میں بجلی کے متفرق، منتشر کوندوں کی طرح نقش نہیں، بلکہ نقطوں کے ایک مسلسل خط کی طرح جو اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ اس کی نہ پیش گوئی کی جا سکتی ہے نہ تیاری۔ میں اسے گتّھے کے ڈبے کی شکل میں تصور کرتا ہوں جس کے اندر دیواریں اور راستے ہیں جنھوں نے اسے چھوٹی چھوٹی ایک دوسرے میں داخل ہوتی ہوئی گزرگاہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

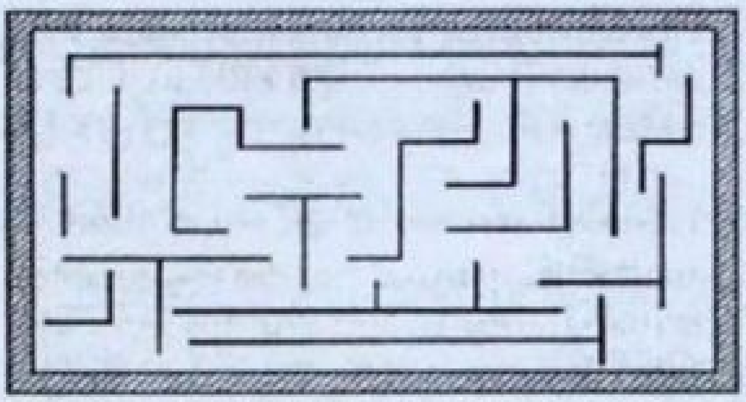

Fig. 1

اوپر سے دیکھنے پر ڈبا شکل 1 کی طرح نظر آتا ہے۔ ایک چھوٹا سا کٹھ پتلا جس کی حرکات متعدد ڈوریوں کے حکم کی تابع ہیں (شکل 2) ڈبے کی بھول بھلیوں جیسی گزرگاہوں سے گزر رہا ہے؛ یہ ڈوریاں اتنی مہین ہیں کہ بمشکل دکھائی دے رہی ہیں، لیکن یہ اتنی مضبوط ہیں کہ کاٹی نہیں جا سکتیں اور یہ ڈبے کے باہر ایک بڑے سے ہاتھ میں جمع ہیں۔ یہ ہاتھ پُتلے کی حرکات پر قابو رکھتا ہے اور جس کا یہ ہاتھ ہے وہ پورے ڈبے کو دیکھ رہا ہے، اس کی تمام گزرگاہوں اور موڑوں کو۔ دوسری طرف، پُتلا صرف اسی راہ کو دیکھ سکتا ہے جس پر چل رہا ہے اور جس لمحے وہ اس کے اختتام پر پہنچتا ہے، ڈوریاں اسے ایک نئے راستے پر کھینچ لاتی ہیں۔ میں یہ پُتلا ہوں، گتّھے کا ڈبا میری زندگی ہے، اور وہ بڑا ہاتھ تقدیر کا ہے۔

Scanned with CamScanner

Fig. 2

ہماری زندگیاں تقدیر کی گرفت میں ہیں، ٹھیک جس طرح پُتلا جیسم ہاتھ کی گرفت میں ہے۔ یہ تسلط بڑا سخت اور نا قابلِ فرار ہے۔ یہ ہماری صلاحیتوں اور خواہشوں سے کھیلتا ہے، اور یہ ہم سے کھیلتا ہے، اور یہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ اس کے پیچھے اس کھیل سے اس کا شغف ہے — نہ اچھائی، نہ انصاف، نہ صداقت، نہ ایسی ہی کوئی اور شے — اور اگر وہ ایک مرتبہ بھی اس رنج والم کو محسوس کر سکتا جو وہ ہمیں پہنچا رہا ہے، اس درد کو محسوس کر سکتا جو ہمیں دے رہا ہے، تو اپنے کیے پر شرم سے چہرہ چھپا لیتا۔

3

اسے بچپن ہی سے ڈرائنگ سے رغبت تھی۔ لوگوں کے چہرے، درخت، سڑکوں پر رواں کاریں — جو کچھ بھی اس کے حلقۂ نظر میں آتا، اس کے نوخیز ذہن پر نقش ہو جاتا۔ پھر لکیریں کاغذ پر دوڑتیں اور چیزوں کو وہ قالب عطا کر دیتیں جن میں وہ انھیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جب پندرہ سال کا ہوا تو ڈرائنگ سے اس کی الفت ایک مسئلہ بن گئی، کیونکہ وہ اسکول کے کام کو بالکل نظر انداز کر دیتا تھا۔ ہر صبح

Scanned with CamScanner

اسکول سے کھسک لیتا اور اپنے جیب خرچ سے رنگین پنسلیں اور اسکیچ بک خریدتا۔ پھر زقازیق[1] میں واقع بلدیہ کے باغ جا کر کسی الگ تھلگ خالی بنچ پر جا بیٹھتا اور تصویریں بنانے لگتا۔ اس کا باپ اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا، کبھی زدوکوب بھی کرتا، اور اکثر اس کی پنسلیں چھپا دیتا اور ڈرائنگیں پھاڑ ڈالتا، لیکن یہ سب بے سود تھا: ڈرائنگ سے اس کا شغف کہیں زیادہ قوی تھا۔ جب وہ بیس کی عمر کو پہنچا، اچانک اس کے باپ کی موت ہوگئی، اور اسی دن خود اس کی قسمت بھی طے ہوگئی۔ آخری رکاوٹ بھی ہٹ گئی تھی اور وہ جلد ہی زقازیق سے، جہاں وہ پیدا ہوا تھا، چلا گیا، اور قاہرہ کے بین السرایات محلے کے ایک پرانے گھر کی چھت پر ایک چھوٹے سے کمرے میں اقامت اختیار کرلی۔ دو سال بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ وہ تین ہفتہ وار رسالوں کے مرکزی کارٹون بنا تا رہا تھا، اور چوبیس سال کی عمر میں اس نے اپنی روغنی تصویروں کی نمائش منعقد کی۔

اس میں کیا شک ہوسکتا ہے کہ یہ آغاز راغب، بیکار[2] اور کسی دوسرے عظیم پینٹر کے شایان شان تھا، لیکن میں اُن کی بات نہیں کررہا ہوں۔ یہ آغاز تو عبدالعاطی کا تھا، اور اسے کون جانتا ہے؟ عبدالعاطی میرے والد تھے جن کا انجام، اس اٹھان اور توقعات سے بھرپور ابتدا کے باوجود، ان توقعات سے کہیں دور پرے ہوا۔ عبدالعاطی کبھی نمایاں نہ ہوسکے اور ایک پینٹر کے طور پر جو عظیم امیدیں انھوں نے وابستہ کی تھیں کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکیں۔ وہ پینٹنگ کے ارتقا میں کسی تبدیلی کا موجب نہ بن سکے، جس کا خواب انھوں نے دیکھا تھا، اور قاہرہ منتقل ہونے کے تیس سال بعد، میرے والد ہنوز ایک گمنام فنکار تھے جو حیات نامی جریدے کے لیے، جسے کوئی پڑھتا نہیں تھا، خاکے بنا کر روزی کما رہے تھے اور بعض اسکولوں میں بنائے جانے والے دیواری اخباروں کی نگرانی اور امیر امرا کے بچوں کو آرٹ کی تعلیم دینا جیسے دوسرے چھوٹے موٹے کام کر کے لشٹم پشٹم گزر اوقات کر رہے تھے۔ پچاس سال کی عمر میں عبدالعاطی کا یہ حال تھا۔ میں اپنے سے پوچھتا ہوں: میرے والد کیوں ناکام رہے؟ کیا ان میں خلقی صلاحیت کی کمی تھی؟ وہ تو ان میں بہت سے ایسے پینٹروں سے کہیں زیادہ تھی جو کامیاب اور نامور ہوئے۔ کیا اسے کاہلی اور لذتوں کی چاہت سے منسوب کیا جاسکتا

1 دریائے نیل کے ڈیلٹا کا ایک شہر جو شرقیہ گورنریٹ میں آتا ہے۔

2 صبری راغب (1920–2000) اور حسین بیکار (1912–2002) دو مشہور مصری پینٹر تھے۔

Scanned with CamScanner

ہے؟ اس کے برعکس، میرے والد نے شراب نوشی اور منشیاتی سفوف پر اپنا پیسہ صرف زندگی کے آخری دنوں میں اٹھایا۔ اس سے پہلے وہ بڑی کثرت اور تندہی سے تصویریں بناتے اور جب میں چھوٹا سا تھا تو اکثر صبح سویرے جگ پڑنے پر دیکھتا تھا کہ وہ بالکل نہیں سوئے اور تمام رات کسی نئی تصویر پر کام کرتے رہے ہیں۔ اس وقت مجھے ان پر پیار آ جاتا۔ ان کی آنکھیں تھکی ماندی ہوتیں، چہرہ کچھ تنا ہوا سا، ہنسی دبی دبی سی اور مطمئن۔ وہ جلدی سے اپنے ہاتھ رنگوں سے سنے ایپرن سے پونچھتے اور مجھے چومنے کے لیے جھکتے، اور ان کی بھلی بھلی درشت سی بوباس میرے گرد پھیل جاتی۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑتے، تھوڑا سا پیچھے لے جاتے، ایزل پر لگی تصویر کی طرف اشارہ کر کے جھوٹ موٹ کی گمبھیرتا سے پوچھتے، ''تو جناب، اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ پسند آئی آپ کو؟''

میری والدہ ہنستے ہوئے احتجاجاً کہتیں، ''تم عصام سے پوچھ رہے ہو؟ بھلا بچہ پینٹنگ کے بارے میں کیا جانے؟''

میرے والد مجھے گود میں اٹھا کر چومتے ہوئے جواب دیتے، ''کیا مطلب؟ یہ عظیم فنکار بنے گا۔ ایک دن تم سے کہوں گا، 'دیکھا، تم سے نہیں کہا تھا!'''

اگر وہ کاہلی اور استعداد کی کمی نہیں تھی تو پھر کیا تھا؟ جب میں بڑا ہوا تو میں نے اس کی وجہ ڈھونڈ نکالی۔ میرے والد میں جس چیز کی کمی تھی وہ کشش (charisma) تھی — وہ ہالہ جو عظیم لوگوں کو گھیرے ہوتا ہے اور انھیں دوسروں پر اثرانداز ہونے کی قدرت بخشتا ہے۔

کشش وہ صلاحیت نہیں جسے کسب کیا جا سکے۔ یہ کسی کو ملتی ہے، کسی کو نہیں۔ جن کو ملتی ہے ان کا مقام چوٹی پر پہلے سے محفوظ ہوتا ہے۔ اپنی داد و تحسین کے لیے ان کی لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے کہ کسی قدر ہنرمندی سے کام کریں۔ جنھیں نہیں ملتی وہ چاہے کتنی بھی کوشش کر لیں، یہ فطرت کے خلاف جنگ آزمائی ہوتی ہے جس کا انجام پسپائی میں ہی نکلتا ہے، اور ایسے لوگ چاہے خود کو کتنا بھی تھکا ماریں، داد و تحسین ملتی بھی ہے تو جھجکی ہوئی سی، اور وہ بھی شک وشبے اور تحفظات میں لپٹی ہوئی۔

وہ شخص جس نے نئی دنیا دریافت کی تھی وہ کرسٹوفر کولمبس نہیں تھا بلکہ پنزون (Pinzón) نامی ایک بوڑھا ملاح اور کشتی پر کولمبس کا ساتھی۔ پنزون نے اپنے کپتان کو صحیح راستے سے باخبر کیا، اس کے بعد اس کا نام جاوداں، کرشمہ ساز کولمبس کے نام کے اردگرد اٹھنے والی جلال وعظمت کی بانگوں میں

فراموش ہو کر رہ گیا۔

میرے والد کا مقدر وہی پنزون کا مقدر تھا — کوئی بے آب وتاب مخلوق، اتنے ہی معمولی جیسے ان جیسے لکھو کھا دوسرے لوگ جنھیں کوئی شے ممتاز نہیں کرتی۔ درمیانہ قامت، سر سے گنجے، اور کسی قدر فربہی مائل۔ آپ ان کے ساتھ پورا گھنٹہ بیٹھیں، پھر وہ رخصت ہوں، تو بعد میں آپ کو کبھی بھولے سے بھی ان کا خیال نہ آئے، اور اگر کبھی ملاقات ہو بھی جائے تو آپ انھیں غلط نام سے مخاطب کریں۔ آواز کسی قدر بھرّائی ہوئی سی تھی، جسے سننے والے خیال کرتے کہ جلد ہی زائل ہو کر صاف ہو جائے گی اور سامعین کی توجہ کو قائم رکھے گی۔ لیکن بھرّاہٹ رخصت نہ ہوتی، بلکہ پھنسی پھنسی سی نکلنے لگتی، لفظ ایک دوسرے میں مدغم ہوتے محسوس ہوتے۔ وہ تیز تیز بولتے تھے، لفظ ان کے منھ سے گرے پڑتے تھے، اور ان میں یہ صلاحیت نہیں تھی کہ لوگوں کی دلچسپی کو چند مختصر سے فقروں سے زیادہ دیر قائم رکھ سکیں۔ جب ایسا ہوتا تو لوگ اپنی توجہ دوسرے بولنے والوں کی طرف کر لیتے، اس وقت میرے والد ان کی آستین کھینچ کر یا شانہ انگلیوں سے پکڑ کر ان کی دلچسپی کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے، اور ایسے لمحوں میں کسی بے بس بچے کی طرح دکھائی دینے لگتے جس کی ماں بھیڑ میں اس سے آگے نکلی جا رہی ہو، جس کی وجہ سے وہ اس کا دامن پکڑنے پر مجبور ہو گیا ہوتا کہ کھو نہ جائے۔ گھر پر ان کا انداز ان شوہروں کا سا نہیں تھا جو سارے قاعدے قانون بناتے ہیں؛ اس کے بجائے ہر معاملے میں میری ماں کی تعمیل کرتے تھے۔ بچپن میں مجھے ان سے کبھی خوف نہیں آیا اور کبھی کبھار وہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے بھی تو ایک خبیث اور لذیذ خواہش مجھے ان کی نافرمانی کرنے پر اکساتی۔ جب ثانوی اسکول میں پہنچا تو ابراہیمیہ اسکول میں میرے دوست یہ سن کر دنگ رہ گئے کہ میرے والد کو معلوم تھا کہ اسکول گول کرتا ہوں۔ میں اطمینان سے والد سے کہہ دیتا تھا کہ اگلے روز اسکول ناغہ کروں گا اور سینما دیکھنے جاؤں گا، وہ سنتے اور مونچھوں سے کھیلنے لگتے — جو اضطراب اور تعجب کے دوران ان کی عادت تھی — پھر ایک لمحہ دکھاوے کے سوچ بچار کے بعد مجھ سے جھنجھلائی ہوئی ہنسی کے ساتھ پوچھتے جو اجازت دیتی معلوم ہوتی، ''تمھارا خیال نہیں کہ اسکول گول کرو گے تو اہم سبق سیکھنے سے رہ جاؤ گے؟''

اور بس یہ کل واردات ہوتی — ایک سوال، اور معاملہ میری مرضی پر ڈال دیا جاتا۔ اگر میں سوال کو نظر انداز کر دیتا تو بات وہیں لپٹ جاتی۔ اس کے برخلاف، اگر تذبذب کا اظہار کرتا اور

Scanned with CamScanner

معاملے پر نظر ثانی کرتا ہوا دکھائی دیتا، تو اس سے ہمت پکڑ کر جلد بازی کے ساتھ، گرمجوشی سے، باقاعدہ پڑھائی کی اہمیت پر زور دیتے۔ پھر ڈانواڈول آواز میں کہتے، ''مجھے کیا خبر، تم جانو۔ میرے خیال میں تو اسکول گول کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں۔ کیوں، تمھارا کیا خیال ہے؟''

میرے والد کمزور تھے، اور اسی وجہ سے ان کی زندگی کا انجام مکمل شکست خوردگی میں نکلا۔ تاہم، ان کی ناکامی اور کمزوری کے باوجود، میں انھیں چاہتا تھا۔ میں انھیں چاہتا تھا کیونکہ وہ اپنی ہار کو اس شخص کی خاموشی کے ساتھ قبول کرتے تھے جو قاعدوں سے باخبر ہو۔ انھوں نے دنیا کو واویلا سے نہیں بھر دیا، نہ کسی زہریلے کیڑے کا قالب اپنایا۔ کسی بڑے مقابلے کے موقعے پر وہ دوسرے شریکوں کے ساتھ نتیجے کا انتظار کرتے اور جب معلوم ہوتا کہ ہار گئے ہیں اور کوئی اور جیت گیا ہے، تو تعجب یا برہمی کا اظہار نہ کرتے بلکہ احتیاط سے اپنی چیزیں سمیٹ کر اداسی سے مسکراتے اور تیزی سے آخری بس پکڑنے چل دیتے، اور اگر برابر بیٹھے ہوئے مسافر سے فرحت محسوس ہوتی، تو جو کچھ پیش آیا تھا وہ سب اسے غیر جانبدارانہ لہجے میں بتا دیتے۔ ان کا ہم نشین سنتا، پہلے تاسف سے، لیکن پھر کوئی بے وقعت سی چیز — جیسے میرے والد کے جوتے یا قمیص اور حتیٰ کہ ان کے چہرے پر سے گزرتا ہوا تاثر — اس پر عیاں کر دیتی کہ وہ کیوں ناکام رہے تھے اور وہ شخص اب کم افسوس محسوس کرتا، یا بالکل نہیں۔

❁

بہت سے لوگ اپنی شامیں ہمارے گھر پر گزارا کرتے تھے۔ بہت سے نام تھے جن کے حامل متفرق پیشوں اور عمروں کے لوگ تھے۔ سفر یا موت کے ہاتھوں غائب ہونے والوں کے ساتھ ساتھ ان کی جگہ نئے لوگ آ جاتے۔ اپنے اختلافات کے باوجود، یہ سب ایک مشترکہ تار میں منسلک تھے: سبھی ایسی عظیم تخلیقات تھے جو نامکمل رہ گئی تھیں۔ غامدی عربی زبان کا استاد تھا جس نے کبھی شاعر بننے کا خواب دیکھا تھا۔ محمد عرفان ایک سابقہ مارکسی تھا جس نے اپنا دنیا کی کایا پلٹ دینے کا خواب ترک کر دیا تھا اور تفریحی صحافت پر قناعت کر لی تھی؛ رقاصاؤں اور مغنیوں کے بارے میں خبریں گھڑتا اور پھر ان سے پیسے اینٹھتا۔ یہاں تک کہ ''چچا'' انور نے بھی، والد بتاتے تھے، ایک عظیم نغمہ نگار بننے کا خواب دیکھا تھا، لیکن انجام کار شُگر (Sugar) نامی رقاصہ کے پیچھے قانون بجانے والا سازندہ بن کر

رہ گئے تھا۔ اس ٹولی بہت سے دوسرے بھی تھے — ایسے لوگ جن کے خواب چکنا چور ہو چکے ہوں، کسی شادی میں بیٹھے خوردہ گیری کرنے والے بڈھے، جو ہر شام بیٹھک لگا کر اپنی تقدیر اور نا ہنجار زمانے پر لعن طعن کرتے: ''ہم فلانے کو تب سے جانتے ہیں جب وہ ایک سگریٹ کے لیے خدا سے عاجزی کرتا تھا، اور اب لاکھوں میں نہا رہا ہے، المعادی میں ایک دیہی رہائش گاہ (ولا، villa) کا مالک ہے، اور العجمی میں ایک مضافاتی بنگلے (شیلے، chalet) کا، پاس تین پر تعیش کاریں ہیں۔ اور فلاں فلاں، وہی جو بڑا مشہور گایک ہے — کیا یہ پچاس کی دہائی میں ریڈیو کے امتحان میں فیل نہیں ہو گیا تھا؟ تم یقین کرو، میں خود اس امتحانی کمیٹی میں شامل تھا!'' جب میں والد کے دوستوں کے ساتھ بیٹھتا تو لمحہ بھر کے لیے بھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ یہ ایک دوسرے کو عزیز رکھتے ہیں۔ ہر وقت تو تو میں میں کرتے رہتے اور خونخوار جھگڑے ہمیشہ ہی ان کے درمیان پھٹ پڑتے۔ بایں ہمہ، وہ ہمارے یہاں ضرور آتے اور کبھی ایک دوسرے سے تعلق ختم نہ کرتے، کیونکہ جو چیز انھیں ایک دوسرے سے جوڑے ہوئے تھی وہ ان کی عداوت سے زیادہ طاقتور تھی۔ انھیں ان محفلوں کی ضرورت تھی، کیونکہ ان کے دوران ان کی کم حاصلی اور نارسائی کا احساس اپنی مشترکہ قسمت کی آگہی میں زائل ہو جاتا، اور جب وہ ملتے تو کوئی بھی اپنی ناکامی پر خجالت محسوس نہیں کرتا۔

میں ان کے پاس نہ بیٹھنے کے ہر بہانے کی تاک میں رہتا اور صرف اسی وقت دیر تک وہاں رہتا جب چچا انور موجود ہوتے۔ چچا انور مختلف تھے۔ وہ میرے والد کے قریب ترین دوست تھے، دونوں تیس سال پرانی دوستی میں منسلک تھے۔ ایک بار دونوں بین السرایات کے ایک کمرے میں ساتھ رہے تھے، جب میرے والد پینٹنگ کے خواب دیکھتے اور انور موسیقی کے۔ سکّر کے ساتھ کام کرنے سے انور بہت کما لیتے تھے اور کھلے ہاتھ سے اپنے اور اپنے دوستوں پر خرچ کرتے۔ انھوں نے شادی کبھی نہیں کی، کیونکہ شادی، ان کی رائے میں، آدمی کو اداس کر دیتی ہے، اور اداسی زندگی کو مختصر۔ چچا انور بڑے اچھے تھے۔ وہ مذاق کرنے سے کبھی باز نہ آتے اور اپنے اردگرد ہر ایک کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دیتے۔ جن راتوں کو انور چچا ''مسرت کی راتیں'' کہتے، یعنی جو کسی رئیس کی شادی کے بعد آتیں، ان راتوں کو وہ ''نعمتیں'' اٹھائے حلقے میں وارد ہوتے — برانڈی کی ایک بڑی بوتل، ایک آؤنس بڑی عمدہ قسم کی حشیش، کلو بھر کباب اور مختلف انواع کی مٹھائیاں — اور جب ان

کے دوست نعرۂ مسرت کے ساتھ ان کا خیر مقدم کرتے تو چچا انور بڑا گمبھیر چہرہ بنا کر ساری چیزیں ان کے سامنے ڈال دیتے، اور کسی سخت گیر باپ کے لہجے میں کہتے، ''کھاؤ پیو، یہاں تک کہ سفید ڈورا تمھارے بد بخت باپوں کی کالی بھجنگ کھال سے ممیز ہو سکے!''

چچا انور کسی سے بھی اتنی نفرت نہیں کرتے تھے جتنی رقاصہ سکر سے۔ وہی ان کے بیشتر تمسخر اور تشنیع کا ہدف بنتی۔ بعض اوقات، جب گفتگو خشک پڑ گئی ہو اور خاموشی در آئی ہو، حاضرین میں سے کوئی انور سے ان کی خاتون کی خیر خبر پوچھ بیٹھتا۔ بس پھر کیا تھا، انور رواں ہو جاتے۔ سکر کی جہالت، گھمنڈ، اس کے مالدار عشاق، اور ان کی امیدوں کی ناکامی کو اپنی فصاحت و بلاغت کا نشانہ بنا دیتے، اور محفل ایک بار پھر قہقہوں سے گونج اٹھتی۔ موسیقی سے انور کی منھ زور الفت کے باوجود، وہ مسلسل کئی کئی راتیں اس کے بغیر گزار دیتے۔ اور اگر کوئی قانون بجانے کے لیے ان سے کہتا بھی تو فوراً اور بڑی رکھائی سے انکار کر دیتے، اور اگر کوئی اصرار کرنے لگتا تو اکثر اچھا خاصا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوتا۔ انور کے احباب ان کی طبیعت سے واقف تھے اور فرمائش کرنے سے باز رہتے تھے، کیونکہ انھیں خوب معلوم تھا کہ کسی معین لمحے میں، جس کی پیش گوئی کوئی نہیں کر سکتا تھا، انور اچانک خود ہی ہاتھ بڑھا کر قانون اٹھا لیں گے، مضراب سے تاروں کو چھیڑنے لگیں گے اور بجانا شروع کر دیں گے۔ اگر چند لمحے کی سازندگی کے بعد ان کے چہرے کو غور سے دیکھا جاتا تو یہی معلوم ہوتا کہ ان کو اب نہ اپنے سامعین نظر آ رہے تھے اور نہ ماحول۔ جب انور ساز بجانا ختم کرتے تو لمبے اور زرد سے چہرے کے ساتھ گونجتی ہوئی داد و تحسین وصول کرتے۔ کچھ دیر تک ان کی یہی حالت رہتی اور پھر سے اپنے شور و شغب اور طنز و استہزا پر لوٹ آتے۔ تب ہمیں معلوم ہو جاتا کہ وہ اپنی پرانی حالت پر لوٹ آئے ہیں۔

❁

جمعرات کے دن شادی کی تقریبیں نہیں ہوتیں۔ اس دن چچا انور صبح صبح ہی آ جاتے۔ آنے والوں میں وہ سب سے پہلے ہوتے۔ چہرے پر نیند اور گذشتہ رات کے موسیقی کے پروگرام کے ہنگاموں کے آثار ہنوز باقی ہوتے۔ وہ بڑی شائستگی سے میری والدہ کو سلام کر کے اسٹوڈیو میں چلے جاتے۔ یہاں اپنا سوٹ اتار کر بڑی احتیاط سے ٹانگ دیتے، اور جلباب پہن لیتے (چچا انور اپنا ایک جلباب

ہمارے یہاں رکھتے تھے)۔ کچھ دیر بعد میرے والد نمودار ہوتے۔ دونوں ساتھ چائے پیتے، پھر فرش پر بیٹھ کر شام کی محفل کا سامان تیار کرنے میں منہمک ہو جاتے۔ شروعات جوزہ یا ہاتھ میں لے کر پی جانے والی گڑگڑی سے ہوتی، جس کی صفائی اور تیاری اہم کام تھے جو انور اور میرے والد دونوں کو مصروف رکھتے اور اکثر بحثا بحثی کا باعث بن جاتے۔ میرے والد کا خیال ہوتا کہ جوڑوں کو گسنے والی یہ دبیز کاغذ کی چندیاں ہیں جو دھویں کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کر رہی ہیں، اور انور یہ دعویٰ کرتے کہ یہ نرکل کی نلکی ہے جس میں رکاوٹ پڑ گئی ہے۔ میں انھیں دیکھا کرتا تھا — انور اپنا دھاری دار جلباب پہنے، آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں اور کاغذ کی چندیاں پھاڑ پھاڑ کر حقے کی نے اور چلم کے بیچ میں ٹھونس رہے ہیں، اور میرے والد پاس بیٹھے گڑگڑی کے دہانے میں بار بار پھونکیں مار کر پانی کی گڑگڑاہٹ کو سنتے ہوئے اندازہ لگا رہے ہیں۔ تیس سال پہلے جب دونوں قاہرہ آئے تھے — دونو جوان فنکار جو حوصلے اور عزم سے چھلک رہے تھے — تو کیا انھیں کبھی یہ خیال بھی آیا تھا کہ ان کا یہ انجام ہوگا؟ آغاز کتنا دور اور انجام کتنی عجیب تھی! عام طور پر گڑگڑی کی علتوں کی تشخیص کرنے میں انور زیادہ ہوشیار تھے، اور جب وہ چندیاں ٹھونس لیتے تو آزمائش کی خاطر تمباکو بھری چلم سلگاتے اور لمبا سا کش لگاتے، جس کے فوراً بعد کھانسی کا شدید دورہ پڑتا جس سے آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ پھر وہ گڑگڑی والد صاحب کو یہ کہتے ہوئے تھما دیتے: ''میں نے کہا تھا نا کہ یہ سب گسنوں کا سبب ہے۔ اب بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ کش لگاؤ اور مجھے دعائیں دو۔''

میرے والد نال کو منھ میں لینے سے پہلے میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہتے: ''تمھارے چچا انور، موسیقی کے میدان میں آنے سے پہلے، اصل میں بین السرایات میں جوزے کے مستری ہوا کرتے تھے،'' اور انور پھٹ کر کہتے: ''ایسی باتیں مت کہہ، حرام کی اولاد! تو چاہتا ہے کہ عصام میرے بارے میں اول فول سوچنے لگے؟'' پھر چہرے پر مجروح تاثر لیے وہ میری طرف رخ پھیر کر کہتے: ''ماسٹر عصام، اپنے باپ کے کہے ایک لفظ پر بھی یقین نہ کرنا! میں ساری عمر ایک راست باز آدمی رہا ہوں۔ یہ تمھارا باپ ہے جس نے مجھے حشیش پینا سکھایا، اور میں پہلے پہلے اسے چاکلیٹ سمجھتا رہا۔''

اس کے بعد لطیفوں اور چست فقرے بازی کی جھاڑ لگ جاتی، جس کے بعد انور کے چہرے پر پہلی سی گمبھیرتا چھا جاتی اور وہ کھڑے ہو کر دیوار پر ٹنگے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر

Scanned with CamScanner

سیلوفین میں لپٹا ہوا حشیش کا ڈلا نکالتے اور میرے والد کو پکڑا دیتے، جو اسے سونگھ کر دیکھتے، دانتوں سے کاٹ کر آزماتے، اور انگلیوں میں بھینچ کر بالآخر اعلان کرتے، ''میٹھا ہے، انور! مصطفیٰ کے یہاں سے لائے ہو؟ کیا خیال ہے، بقیوں کا انتظار کریں کہ اکیلے ہی ایک دم لگالیں؟''

انور دوبارہ آلتی پالتی مار کے بیٹھ جاتے اور حد سے زیادہ گمبھیر لہجے میں کہتے، ''چلو مقام [راگ] سیکا میں تنہا سازنوازی شروع کریں۔''

وہ دانتوں سے حشیش کے ڈلے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے اور انھیں شیرہ لگے تمبا کو والی چلموں میں تقسیم کرتے، پھر کوئلے سلگا کر فوراً پینے بیٹھ جاتے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لیے کہتے اور میں بیٹھ جاتا اور ان کے ساتھ پینے لگتا۔ چند ہی چلمیں پینے کے بعد حشیش کا اثر انور کے دماغ پر ہونے لگتا، ان کے پھولے پھولے پپوٹے لٹکنے لگتے، ایک گمبھیر تاثر آنکھوں میں نمودار ہوتا، اور وہ سر کو یوں جنبش دینے لگتے جیسے کسی اندرونی گفتگو پر توجہ دے رہے ہوں جو سوائے ان کے کسی کو سنائی نہ دے رہی ہو۔ پھر وہ رخ میرے والد کی طرف پھیر کر مسکراتے، ان کی موٹی سی ٹانگ تھپتھپاتے، اور کہتے، ''میرے پیارے عبدہ صاحب، کیا واقعی تم کو یہ خیال نہیں آتا کہ اس ساری پینٹنگ کے دھندے کو خیرباد کہہ دینا چاہیے تھا؟ تمھیں بیلی ڈانس سیکھ لینا چاہیے تھا۔ اس رقص میں آخر کیا عیب ہے؟ ایسا کرتے تو آج تمھاری حالت کچھ اور ہی ہوتی۔ وہ بڈھی کھوسٹ سکّر یہ ناچ ناچتی ہی ہے... '' (اور اب انور ہاتھ کمر پر رکھ کر یوں ٹھمکے مارنے لگتے جیسے ناچ رہے ہوں) ''... اور بنت حرام ہر رات پانچ سو پاؤنڈ کما لیتی ہے۔''

میرے والد جواب دینے ہی کو ہوتے کہ چچا انور، حمیت کے جوش میں آکر، گڑگڑی کے بیچ ہی اچانک اچھل کر کھڑے ہو جاتے اور چلاتے، ''کیا کہا، عبدہ؟ سخت بری بات ہے! میں کہہ رہا ہوں، تمھیں اتنا ہی تو کرنا ہے، اور بس، پانچ سو پونڈ کہیں نہیں گئے!'' اور پھر انور اور میرے والد ایک طویل قہقہے میں ڈوب جاتے۔

دوپہر کے کھانے کے وقت میرے والد رَم کا ایک جام پیتے، یہ ایسی عادت تھی جس سے قیلولے میں انھیں اچھی نیند آجاتی تھی، یا کم از کم کہتے تو وہ یہی تھے۔ رَم کی حدت ان کے جسم میں اترنے لگتی اور وہ میری والدہ اور مجھ سے باتیں کرتے اور ہنستے ہنساتے، اور بعض اوقات ایک پراسرار

Scanned with CamScanner

اداسی ان میں رہنے لگتی۔ لیکن اُس دن وہ کچھ معمول سے زیادہ ہی مضطرب نظر آرہے تھے۔ خاموش خاموش اپنی مونچھوں سے مسلسل کھیلتے رہے، آنکھیں خلا میں تک رہی تھیں، اور جب میری والدہ نے پوچھا، ''کیا بات ہے؟'' تو میرے والد نے (جو اس سوال کے منتظر معلوم ہو رہے تھے) ایک گہری سانس لی، رَم کی چسکی لگائی، اور دانتوں میں دیا سلائی سے کھیلتے ہوئے بولے، ''یقین کروگی، آج مجھے کسی نے خط بھیجا ہے کہ وہ میرے کام کا مدّاح ہے۔''

میرے والد کچھ محجوب سے دکھائی دے رہے تھے اور زیادہ بلند آواز میں کچھ کہنے لگے جیسے اسے پہلے سے تیار کر رکھا ہو، ''ظاہر ہے، مجھے ایک مدّاح کا خط ملنے پر مسرت ہے، جس طرح ہر فنکار کو ہوگی لیکن جس بات سے اور زیادہ مسرت ہے وہ یہ کہ آج ہمارے دور کے مصر میں کوئی ایسا شخص واقعی موجود ہے جو تمثیلی فن (figurative art) کی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔''

لمحہ بھر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی اور والد نے ایک اور چسکی لی۔ میں نے والدہ کی طرف دیکھا اور یہ تاثر ملا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن ابھی تک طے نہ کر پائی ہوں کہ کیا، جس سے مجھے موقع مل گیا اور بیچ میں کود پڑا، ''کہاں ہے وہ خط؟''

''وہیں جہاں تم بیٹھے ہو، میرے کوٹ کی جیب میں۔''

میں کھڑا ہوا اور بیٹھک کے کونے میں ریک سے لٹکے ہوئے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر خط نکالا۔ لفافے پر بڑے نفیس سیاہ خط میں ''عبدالعاطی، معرفت جریدہ حیات، 6 شارع قصر العینی'' لکھا تھا۔ میں نے لفافہ کھول کر خط نکالا اور پڑھنے ہی والا تھا کہ والدہ نے زور سے کہا، ''بلند آواز میں پڑھو، عصام۔''

میں نے بھیجنے والے کے نام پتے کا ذکر نہیں کیا جو محمود علی فرغل، مدینۃ النصر، محفظۃ الدقہلیہ تھا۔ لکھا تھا کہ وہ اسکول میں آرٹ ٹیچر ہے اور روغنی تصویریں بناتا ہے اور میرے والد کی طرح عظیم فنکار بننے کا خواب دیکھتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر بدھ کے دن حیات میں میرے والد کے بنائے ہوئے خاکے دیکھتا ہے اور ان کی تصویروں کی ایک نمائش بھی دیکھ چکا ہے جو چند برس قبل قاہرہ میں ہوئی تھی، اور اگرچہ وہ قاہرہ خاص طور پر یہ نمائش دیکھنے ہی آیا تھا، اور ان سے بات بھی کرنا چاہتا تھا، لیکن شدید جھجھک کے باعث اپنا تعارف کرانے سے قاصر رہا۔ تاہم اس نے پھر تاکیداً کہا کہ وہ جلد

ہی میرے والد سے حیات کے دفتر میں ملنے آئے گا تا کہ ان سے جان پہچان پیدا کرے اور انھیں اپنا کام دکھائے۔ اس نے خط ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا تھا: ''براہِ کرم اپنے شاگرد اور پیروکار کی تسلیمات قبول فرمائیں، محمود علی فرغل۔''

یہ امر کہ یہ فرغل میرے والد کا سچا مداح تھا ایسا امکان تھا جسے رد نہیں کیا جا سکتا تھا، کیونکہ آدمی کا ہمیشہ ایک خاص قسم کے شخص سے سامنا ہوتا رہتا ہے جو ایسے معاملات میں دلچسپی رکھتا ہے جن کے بارے میں اس کے علاوہ کوئی اور کچھ نہیں جانتا اور ان کی بابت خاصا گرمجوش ہو جاتا ہے، مثلاً جیسے وہ لوگ جو ''ترسانہ فٹ بال کلب'' کی حمایت کرتے ہیں یا عبد الطیف التلبانی کی گلوکاری کے عاشق ہوتے ہیں۔ مساوی طور پر یہ بھی ممکن تھا کہ فرغل کوئی ریاکار آدمی تھا جو میرے والد سے اس لیے قریب آنا چاہتا تھا کہ وہ کسی اعتبار سے اس کی مدد کر سکیں گے یا کسی سے اس کا تعارف کرا سکیں گے۔

جب میں خط پڑھ چکا تو اس وقت والد مسرت کی سرمستی سے تمتمارہے تھے۔ وہ اپنی خالی رکابی پر کانٹے سے کھیلنے لگے، آنکھوں میں بہجت کی تابندگی تھی، اور وہ اپنے ہونٹ کسی بچے کی طرح بھینچے ہوئے تھے جو مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہو۔ والدہ، جن کی اب کہیں جا کر سمجھ میں آیا تھا کہ کیا پیش آرہا ہے، بڑے زور سے نعرہ زن ہوئیں، ''واہ واہ، عبدہ! صد مبارک باد! میرے خیال میں اس خط کو فریم چڑھا کر بیٹھک میں ٹانگ دینا چاہیے۔''

میں بڑے زور سے ہنس پڑا اور والد احتجاجاً چلّائے، ''فریم چڑھانا، لٹکانا، یہ کیا حماقت ہے۔ تم واقعی نری چغد ہو۔''

میری ماں ایک لحظے کے لیے زرد پڑ گئیں، پھر کھلکھلا کر ہنسیں اور بڑبڑائیں، ''جانے دو، جانے دو۔ کوئی فریم وریم نہیں چڑھے گا۔ غصے مت ہو۔''

والد نے سگریٹ سلگا کر ان سے وضاحت کی، اس بار پرسکون اور سنجیدہ لہجے میں، کہ ان کی مسرت ایک مداح کے ہونے کے باعث نہیں بلکہ تمثیلی فن کی خاطر ہے —ایک تصور جس کو پھر انھوں نے بڑی تفصیل سے اور مختلف شکلوں میں کھول کر بیان کیا، اس کے بعد ابھرتی ہوئی نسل کی وہبی صلاحیت کے ضمن میں بڑے فنکاروں پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس کی لن ترانی کرنے بیٹھ گئے اور اپنے اساتذہ کا ذکر کیا کہ کس طرح انھوں نے ان کی ہمت افزائی کی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ والد کسی

Scanned with CamScanner

دن فرغل سے ملنے کی توقع کر رہے تھے اور یہ کہ وہ اس کی دستگیری کرنے کی ہر کوشش کریں گے۔

والد سونے کے لیے اپنے کمرے سدھارے، والدہ جھوٹے برتن اٹھا کر باورچی خانے چلی گئیں، اور میں اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ خط ابھی تک میز پر میرے سامنے پڑا تھا۔ میں نے اس پر غور کیا۔ فرغل کی لکھائی بڑی خوبصورت اور منجھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر خط اٹھالیا اور اپنی انگلیوں پر کاغذ کالمس مجھے ہموار اور ہم وضع محسوس ہوا۔ میں نے دیوار پر آویزاں والد اور والدہ کی تصویر کو دیکھا جس میں وہ شادی کالباس پہنے ہوئے ہیں۔ پہلے میں نے تصویر میں والد کے سوٹ کی وضع قطع کے بارے میں سوچا۔ پھر ایک لمحے کے لیے میرا ارتکاز ٹوٹ گیا اور دیکھا کہ خط میرے ہاتھوں میں ہے اور میں اسے دو ٹکڑوں میں پھاڑ رہا ہوں۔ اس عمل سے ایک خاموش سی کھردری آواز نکل رہی تھی۔ جب فارغ ہوا تو ایک مبہم سا قلق کچوکے لگانے لگا، لیکن میں نے اسے چلتا کیا اور بڑی تیزی سے، گویا خود کو اطمینان دلا رہا ہوں، کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور پھر ان ٹکڑوں کے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ ہر بار کاغذ کو مزید پھاڑنا دشوار ہوتا گیا، لیکن میں نے کوشش جاری رکھی تا آنکہ کاغذ پرزہ پرزہ ہو کر ہر طرف بکھر گیا۔ میں نے پرزوں کو احتیاط سے ہاتھ میں جمع کیا۔ پھر انھیں لے کر باورچی خانے میں آیا اور روشندان کے باہر پھینک دیا اور انھیں ہوا میں ہر طرف بکھرتے دیکھا۔ اس کے بعد میں نے والدہ سے چند عام سی باتوں کا تبادلہ کیا، پھر انھیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

اُس شام والدہ نے مجھے جگایا اور چائے کی پیالی تھماتے ہوئے کہا، ''تمھارے والد تمھیں بلا رہے ہیں۔'' میں اس وقت کوئی خاص بات نہیں سوچ رہا تھا اور اپنے سے کہا کہ پہلے چائے، پھر سگریٹ پیوں گا، پھر ہاتھ منھ دھو کر ان کے پاس جاؤں گا۔

شام کی نشست حسب معمول جمی ہوئی تھی۔ دھویں کے دبیز بادل اور حشیش کی تیز، چبھتی ہوئی مہک نے میرا استقبال کیا۔ والد کی سرخ انگارہ آنکھوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دیر سے پی رہے ہیں۔ چچا انور نے گنگنا کر میرا خیر مقدم کیا، ''اہلاً، یا عصام! کہاں تھے؟''

والد نے مجھے بیٹھ جانے کی دعوت دی، سو میں بیٹھ گیا، اور چچا انور نے گزگڑی میری طرف بڑھا دی، لیکن میں نے معذرت کر لی کیونکہ مجھے اپنی پڑھائی کرنی تھی، جس پر چچا انور نے گزگڑی کی نال منھ میں لیتے ہوئے جواب دیا، ''تو کیا ہوا؟ یہ بھی انکار کرنے کی کوئی وجہ ہے؟ نشے میں دھت ہو تو

اس وقت بہترین پڑھائی ہوتی ہے۔ معلوم ہے، جب میں ثانوی اسکول میں تھا تو معمول کے مطابق دو سگریٹ بناتا، اطمینان سے پیتا، اور پھر ریاضی کا کتنا ہی بڑا مسئلہ کیوں نہ ہو، حل کرنے میں مجھے ایک لمحہ بھی نہیں لگتا تھا۔"

"اور اپنی تعلیم کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا، قلاش آدمی!" محمد عرفان نے بانگ لگائی اور ہنسنے لگا۔ حاضرین کی دبی دبی سی ہنسی بھی ابھرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ماحول میں کسی وجہ سے تناؤ کی کیفیت ہے اور مجھے یہ محسوس کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ میری آمد سے والد اور غامدی کے درمیان ہونے والی گرماگرم بحث میں خلل پڑ گیا ہے۔

غامدی پچاس سال سے اوپر کی عمر کا تھا لیکن دیکھنے میں اس سے کم لگتا تھا۔ خاصا خوش شکل آدمی تھا۔ سبزی مائل آنکھیں، اور گہرے تیکھے خدوخال۔ رنگ سفید گلگوں، زردی مائل بھورے بال جو احتیاط سے پیچھے کی طرف کڑھے ہوئے تھے۔ لیکن اس شخص میں کوئی شے ایسی تھی جو ناگوار گزرتی، وہی شے جو مجھے اکثر عربی کے بہت سے مدرّسوں میں نظر آتی ہے — روح کی مسکینی اور چپکو فطرت۔ غامدی مسکرایا اور بڑی صاف آواز اور نپے تلے لہجے میں بولا، جیسے کوئی پروفیسر ہو اور اپنے طلبا کو اُس دن کا لیکچر دے رہا ہو، "عبدہ، تمھاری مشکل یہ ہے کہ تم امید پرست ہو۔ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی۔ تمھیں اس سے آگاہ ہونا چاہیے کہ آرٹ اور ادب دونوں مصر میں مر مرا چکے ہیں۔ آرٹ میں دلچسپی کی بازیافت میں مصریوں کو کم از کم آدھی صدی درکار ہوگی، اور اتنی ہی ایسے عوام کی تشکیل میں جسے اس کی واقعی پروا ہو — اور یہ میں ان بھائی صاحب کا پورا پورا احترام کرتے ہوئے کہہ رہا ہوں جنھوں نے تمھیں خط بھیجا ہے۔"

وہ دورانِ کلام مسکراتا رہا اور اپنے اردگرد کے چہروں کو اپنی سبز، بھروسا کرتی ہوئی آنکھوں سے تکتا رہا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کی بات ان پر اثر انداز ہو رہی ہے اور وہ اس کے قائل ہو گئے ہیں۔ والد مضطرب اور اس کا رد کرنے کو بے تاب نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی نشست پر کسمسائے اور لمبی سانس بھری۔ پھر بولے، ان کے الفاظ تیزی سے نکل رہے تھے اور کچھ کٹے پھٹے سے تھے، "پھر بھی، یا غامدی، تمھیں کچھ نہ کچھ رعایت ضرور دینی چاہیے۔ شروعات کرنے کے لیے صرف چند افراد ہی کافی ہوتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

تاریخی اختلاف کے لہجے میں، جس سے ظاہر ہوتا تھا وہ میرے والد کو شکست فاش دینے کے درپے ہے، غامدی نے چلّا کر کہا، ''کیسی شروعات، جناب والا؟ ہوش میں آؤ! ایک قدردان کا خط کیا مل گیا کہ جناب ہمیں یقین دلا رہے ہیں کہ مصر میں فن پرست عوام موجود ہیں! ذرا سڑک پر باہر نکل کر دیکھو، سب کچھ سمجھ میں آ جائے گا! بس اسٹاپوں کی زیارت کرو! لوگوں کے چہرے دیکھو! تمھارے خیال میں یہ لوگ فن کی پروا کرتے ہیں؟ یہ لوگ؟ اس قسم کے لوگ سوتے میں کوآپریٹو اسٹور سے مرغی خریدنے کا خواب ہی دیکھتے ہیں!''

غامدی نے ٹھٹھا مارا اور باقی سب بھی ہنسنے لگے۔ گو میں نہیں ہنسا، نہ چچا انور ہی، جو جوزے کی صفائی میں لگ گئے، اگرچہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ گفتگو دلچسپی کے ساتھ سن رہے ہیں۔ غامدی جہاں بیٹھا ہوا تھا وہیں پر جھکا اور کسی ایسے شخص کی طرح جو ایک فضول سی بحث کو، جو ضرورت سے زیادہ طول پکڑ گئی ہو، بالآخر ختم کر رہا ہو، بولا، ''سنو، عبدہ! چلو تمھاری تسلی کیے دیتا ہوں۔ ہاں تو تم نے کیا کہا تھا کہ تمھیں خط لکھنے والا روزگار کے لیے کیا کام کرتا ہے؟''

''مدرّس ہے،'' والد دبی آواز میں بدبدائے۔

''یہ تو میں جانتا ہوں، لیکن وہ آخر تعلیم کس چیز کی دیتا ہے؟''

لحہ بھر والد کچھ نہ بولے پھر جواب دیا، ''آرٹ کا استاد ہے، لیکن...''

''لیکن کیا؟ آرٹ سکھانے والا۔ تو کیا اسے آرٹ کی فہم نہیں ہوگی؟ کم سے کم اسے مبادیات سے تو واقف ہونا ہی چاہیے جو اس نے سیکھی ہوں گی۔ آرٹ پڑھانے والا، جو آرٹ کے ارتقا میں دلچسپی رکھتا ہو؟ تو حضرت، یہ آپ ہیں! اور آپ اسے فنی آگاہی کی علامت سمجھتے ہیں؟ بھلے آدمی، مجھے کیوں بناتے ہو؟''

غامدی نے ہاتھ کو رد کر دینے والے انداز میں جنبش دی، ہنسا، اور دوسروں کی طرف دیکھا، شطرنج کے کسی معرکے کے کھلاڑی کی طرح جس نے آخری ماہرانہ چال چلی ہو جو کھیل کا فیصلہ اس کے حق میں کر دے گی۔ پھر اس نے دوبارہ والد کی طرف رخ کیا اور نظرانداز کرنے والے لہجے میں جس سے استہزا چھلک رہی تھی، کہا، ''پیارے پروفیسر عبدالعاطی، تم اس خط کے معاملے کو اس کے حق سے زیادہ توجہ دے رہے ہو۔''

Scanned with CamScanner

والد نے چلّا کر اس کی بات کاٹی اور یوں لگا جیسے پہلی بار وہ خود اپنی رائے پر شک کرنے لگ گئے ہوں، ''نہیں! اُس کے آرٹ کا استاد ہونے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے! اس نے جو کہا ہے اس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایسا آدمی ہے جو سمجھتا ہے۔''

''سمجھتا ہے؟ اس جیسا آدمی سمجھتا ہے؟''

غامدی نے یہ سوال داغے اور طنزیہ قہقہہ لگایا۔ اس کے الفاظ کی خباثت سب پر عیاں تھی، کیونکہ جو بھی عبدالعاطی کا فنی کام پسند کرتا ہے وہ کیا خاک کچھ سمجھ سکتا ہے۔ والد کا چہرے واقعی برہمی سے مکدّر ہو گیا اور انھوں نے بڑے جوش میں آ کر کہا، ''ہاں، غامدی، وہ سمجھتا ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ سمجھتا ہے۔''

والد نے اِردگرد یوں نظر ڈالی جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ مجھے دیکھا تو بولے، ''عصام، اٹھو، اندر سے خط لے آؤ۔''

میں نے ان کی طرف دیکھا اور خود کو بڑی آہستگی سے کھڑے ہوتے اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پایا۔ شاید میری ہچکچاہٹ کو فراموشی سے تعبیر کرتے ہوئے انھوں نے کہا، ''خط بیٹھک میں پڑا ملے گا۔ میز پر، جہاں تک مجھے یاد ہے۔''

میں دوبارہ پلٹا، والد کی جانب دیکھا، اور خالی خالی لہجے میں کہا، ''وہ میں نے پھاڑ ڈالا۔''

''کیا؟'' والد چیخے، ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے انتہا کی طرف پھسلا جا رہا ہوں، سو میں نے کہا، آرام آرام سے اور تاکید کے ساتھ، ''وہ میں نے پرزے پرزے کر دیا ہے۔''

اس کا متحمل ہونا ان کی بساط سے زیادہ تھا۔ وہ چھلانگ لگا کر میرے طرف بڑھے۔ اتنے قریب آ گئے کہ مجھے ان کی پھولی ہوئی سانسوں کی حدت اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔ میں ان کے چانٹا مارنے کا متوقع تھا لیکن وہ تیزی سے مڑے اور چلّا کر بولے، ''تم دیوانے ہو! بالکل دیوانے! تم نے خط پھاڑ ڈالا، پاگل آدمی؟''

ایسا لگا جیسے اور کچھ کہنے کی ان میں تاب نہ رہی ہو، بس وہ حرکت کرنے، مڑنے، اور وہی الفاظ زور زور سے دہرانے لگے۔ اس اثنا میں چچا انور نے ان کے پاس آ کر نرمی سے انھیں قابو کیا، اور میں کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ مجھے نہ خوف محسوس ہو رہا تھا نہ ندامت۔ میری آگہی منقطع ہو کر رہ گئی

تھی۔ والد اور انور اور وہاں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ مجھے نظر تو آرہے تھے لیکن مبہم، تیرتی ہوئی شکلوں میں۔ جب مجھے ہوش آیا، تو والد کو یہ کہتے ہوئے سنا: ''میں جو کہہ رہا ہوں سن رہے ہو؟ میری نظر سے دور ہو جاؤ۔ خدا تمھیں غارت کرے!''

ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا اور میں نے چچا انور کو والد سے سرگوشی کرتے ہوئے سنا، ''عبدہ، یہ کوئی طریقہ نہیں۔ تم بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو۔''

جب میں راہداری عبور کر رہا تھا تو والدہ کی آواز، دبی دبی اور مُصر، کانوں میں بھنبھنائی: ''یہ کیا کیا عصام، خط پھاڑ ڈالا؟ نہیں دیکھ رہے تھے کہ اس سے انھیں کتنی خوشی ہو رہی تھی؟ اور تم ہو کہ اسے پھاڑ ڈالا؟''

میں نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ اپنے کمرے میں آیا اور پیچھے دروازہ بند کر لیا۔ پھر ڈیسک کے پاس سکون سے بیٹھ گیا، لیمپ جلایا، ایک کتاب نکالی، اور اس پر نظرِ ثانی کرنے لگا۔ مجھے ابھی تک یاد تھا کہ گذشتہ رات جس باب کا مطالعہ کر رہا تھا اس کا عنوان ''انجذابی دباؤ (Osmotic Pressure)'' تھا: محلول نیم نفوذ پذیر جھلی سے گزرتے ہیں اور دونوں سمتوں میں ان کی آمد و رفت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب جھلی کے دونوں طرف ان کا دباؤ مساوی ہو جائے۔ والد، چچا انور، غامدی، خط، فرغل کی شستہ لکھائی، ان سب کا خیال گاہے گاہے مطالعے کے دوران پراگندہ پیکروں کی طرح آتا رہا جو چمک اٹھتے اور پھر ماند پڑ جاتے، لیکن انھوں نے مجھے مضطرب نہیں کیا۔ جب کوئی چیز مجھے اچانک پیش آئے تو میرا ذہن اس کی تمام تفصیلات بے کم و کاست نقش کر لیتا ہے اور میرے تعقل کو انھیں دوبارہ مرتب کرنے میں کچھ وقت لگتا ہے؛ اور اس موقعے پر ہی میں شدید ردعمل ظاہر کرتا ہوں۔ میرا ردعمل شدید ہو سکتا ہے لیکن تاخیر سے رونما ہوتا ہے۔ صبح کے قریب تین بجے میں نے نظرِ ثانی کرنا ختم کیا، اور مجھے اسٹوڈیو سے آوازوں، ہنسی، اور موسیقی کا ملا جلا شور آتا سنائی دیا۔ میں کپڑے اتار کر شب خوابی کا لباس پہن چکا تھا اور سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ راہداری میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ والد کے قدموں کی آواز۔ انھوں نے انگلیوں سے دروازہ تھپتھپایا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ انھوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا، اندر جھانکا، مسکرائے، اور داخل ہو گئے۔ میں پلنگ کے سامنے اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ وہ قریب آئے، خود کو کرسی پر ڈال دیا، اور ٹانگیں سامنے پھیلا لیں۔ ان

Scanned with CamScanner

کے چہرے سے، جس کے خطوط ڈیسک لیمپ کی روشنی میں چمک رہے تھے، ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مکمل مدہوش اور تھکے ہوئے دونوں ہی ہیں۔ ایک لمحہ گزر گیا، اور میں آہستہ سے بستر پر بیٹھ گیا۔ یکبارگی والد نے کہا، ''کل تمھارا لیکچر کس وقت ہے؟''

میں نے جواب دیا، ''بارہ بجے۔''

پھر انھوں نے کہا، گویا لیکچروں کے وقت ہی سے ان کا اصلی سروکار ہو، ''بہت خوب۔ تمھارے پاس سونے کے لیے کچھ وقت ہے تاکہ تازہ دم وہاں جاؤ۔''

خاموشی پھر در آئی اور مجھے یکبارگی کوفت محسوس ہوئی اور جی چاہا کہ والد رخصت ہوں اور میرا پیچھا چھوڑیں، لیکن انھوں نے جمائی لی اور کہا، ''عصام، تم جانتے ہو کہ میں تمھارے مستقبل کے بارے میں بہت پرامید ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک عظیم سائنس داں بنو گے۔ مجھے احساس ہے کہ تمھیں اپنی پڑھائی بے حد مرغوب ہے۔ تمھیں کیمیا سے شغف نہیں؟''

ان کی آواز کا لہجہ کچھ ایسا تھا جس سے میری جھلاہٹ اور بڑھ گئی، لیکن وہ بولے گئے، ''مجھے یقین ہے کہ تم کیمیا کے پرستار ہو۔ ورنہ اتنی اچھی کارکردگی کیسے دکھاتے؟ لیکن، مردِ میدان، اہم بات یہ ہے کہ اسے تکمیل تک بھی پہنچاؤ۔ ٹھیک ہے نا! یہ نہیں کہ بی اے کی ڈگری لی اور نچنت ہو کر بیٹھ گئے۔ تمھیں چاہیے کہ پی ایچ ڈی کرو۔ میرے زمانے میں بی اے بڑی بات ہوا کرتا تھا، لیکن اب! یہ کہنے سے پہلے کہ واقعی کچھ کیا ہے، کم سے کم پی ایچ ڈی ضروری ہے۔ اور بہر حال، اس کے علاوہ تمھیں کرنا بھی کیا ہے؟ تمھارا کسی لڑکی سے معاملہ بھی نہیں چل رہا اور نہ تم شادی کرنے کی جلدی میں ہو۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ مجھے بتاؤ۔ بتاؤ، جھجکنے کی ضرورت نہیں۔''

والد نے قہقہہ بلند کیا، اور ان کی یہ دل لگی بازی مجھے تکلیف دہ اور گراں محسوس ہوئی۔ انھوں نے کلام کا سلسلہ جاری رکھا، جیسے چھیڑ خانی کرنے پر تلے بیٹھے ہوں، ''اور اگر کوئی لڑکی خیال میں ہے، تب بھی تم اپنی پڑھائی مکمل کر سکتے ہو۔ ایک لحاظ سے کم عمری کی شادی سے ہو سکتا ہے تمھیں اور زیادہ لگن سے کام کرنے کی تحریک ہو۔ سو باتوں کی بات تو یہ ہے کہ فن کے میدان کی طرف کبھی بھول کر بھی نہ دیکھنا۔ آرٹ وہ واحد شے ہے جس کا مجھے کھٹکا لگا ہوا ہے۔ جانتے ہو، عصام، جب میں نے اپنی پڑھائی ترک کی تو ایک لمحہ بھی اس پر تردد نہیں کیا تھا۔ مجھے لگا کہ میں وہی کر رہا ہوں جو میری فطرت کا

Scanned with CamScanner

تقاضا ہے۔ ظاہر ہے مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں۔ اپنی زندگی کو فن کی نذر کرنے پر میں نے کبھی افسوس نہیں کیا۔ میں ایک فنکار کے علاوہ اپنا تصور کسی اور شکل میں کرنے سے عاجز تھا۔ ٹھیک ہے، حالات اکثر میرے خلاف جاتے رہے لیکن میں نے وہی کیا جو کرنا چاہتا تھا۔ انقلاب سے پہلے میں تین اخباروں میں کام کرتا تھا۔ لوگ پڑھتے، سمجھتے، اور مقابلہ کرتے تھے۔ کوئی نیا فنکار ابھرتا تو وہ اسے ٹھونک بجا کر دیکھتے اور اس کی صلاحیت کا اندازہ لگاتے۔ قومیانے کے بعد، یہ سب محض روزی کمانے کا دھندا بن کر رہ گیا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نہ لوگوں میں ہنسنے ہنسانے کی خواہش باقی رہی ہے نہ فنکاروں میں مصوری کی۔ سب کچھ محض ادائے واجبات بن کر رہ گیا ہے۔ آدمی ایک مزاحیہ کارٹون بناتا ہے اور جانتا ہے کہ حماقت آمیز سی چیز ہے، اور لوگ اسے پڑھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ حماقت آمیز ہے، لیکن پھر بھی پڑھتے ہیں۔''

میں نے والد سے رخصت ہو جانے کے لیے کہنے کے لیے خود کو تیار کیا لیکن کہہ نہ سکا۔

''آج کے **الاہرام**[3] میں شاکر کا کارٹون دیکھا تھا؟''

''نہیں۔''

''ضرور دیکھنا۔ بڑا عجیب ہے۔ پتا نہیں شاکر کو کیا ہو گیا ہے — دماغ چل گیا ہے یا کیا! معلوم ہے آج اس نے کیا بنایا ہے؟ سورج کا تھال جس میں سے دو لکیریں پھوٹ رہی ہیں جنھیں اس نے ایک دوسرے کے گرد بٹ دیا ہے اور نیچے لکھا ہے: 'بنائی'۔ اِس کی حماقت خیزی سمجھ میں آئی؟ اسے مذاق سمجھا جا رہا ہے اور توقع کی جا رہی ہے کہ لوگ پڑھ کر ہنس دیں گے۔ ہنسی؟ کس بات پر؟ فنکار کے بدھو پن پر، ظاہر ہے۔ لیکن اب شاکر صاحب مشہور و معروف فنکار ہیں اور **الاہرام** اسے ماہانہ آٹھ سو پاؤنڈ دیتا ہے۔ اگر وہ الٹ پلٹ چند لکیریں کاڑھ کر دے دے تو بھی کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ نہیں، اہم بات یہ ہے کہ شاکر خود کو عظیم فنکار سمجھتا ہے اور اگر صحافیوں کی انجمن میں تمھاری اس سے مڈبھیڑ ہو جائے تو ظاہر کرے گا کہ تمھیں سرے سے جانتا ہی نہیں، یا کچھ دیر بعد تمھیں یاد کر کے کہے گا: 'پیارے دوست! معاف کرنا، لیکن تم اس قدر بدل گئے ہو اور میرے دماغ کی جو حالت ہے تم جانتے ہی ہو!' ظاہر ہے، وہ اس قسم کی حرکتیں میرے ساتھ نہیں کرتا۔ سید حامیرے پاس چلا آتا ہے

3 مصر کا سب سے کثیر الاشاعت یومیہ اخبار۔

Scanned with CamScanner

اور ادب کا لحاظ رکھتا ہے۔''

اب یہ میری برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا، سو میں اچھل پڑا۔ والد ہکا بکا ہو گئے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی در آئی۔ پھر وہ کرسی سے اٹھے اور جانے کے لیے پلٹتے ہوئے بولے، یوں جیسے ہم ایک عام سی رات ایک عام سی گفتگو کی انتہا کو پہنچ گئے ہوں، ''ٹھیک ہے۔ اچھا، تو اب چلتا ہوں تاکہ تم کچھ سو لو۔ شب بخیر۔''

انھوں نے دروازے کی طرف چند قدم اٹھائے۔ میں نے سر جھکا لیا اور نیچے قالین کے نقش و نگار کی مخلوط رنگ آمیزی کو دیکھنے لگا اور ایک لمحے کے لیے مجھ پر ایک مبہم سا احساس غالب آ گیا کہ میرے والد ہنوز کمرے میں موجود ہیں اور میرے قریب آ گئے ہیں — اور جب میں نے آنکھیں اوپر کیں، تو وہ واقعی میرے سامنے کھڑے تھے۔ انھوں کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور میرے کندھے پر رکھ دیا، لمحہ بھر مجھے دیکھا، پھر کہا، ''مجھے افسوس ہے، عصام۔''

❄

جب آپ کا باپ ایک لاغر، بیمار بوڑھا ہو اور سڑک پر برابر چلتے ہوئے آپ کے ہاتھ سے سٹا ہوا ہو، گر پڑنے کے خوف سے اپنا بوجھ آپ پر ٹکائے ہوئے ہو، اور راہ گیر اُس کے ضعف کو تک رہے ہوں اور آپ کے چہرے پر ٹھہری ہوئی اپنی متجسس نگاہوں سے آپ کو ٹٹول رہے ہوں، تو ایسے میں آپ کیا محسوس کریں گے؟ ہوسکتا ہے کہ آپ کو باپ کی ناتوانی پر خجالت محسوس ہو اور آپ ناظرین کی زیادہ سے زیادہ تحسینی نگاہوں کی خواہش میں اپنی فکرمندی کے اظہار میں غلو سے کام لیں، یا پھر اس کے ساتھ بیہودگی اور بے رحمی سے پیش آئیں کیونکہ آپ اسے چاہتے ہیں، اس کی خاطر غمزدہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ وہ جیسا پہلے تھا ویسا ہی ہو جائے — توانا اور با اہلیت۔

حیات بدھ کے دن نکلتا ہے اور میں مسجد کے سامنے کے اخبار فروش کے پاس اسے خریدنے گیا۔ لیکن وہ اس سے واقف ہی نہیں تھا۔ پھر میں جیزہ چوک میں ایک اور کے پاس گیا، پھر ایک تیسرے اور چوتھے کے پاس۔ پھر بس پکڑ کر چوک سلیمان پاشا میں ایک بڑے اخباری دکانچے پر پہنچا اور جب ٹھگنے والا میرے قریب بڑھا تو پوری لاتعلقی کے ساتھ اس سے پوچھا، ''کیا تم نے کبھی

حیات نامی کسی رسالے کا سنا ہے؟''

میں نے بات اس طرح یوں کی کیونکہ جب بھی کوئی تھڑے والا اس رسالے کے وجود کا انکار کرتا جس کے لیے والد تصویریں بناتے تھے تو مجھے ندامت اور آزردگی محسوس ہوتی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ یہ والا بھی ناواقف نکلے گا اور میری ظاہری لاتعلقی میری ندامت کو کم کر دے گی اور مجھے اور اخبار فروش کو ایک ہی صف میں لے آئے گی — گویا میں بھی، اپنے سوال کے باوجود، انکار کر رہا ہوں کہ ایسے کسی رسالے کا وجود ہے۔ لیکن مجھے تعجب ہوا کہ تھڑے والا اس سے واقف نکلا، بولا،

''پندرہ قرش۔''

مجھے اطمینان ہوا اور قیمت ادا کر دی۔ رسالہ لیا اور آخری صفحے پر ڈھونڈ اڈھانڈا تو بالآخر والد کا نام نظر آ گیا۔ بالکل نیچے ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں ان کے دستخط تھے ''عبدالعاطی۔'' گھر کے راستے میں میں نے کارٹون کا مطالعہ کیا۔ جب گھر پہنچا تو دوپہر کے دو بج رہے تھے اور والد ابھی تک پڑے سو رہے تھے۔ سو میں نے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا اور دبے پاؤں اندر آیا۔ میں نے دبیز سیاہ پردے کھینچ کر ایک طرف کر دیے اور ہر طرف روشنی بھر گئی۔ والد نے آنکھیں کھولیں اور مجھے دیکھا، اور میں نے مسکراتے ہوئے کہا، ''صبح بخیر!''

''صبح بخیر، عصام۔ کیا وقت ہوا ہے؟''

میں نے وقت بتایا اور انھوں نے جمائی لی، پلنگ کے پاس والی میز کی طرف ہاتھ بڑھا کر پیکٹ اٹھایا، سگریٹ نکال کر سلگائی اور لمبا سا کش لیا جو کھانسی کے دورے میں بدل گیا۔ میں کرسی اٹھا کر پاس آیا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا، رسالہ میرے ہاتھوں میں تھا۔ اسے تھپتھپاتے ہوئے میں نے ہنس کر کہا، ''سو اب خوش ہیں، جناب والا؟ یہ کارٹون جو آج آپ نے بنایا ہے، اس نے مجھے قریب قریب تھانے کی سیر کرا دی ہوتی۔''

والد بھونچکا رہ گے اور پوچھا کہ میری کیا مراد ہے تو میں نے کہا، ''کوئی خاص بات نہیں۔ کارٹون کے عندیے پر بس ایک دوست سے جھڑپ ہو گئی۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے قالین کے کنارے کی سلوٹ کو اپنے پیر سے درست کیا تاکہ یہ معلوم ہو کہ میں کسی ضمنی اور عام سی چیز کا ذکر کر رہا ہوں جو روز ہی ہوتی رہتی ہو۔

''یا خدا! کس بات پر لڑ بیٹھے؟'' والد نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پہلے یہ بتایئے کہ کارٹون میں جو آدمی ہے، وہ انور سادات نہیں؟''

والد بولے، ''ہاں، بالکل۔''

میں نے یوں سانس بھری جیسے تسلی ہو گئی ہو۔ ''تو میرا گمان صحیح تھا۔''

والد جسم سمیٹ کر اوپر کو کھسکے اور بستر کے سرہانے سے پشت ٹکا کر بیٹھ گئے اور بولے، ان کی آنکھوں میں پریشانی ابھرنے لگی، ''قصہ کیا ہے؟''

''کوئی بڑی بات نہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، یونیورسٹی والے حیات پڑھتے ہیں، چنانچہ ہر بدھ کو اپنے دوستوں سے میرا جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ وہ سب آپ کا کارٹون دیکھتے ہیں اور اس قسم کے سوالات پوچھ کر مجھے تنگ کرتے ہیں کہ 'کیا تمھارے والد کی مراد فلاں فلاں سے ہے؟' خاص طور پر آج اگر کارٹون انور سادات کے بارے میں نہ ہوتا تو اس کا مطلب بالکل بدل جاتا۔''

والد نے چشمہ چڑھا کر فکرمندی سے کارٹون کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے پوچھا، ''کیا خدوخال واضح نہیں ہیں؟''

میں نے زور دے کر جواب دیا، ''بالکل۔ بالکل واضح ہیں۔ لیکن میرا یہ دوست، یہ کمیونسٹ ہے، اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ کمیونسٹ لونڈوں کا سا دماغ رکھتے ہیں۔ وہ مُصر ہے کہ آپ دائیں بازو والے ہیں اور اپنے کارٹونوں میں سادات پر ہرگز حملہ نہیں کر سکتے۔''

اس طرح میں نے والد کے ساتھ ایک ایسی بحث کا شوشہ چھوڑ دیا جس پر ہمیشہ ہمارا اختلاف ہوتا اور جس کی بابت مجھے علم تھا کہ وہ انھیں مسرت پہنچاتی ہے، حالانکہ وہ غصے ہو جاتے اور مجھ پر وار کرنے لگتے۔ پھر شام کو اپنے دوستوں سے اس کی شکایت کرتے، انھیں اپنی اور میری تکرار کی بابت بتاتے اور مجھے —میری نسل کے باقی دوسروں کی طرح— آتش مزاج اور خود بیں ٹھہراتے، اور پھر جو کچھ کہہ رہے ہوتے اس کے درمیان چابکدستی سے یہ اور گھسیڑ دیتے: ''ذرا غور تو کریں، آپ سب! عصام کہہ رہا تھا کہ یونیورسٹی والے حیات پڑھتے ہیں اور وہاں اس کے دوست احباب آج کے کارٹون کی بابت اس سے جھگڑ بیٹھے تھے۔''

اپنا جملہ بیچ میں ڈال کر والد جلد ہی اپنی بات ختم کر دیتے، اور میں تقریباً ان کی یہ تشویش خود

بھی محسوس کر سکتا تھا کہ کہیں کوئی ان سے اختلاف نہ کر دے یا انھیں دروغ گو نہ کہہ بیٹھے۔

❁

یہ گرمیوں اور رمضان کا زمانہ تھا اور یونیورسٹی میں تعطیل تھی۔ روزہ نہ میرے والد رکھتے تھے نہ میں، لیکن ہم دونوں والدہ کے جذبات کا خیال رکھتے اور رمضان کے معمولات میں شامل ہوتے — مغرب کے وقت افطار، پھر فجر سے پہلے سحری۔ میں نے شام دوستوں کے ساتھ الفیشاوی قہوہ خانے میں گزاری تھی جو لوگوں کے ہجوم اور شور و شغب سے پُر تھا، اور صبح تین بجے گھر لوٹا تھا۔ والد اور والدہ میز کے گرد بیٹھے تھے۔ والدہ سحری کھا رہی تھیں اور والد چائے کے ساتھ کیک بسکٹوں کی رکابی ہضم کرنے میں مصروف تھے۔ ان کے ہونٹوں کے ڈھیلے پن، سپاٹ آنکھوں، اور غذا کے ریزے ان کے جلباب پر جس انداز سے گر رہے تھے ان سے میں نے وجدانی طور پر اندازہ کر لیا کہ وہ حشیش سے شغل کرتے رہے ہیں۔ میں نے چلتے چلتے دونوں سے چند لفظوں کا تبادلہ کیا اور کمرے میں آ کر اگلے دن کے اخباروں کی ورق گردانی کرنے لگا جو میں نے الحسین میں خرید لیے تھے۔ اس کے بعد میں سو گیا اور صبح جب بیدار ہوا تو دیکھا کہ کوئی میرا جسم دیوانہ وار ہلا رہا ہے۔ آنکھ کھولی تو دیکھا کہ والدہ گال پیٹ رہی ہیں اور مجھے اٹھانے کے لیے کھینچ رہی ہیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے والد کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ بستر پر برہنہ پڑے تھے اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سو رہے ہوں، سوائے اس کے کہ ایک بڑبڑاتی سی آواز ان کے منھ سے آ رہی تھی اور ایک کمزور سی حرکت سے ان کا جسم لرز رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ایسا تاثر تھا جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ان کا پیچھا کر رہا ہو، اور وہ اس سے بیدار ہو جانے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ والدہ نے زور سے لمبی چیخ ماری: ''عصام، اپنے والد کو دیکھو!''

وہ ان پر جھکیں، بانہوں میں بھر لیا، اور انھیں پکارنے لگیں۔ پھر انھوں نے اپنا چہرہ ان کے سینے پر ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ گھنٹہ بھر میں ڈاکٹر آیا اور احتیاط سے معائنہ کرنے کے بعد میری طرف جھکا اور مجھ سے سرگوشی میں کہا کہ انھیں اتساع شریان (aneurysm) لاحق ہوا ہے۔ اس نے مجھے فوراً ان کو ہسپتال لے جانے کی صلاح دی، بیس پاؤنڈ طلب کیے، جو اس نے شکریے کے ساتھ اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور چلتا بنا۔ ایمبولینس کے اہلکاروں نے میری والدہ کے

ساتھ مل کر بڑی کوششوں کے بعد کہیں جا کر والد کو سفید جلباب پہنایا اور پھر اسٹریچر پر ڈال کر سیڑھیوں سے نیچے لے گئے، اور والدہ اور میں ان کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ جب وہ والد کو عمارت کے داخلے سے باہر لے جا رہے تھے تو اچانک ہماری نوجوان خادمہ ہُدیٰ نمودار ہوئی اور اپنے چرخ اور رگیں ابھرے ہوئے جسم اور بالوں کی کسی ہوئی لہراتی چوٹی سمیت اسٹریچر کے پیچھے بھاگنے لگی، اس کے اردگرد چھلانگیں لگانے اور چیخ پکار کرنے لگی۔

ہسپتال کے پلنگ کے اوپر لٹکے ہوئے لیمپ کی روشنی میں مجھے والد کا چہرہ دو حصوں میں بٹا ہوا معلوم ہوا، ایک طرف کے چہرے میں آنکھ ابلی پڑ رہی تھی، اتنی کھلی جتنی کھل سکتی ہو اور لال انگارہ؛ اور دوسرا نصف چہرہ ہزیمت خوردہ اور لٹکا ہوا تھا۔ والد بولنے کی کوشش کر رہے تھے اور ایک مبہم، بیٹھی بیٹھی اور خرخراتی سی آواز ان کے اندر سے نکل رہی تھی۔ والدہ مجھے چھوڑ کر ہسپتال کی انتظامیہ سے کچھ پوچھنے کے لیے چلی گئیں۔ دوپہر کو دوست احباب، رشتے دار، اور دوسرے لوگ جن سے میں ناواقف تھا، ملنے آئے۔ انھوں نے والدہ اور مجھ سے خدا کے رحم کی باتیں کیں، ملک کے باہر علاج کی، اور اپنے دوستوں کی (ایسے لوگ جن سے وہ بہت اچھی طرح واقف تھے) جنھیں کبھی والد ہی کی سی علامات کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن جو خدا کی مدد سے صحت یاب ہو گئے تھے اور اب بڑی جاندار صحت اور مسرت سے سرفراز تھے۔ پھر ملاقاتی ایک ایک کر کے سدھارے، اور پیچھے گلابوں کے دستے اور چاکلیٹوں کے رنگین ڈبے چھوڑ گئے، اور والدہ اور میں والد کے سامنے ویسے کے ویسے ہی بیٹھے رہے؛ اور جب انھوں نے حلقے سے باہر نکلی آنکھ بند کی اور ان کے سانس میں ہمواری آ گئی، تو مجھے احساس ہوا کہ وہ سو گئے ہیں۔ بہت دیر میں، شاید نصف شب کے بعد، دروازے پر مدھم سی دستک سنائی دی، جو تھوڑا سا کھلا اور چچا انور کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ اپنا کام والا چمکدار کالر کا سیاہ ٹکسیڈو (tuxedo) پہنے تھے جس کے نیچے سفید قمیص اور ڈھلکی ہوئی بو ٹائی تھی۔ چچا انور کی نگاہ کمرے میں چکرائی، پھر انھوں نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا اور میں باہر نکل آیا، پیچھے پیچھے والدہ۔ چچا انور نے ہم سے واقعے کی روداد سنی، اور بڑی تفصیل سے ڈاکٹروں کی رائے اور مرض کی بابت ان کی پیش گوئی پوچھی۔ ان کا چہرہ تاریک تھا اور جس طرح وہ بیچ میں ہمارا قطع کلام کر رہے تھے اس سے واضح ہو رہا تھا کہ وہ غصے میں ہیں۔ جلد ہی انھوں نے اپنی سگریٹ جوتے سے مسل کر بجھا دی اور والدہ سے پوچھا کہ کیا وہ والد کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہ آگے بڑھے،

Scanned with CamScanner

دروازے کو دھکا دے کر کھولا اور اندر داخل ہوے، اور جب والد کے قریب پہنچے تو مجھے ایسا لگا جیسے آ گہی کا کوندا تیزی سے والد کی آنکھوں پر سے گزر گیا ہو اور وہ انور کو پہچان گئے ہوں۔ یہ کوندا، بہرحال، جلد ہی بجھ گیا اور آنکھ کا وہی خالی پن لوٹ آیا۔ انور چچا زور سے ہنسے اور بولے، ''کیا چکر چلا رکھا ہے، میرے پیارے عبدہ صاحب؟ یہ کیا کرتب بازی کر رہے ہو؟ ہمیں پریشان کر کے مزہ آتا ہے؟ ذرا دیکھو تو سہی خود کو — سانڈ کی طرح مضبوط! ان لوگوں نے ایک شادی کی تقریب میں مجھے ڈھونڈنے کے لیے آدمی دوڑائے اور انھوں نے کہا، 'عبدہ کے پاس فوراً پہنچو!' میں تو سمجھا کہ واقعی کچھ ہو گیا ہے!''

پھر والدہ کی طرف رخ کر کے بات جاری رکھی، ''بیگم صاحبہ، یہ بھی کوئی طریقہ ہے؟ آپ نے تو میرے اوسان ہی خطا کر دیے۔ عبدہ کو کچھ نہیں ہوا۔ دیکھیں تو، بالکل گھوڑے کی طرح ہٹا کٹا نظر آ رہا ہے۔''

پھر دوبارہ والد کی طرف رخ پھیرا، جیسے ایک ہی بار میں سب کچھ کہہ دینے کے در پے ہوں، یا تہیہ کیے بیٹھے ہوں کہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش نہیں رہیں گے: ''بس بس، اتنا کافی ہے، عبدہ! مجھے خواہ مخواہ پریشان کرنے کی سزا میں میں تمھیں منگل کے دن دیکھنے آؤں گا اور سارا خرچہ تمھارے سر ہو گا — برانڈی 84 کی بوتل اور ایک کلو کباب کی قیمت ادا کرنی ہو گی۔ عصام اور بیگم صاحبہ میرے گواہ ہیں۔''

میں تقریباً قسمیہ کہہ سکتا ہوں کہ والد کے چہرے پر مسکراہٹ کے طور پر خفیف سی جنبش ہوئی۔ چچا انور مسلسل بولتے اور ہنستے رہے اور پھر والد کو اور ہمیں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے آیا، لیکن جب وہ ہسپتال کی لابی میں نکلنے والے دروازے سے گزرے تو میری طرف نہیں دیکھا بلکہ دائیں ہاتھ مڑ گئے جہاں واش بیسن لگا ہوا تھا۔ جلد ہی ان کے قدم سست پڑ گئے، پھر وہ کھڑے ہو کر آگے کو جھکے اور ہاتھ منھ پر رکھ لیے۔ وہ بری طرح رو رہے تھے۔

اگلی صبح ہسپتال کی کوئی نرس خاکروب سے بڑے زور زور سے جھگڑنے لگی۔ وہ اس پر مریضوں کا کھانا چرانے کا الزام دھر رہی تھی۔ خاکروب نے مغلظات برسانی شروع کر دیں اور نرس کو مارنے کی کوشش میں آگے کو جھپٹا، لیکن ساتھی چاروں طرف جمع ہو گئے اور اسے روک دیا، اور جس لمحے وہ اسے کرسی پر بٹھا کر ٹھنڈا کر رہے تھے، میرے والد گزر گئے۔

4

میں نے سائنس میں بی اے کیا اور حکومتی ادارۂ کیمیا میں میر امحقق کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ یہ تقرر میرے عین حسبِ حال تھا: یہ وہ زمانہ تھا جب میں خود کو معاشرے سے الگ تھلگ کرنے کی مسلسل اور تھکا دینے والی کوششیں کر رہا تھا، اور کسی ایک ذہین آدمی سے میرا ملنا میری پوری مہم کو چوپٹ کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ کیونکہ جب ایسا ہوتا تو میں اپنے سے سوال کرتا، ''آخر میں خود کو لوگوں سے کاٹنے کے لیے کیوں اتنی تکلیفیں اٹھا رہا ہوں جبکہ مجھے سمجھنے کے لیے کم از کم ایک ذہین آدمی تو موجود ہے؟'' یوں دیکھیں تو ادارۂ کیمیا میں میری موجودگی نے میری عزلت کے عمل کو مہمیز لگا دی۔ ادارے کی عمارت پرانی، بوسیدہ، اور خاک سے اَٹی پڑی تھی۔ اسے شارعِ رمسیس کے ایک فراموش کردہ گوشے میں تعمیر کیا گیا تھا، جہاں اپنی پچاس سالہ عمر کے دوران ایک پرشور زندگی اس کے اردگرد موجزن رہی تھی، جبکہ یہ عمارت خود موت کی خاموشی میں دبکی پڑی رہی۔

آپ اپنے گھر کے غسلخانے کو برسوں استعمال کرتے رہیں اور آپ کو کبھی یہ خیال بھی نہ آئے کہ اس کی بدرو میں ایک مستقل زندگی اپنا وظیفہ ادا کر رہی ہے۔ لیکن اگر آپ کسی موقعے پر تجربے کی خاطر بدرو کا ڈھکنا اٹھا کر دیکھیں تو ایک پوری کائنات آپ کی آنکھوں کے سامنے بھنبھنانے لگے گی — درجنوں کیڑوں کے پہل روپ اور دوسرے حشرات، کھانے، افزائش نسل، باہم دست و گریباں ہونے اور ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے میں مصروف۔ پھر اس تصور سے آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ یہ مخلوق آپ کے علم میں آئے بغیر برسوں آپ کے ساتھ زندگی کرتی رہی ہے۔ عین یہی پیکر ہر صبح شارعِ رمسیس پر لوگوں کے ہجوم اور اس کی ہماہمی اور شور و غوغا سے گزرتے اور پھر اسے پیچھے چھوڑ کر بائیں مڑ کر ادارۂ کیمیا کی عمارت میں داخل ہوتے وقت میرا پیچھا کرتا رہتا — ایک نابدان جس کی تاریکی اور رطوبت میں اس نوع کے غلیظ تل چٹوں کی جماعت بند تھی کہ جن پر پیر رکھ کر مسل دیا جائے تو ان سے سفید چپچپا مادہ خارج ہونے لگتا ہے۔ ''تل چٹے'' — ادارے میں میرے ہمکاروں کی تعریف اسی علمی اصطلاح سے کی جا سکتی ہے۔ ادارے کے سربراہ، یعنی میرے باس، ڈاکٹر سعید نے ڈاکٹریٹ واکٹریٹ نہیں کی تھی، اگرچہ اس کا امتحان تین بار دیا تھا اور فیل ہو کر دکھا دیا

تھا، جس کے نتیجے میں ادارے کے کارکنان نے انھیں ''ڈاکٹر'' کا خطاب بخش دیا تھا (تحسیناً یا طنزاً) اور اس نے فوراً ہی اسے دبوچ لیا تھا، اور اگر کوئی اسے اس کے بغیر مخاطب کرتا تو بگڑ بیٹھتا۔ یہ شخص جو تحقیقی شعبے کا سربراہ بنا بیٹھا تھا (ایک ایسا عہدہ جو بڑی حیثیت والا تھا)، اس کے سکون کو درہم برہم کرنے والی بدترین مصیبتیں وہ تھیں جو اسے کھانا کھانے کے بعد لاحق ہوتیں۔ چاشت کے وقت ڈاکٹر سعید اپنی ڈیسک کے سامنے بیٹھتا اور نرم جوش فول، پھلیوں کے کباب، اور تلے ہوئے انڈوں سے لبالب بھری پلیٹ ہڑپ کرتا، اور ساتھ ساتھ میٹھی قرمزی پیاز اور سرکے میں بسا ہوا بینگن کا اچار، جس کے بعد اپنے توپ نما پیٹ کے دباؤ کو فرو کرنے کے لیے وہ اپنی پتلون کی بیلٹ ڈھیلی کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کے بعد درآمدہ اپسم سالٹ کا ایک گلاس چڑھاتا اور کسی کو چائے لانے کے لیے روانہ کرتا۔ اس کی چندیا بالکل گنجی تھی، اس پر ایک بال تک نہیں تھا، جس سے لگتا تھا جیسے بیمار ہو یا پھر بھیس بھرے ہوئے ہو، اور اپنی ابلی ہوئی آنکھوں، چگی بھنوں، گردن کے نیچے لٹکتی ہوئی کھال، اور سوقیانہ آواز کے باعث پہلی نگاہ میں بڑا حیوانی تاثر دیتا۔ گاہے گاہے، اسے دیکھتے ہوئے، مجھے ایک عجیب خیال آتا: کسی پراسرار طریقے پر میں توقع کرتا کہ ڈاکٹر سعید دورانِ کلام رک کر اپنی ساری اصلیت ظاہر کر دے گا، یعنی ڈکارنے اور اپنی دُم کھینچنے لگے گا تاکہ سب دیکھ لیں اور پھر اسے اٹھا کر ڈیسک پر اپنے سامنے رکھ لے گا۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کبھی ہونے والا نہیں، لیکن اگر کبھی ہوتا تو مجھے اس پر بہت زیادہ تعجب نہ ہوتا۔ چائے کے وقفے میں، شعبے کے تمام کارکن بندگی کے اظہار کے لیے ڈاکٹر سعید کے دفتر میں آتے اور اس کے اردگرد منڈلانے لگتے، اور جب تک جانے کا وقت نہ ہو جاتا، باتیں کرتے رہتے۔ ڈاکٹر کے دل کو سب سے زیادہ بھانے والے موضوعات تین تھے — فٹ بال کے قومی مقابلے، کیونکہ وہ اہلی کلب کا وفادار دلدادہ تھا؛ کاروں کا بازار، کیونکہ وہ اضافی طور پر کاروں کے دھندے سے پیسے بناتا تھا؛ اور، سب سے اہم، جنس — اس کے رموز اور ہتھکنڈے — کیونکہ وہ پرلے درجے کا زن باز تھا۔ بعضے اس کی یہ وجہ بتاتے تھے کہ اس کی بیوی سرد ہے، لیکن ڈاکٹر میں طلاق دینے یا دوسری عورت کر لینے کا بوتا نہیں کیونکہ بیوی مالدار تھی اور اس کی کفالت کرتی تھی۔ سو یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ وہ اپنی جنسی پیاس گھر سے دور اپنے ادارۂ کیمیا کے دفتر میں بجھایا کرے۔ ڈاکٹر سعید کی رال خاص طور پر شعبے کی صفائی کرنے والیوں اور زنانہ کارکنوں پر ٹپکتی تھی —

Scanned with CamScanner

ایک ایسا ذوق جو یقیناً اس کے اولین تجربات کی دین تھا۔ جب ان میں سے کسی عورت پر ریجھ جاتا تو اسے مسلسل اپنے دفتر میں بلاتا رہتا، جہاں وہ اس کے ساتھ بڑی بے تکلفی سے پیش آتا اور زبردستی تحفے تحائف سر منڈھتا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ جنسی نوعیت کی لطیفے بازی سے جال پھیلا کر چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتا، اور یہ لطیفے بازی بڑے اعتماد سے کرتا اور گونج دار قہقہے لگاتا۔ اور جب وار کرنے کا دن آتا، ڈاکٹر سعید عورت کو اپنے دفتر بلا کر اس سے دروازہ بند کرنے کے لیے کہتا (جس میں اس قسم کا تالا لگا تھا جسے باہر سے نہیں کھولا جا سکتا تھا)۔ جب وہ دروازہ بند کر دیتی تو اس سے الماری سے کوئی چیز نکالنے کے لیے کہتا، اور پھر اٹھ کر اس کے پیچھے جاتا اور اپنا گرانڈیل جسم عورت کی پشت سے بھڑا دیتا، اسے چمٹانے اور اپنا کام کرنے لگتا۔ جب دفتر میں یہ سب ہو رہا ہوتا تو یونٹ کے کارکنان جان جاتے، اور اس کی بابت کانا پھوسیاں اور گپ شپ کرنے اور کھی کھی کرنے لگتے، یا اپنی ناپسندیدگی کا اظہار۔ لیکن چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ اپنی مخالفت کا اظہار کبھی کھلم کھلا نہیں کرتے تھے۔

برسہا برس گزر گئے اور ڈاکٹر سعید تحقیقی شعبے میں بڑے سکون کے ساتھ اپنی مخصوص زندگی پر عمل پیرا ہوتا رہا۔ بس صرف ایک بار ایک واقعے نے اس کی ہموار سطح کو مضطرب کر دیا۔ اور یہ اس وقت پیش آیا جب امّ عماد شعبے میں وارد ہوئی—سبزی مائل آنکھوں والی ایک نوجوان حسین عورت جو شوہر کے انتقال کے بعد طنطہ سے یہاں منتقل ہو گئی تھی اور عارضی معاہدے پر شعبے کے کارکنان میں بھرتی ہو گئی تھی۔ پہلے ہی دن سے ڈاکٹر سعید امّ عماد پر نظریں گاڑے بیٹھا تھا۔ اس نے اس سے وعدہ کیا کہ اسے مستقل ملازمت دلانے میں اپنی سی کوشش کرے گا اور ہر صبح سویرے جیبوں میں قسم قسم کے چیونگ گم اور چوسنے والی مٹھائیاں بھر کر دفتر آنے لگا، جو وہ امّ عماد کو اس کے بچوں کے لیے دیتا۔ کیا ڈاکٹر سعید نے اپنا وار کرنے میں ذرا جلدی کی یا یہ کہ امّ عماد کو سمجھنے میں اس سے بھول چوک ہو گئی؟ اس نے اسے دفتر بلا کر دروازہ بند کرنے کے لیے کہا اور امّ عماد نے بند کر دیا۔ اس نے حسبِ معمول اٹھ کر اس سے چپکنے کی کوشش کی لیکن امّ عماد بڑی شدید مزاحمت کرنے لگی۔ ڈاکٹر سعید نے کوئی پروانہ کی اور قریب آنے کی کوشش میں لگا رہا۔ امّ عماد نے تنبیہ کے طور پر قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا، اور ایسی آواز میں جو بلند تو نہیں لیکن بالکل صاف اور بے ٹوک تھی کہا، ''شرم سے ڈوب مرو!'' دانشمندی کا تقاضا تو یہی تھی کہ اسے بس کر دینا چاہیے تھا، لیکن وہ دراز دستی کیے گیا، شاید اس لیے کہ وہ حد سے زیادہ

گرم ہو گیا تھا یا اس لیے کہ وہ اس کے انکار کو نپٹ عشوہ طرازی پر محمول کر رہا تھا۔ وہ پورے جسم سمیت امِ عماد پر حاوی ہو گیا اور اسے آغوش میں بھر لیا، لیکن وہ چیخنے چلانے لگی اور مسلسل چلائے گئی، یہاں تک کہ اس کی آواز سارے شعبے میں گونجنے لگی۔ آنکھ جھپکتے میں شعبے کے کارکن دفتر کے باہر آ کر جمع ہو گئے، اور جب چیخ پکار جاری رہی تو کسی نے ہمت کر کے دروازے کے شیشے پر کھٹکھٹایا۔ خاموشی کے چند لمحے گزر گئے۔ پھر ڈاکٹر سعید کے بھاری قدموں کی آواز ابھری اور اس نے خود ہی دروازہ کھولا اور لوگ اندر گھس پڑے، اس توقع میں کہ زندگی کا ناقابل فراموش تماشا نظر آئے گا۔ امّ عماد الماری کے سامنے کھڑی ہوئی تھی اور اپنی پھولی سانسیں سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کا جلباب ایک سے زیادہ جگہوں پر مسکا اور پھٹا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد ہر چیز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی بڑی شدید کشاکش ہوئی ہے اور وہ سر ہاتھوں میں پکڑے، جیسے کسی ماتم میں بین کر رہی ہو، آنسوؤں سے تر آواز میں دہراتی رہی، ''شرم نہیں آتی؟ اس کا مزہ چکھوا کر رہوں گی، بس دیکھتے رہو۔ کیا سمجھتے ہو، اگر اس قسم کی عورت ہوتی تو ان حالوں رہ رہی ہوتی؟ خدا سب جانتا ہے۔ میں کام کرتی ہوں تو اپنے بچوں کی پرورش کے لیے۔ شرم کرو!''

ایک یا دو منٹ ایسا معلوم ہوا کہ کارکنوں پر امّ عماد کی بات کا اثر ہونے ہی والا ہو، لیکن ڈاکٹر سعید نے خود اعتمادی کا انداز بحال کر لیا، سگریٹ سلگائی، امّ عماد کے قریب آیا، اور اس کا کندھا مضبوطی سے گرفت میں لے لیا۔ پھر اس کی غضبناک آواز بجلی کی طرح کڑکی اور اس نے اپنی درمیانی انگلی کو بڑے سوقیانہ پن سے نچاتے ہوئے کہا، ''سنو، اپنی ماں کی چہیتی! یہ سب حرکتیں عرس ورس پر کرتی رہنا! 'یا ولی اللہ! یا آقا!' نہ میں اتنی آسانی سے دام میں آنے والا ہوں نہ نرا گاؤدی ہوں۔ 'ایسا ہوا اور پھر ویسا ہوا' یہ سب بھول جاؤ۔ مجھے یہ چالیں خوب معلوم ہیں۔ آخری بار کہہ رہا ہوں، اور ان سب لوگوں کے سامنے، یا تو ہزار پاؤنڈ جو دراز میں تھے واپس کر دو یا میں پولیس بلاتا ہوں، قسم خدا کی۔ آیا سمجھ میں؟''

پہلے ڈاکٹر سعید اور پھر امّ عماد کی روداد سن کر کارکنوں نے شور پکار اور کانا پھوسیاں کیں، جلدی سے مصالحت کرانے کی کچھ کوششیں بھی ہوئیں، لیکن ڈاکٹر سعید نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے تو سرے سے مصالحت کے خیال ہی سے انکار کر دیا اور ان پر چلّایا، ''یا اللہ! یہ کیا ہو رہا ہے،

صاحبو؟ تمھارے نزدیک ہزار پاؤنڈ کی رقم کوئی کھیل ہے؟ تم چاہتے ہو کہ میرے الاؤنس مارے جائیں؟'' اس نے ہتھیلی دوسری ہتھیلی پر ماری اور چراغ پا ہو کر بڑبڑایا، ''حد ہو گئی!''

امّ عماد نے بڑی سے بڑی قسمیں کھائیں اور دعا کی کہ اگر اس نے رقم کو چھوا ہو، چھوا کیا اگر دیکھا بھی ہو، تو اندھی ہو جائے، اس کا بیٹا عماد ٹرام کے نیچے آ کر مر جائے، لیکن سب بے سود۔ ڈاکٹر سعید اڑا رہا کہ جو رقم اسے گذشتہ کل ملی تھی وہ واپس کرے، جسے وہ دراز میں رکھ کر اٹھانا بھول گیا تھا، اور صبح امّ عماد کے کمرہ صاف کرنے کے بعد غائب پایا تھا۔ کارکنوں کو سب معلوم تھا لیکن ایک خاموش معاہدے کے تحت انھوں نے ڈاکٹر سعید کے بیان کا احترام اور امّ عماد کی روایت کی مخالفت کی، اس خیال سے کہ ڈاکٹر سعید پر امّ عماد کی فتح، ایک طرح سے خود ان کی شکست بھی ہو گی۔ اگلے دن، ام عماد کو ڈرانے دھمکانے کے لیے وفد آئے، مجبور کیا کہ مصالحت کر لے اور رقم لوٹا دے، لیکن معلوم ہوتا تھا وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے اور مسلسل چلا چلا کر خود کو کوسنے دیتی رہی اور قرآن پر قسمیں کھاتی رہی۔ معاملہ کچھ اور پیچیدہ ہو گیا، میٹنگیں منعقد اور برخاست ہوئیں اور اس مسئلے نے ادارے کے کارکنوں کو پورا ہفتہ مصروف رکھا، یہاں تک کہ بالآخر وہ کامیاب ہوے اور امّ عماد لوگوں کے دباؤ میں آ کر ڈاکٹر سعید کے پاس گئی، معافی مانگی، اور سر پر بوسہ دیا؛ اس نے ہاتھ چوما ہوتا اگر ڈاکٹر سعید نے کھینچ نہ لیا ہوتا اور لوگوں کے سامنے صراحت سے کہا، ایسے لہجے میں جو اپنی ہی تردید کر رہا تھا، کہ امّ عماد نے کچھ سرقہ نہیں کیا ہے، کہ رقم اسے اپنی جیب میں پڑی مل گئی ہے جہاں وہ رکھ کر بھول گیا تھا، اور کہ امّ عماد فی الواقع بڑی شریف عورت ہے، ایسی جسے وہ اپنی بیٹی کی طرح چاہتا ہے۔ جب دفتر کے ہرکارے عبدالعلیم نے تجویز پیش کی کہ اب سب کو سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے تاکہ تعلقات کی بحالی مبارک ہو، تو اس وقت مَیں وہاں موجود تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جو سامنے ہو رہا ہے حقیقت نہیں، کہ وہاں بیٹھے لوگ — ڈاکٹر سعید، امّ عماد، اور کارکنان — سب کے سب وہ اداکار تھے جو ایک پہلے سے خوب مشق کیے ہوے منظر کی اداکاری کر رہے تھے جس کے فوراً بعد وہ اپنے اداکاری کے لباس اتار کر اپنی حقیقی جون میں آ جائیں گے۔ میرا یہ عجیب و غریب خیال چہرے سے یقیناً ہویدا ہو گا کیونکہ میں نے دیکھا کہ بولتے وقت ہر فرد و بشر میری طرف دیکھنے سے کترا رہا ہے۔ مجھے ذرہ برابر شک نہیں تھا کہ میرے ہمکار مجھ سے نفرت کرتے تھے اور مجھے نقصان پہنچانے کا موقع ملنے کے آرزومند

تھے۔

شعبے میں اپنے پہلے دن سے ہی میں نے ان لوگوں کو نیچ اور حقیر سمجھنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ ان سے کچھ کہے بغیر انھیں ان کی کم مائیگی کا احساس دلانا مجھے آتا تھا۔ انھی دنوں مجھے چشمہ لگانے کی حاجت پیش آئی اور میں نے پتلے پلاسٹک کا بنا ہوا گول فریم کا چشمہ منتخب کیا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس سے میرے چہرے پر بھڑکا دینے والی برتری کا تاثر آجاتا ہے۔ ہر صبح بغل میں اخبار اور کوئی ایسی موٹی سی کتاب دبائے دفتر آتا جسے میں نے دانستہ اس نظر سے چنا ہوتا کہ اس کی بابت دفتر میں کسی کو ہوا بھی نہیں لگی ہوگی — الاصفہانی کی **کتاب الاغانی**، یا گبن کی **سلطنتِ روم کا زوال اور انحطاط**، یا اوسوالڈ اسپنگلر کی **مغرب کا زوال**۔ اخباروں کی ورق گردانی کے بعد میں اپنی موٹی سی کتاب پڑھنے میں غرق ہو جاتا۔ جب کمرہ کارکنان سے بھر جاتا اور آوازوں کا شور بڑھنے لگتا، تو میں کتاب سے نظر اٹھا کر بغیر کچھ کہے وہاں پر موجود لوگوں کو گھور کر دیکھتا۔ آوازوں کا شور فوراً دب جاتا اور کبھی کبھی وہ لوگ کمرے سے باہر چلے جاتے۔

میرے قریب آنے، ہمارے درمیان کوئی قدرِ مشترک تلاش کر لینے کی ان کی پیہم کوششوں کی میں نے سختی سے مزاحمت کی، اور کبھی کوئی کارکن مسکراتے ہوئے قریب آ کر ہچکچاتے ہوئے پوچھتا، ''عصام صاحب، کیا پڑھ رہے ہیں؟'' تو میں توقف کیے بغیر گمبھیر لہجے میں جواب دیتا، ''حقیقت میں یہ بے حد خاص نوعیت کی چیز ہے۔ تمھاری سمجھ میں مشکل سے آئے گی۔'' میں پھر پڑھنے میں لگ جاتا اور وہ خاموش ہو کر چلا جاتا۔

شعبے میں ایک ماہ میں ہی میں اپنے لیے ان کے تنفر کو تقریباً چھو کر دیکھ سکتا تھا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر سعید کا سبھاؤ خاصا محتاط تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں ناپسندیدگی اور تشویش دیکھ سکتا تھا۔ اس کے نزدیک میں کوئی پراسرار ہستی تھا جس سے وہ خوفزدہ تھا اور جسے اپنے سے برتر سمجھتا تھا۔ ایک صبح وہ میرے پاس آیا اور ہنستے ہوئے دوسرے کارکنان کی طرح اپنے دفتر میں آ کر نہ ملنے پر سرزنش کی۔ بولا، ''بھلے مانس، ہمارے پاس آنے اور ساتھ ایک پیالی چائے پینے میں کیا حرج ہے؟ خاصے خوش طبع لوگوں کی ٹولی ہے۔ مزے رہتے ہیں۔''

ایک خبیث سی لذت مجھ میں چمک اٹھی، کیونکہ اس نے مجھے چانٹا مارنے کا نادر موقع فراہم کر

Scanned with CamScanner

دیا تھا۔ میں نے سنجیدگی سے اسے یوں دیکھا جیسے سمجھا نہ ہوں۔ پھر مطالعے کی طرف لوٹتے ہوئے اطمینان سے کہا، ''میرے پاس مزے کرنے کا وقت نہیں۔''

میں نے آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ اس کا چہرہ مارے غصے کے تاریک پڑنے لگا ہے اور اس نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا، ''ٹھیک ہے، مت آؤ۔ مجھے پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیا سمجھتے ہو، ہمارے پاس کرنے کے لیے کوئی بہتر کام نہیں؟ ہم گردن گردن کام میں غرق ہیں۔''

اس وقت مجھے خیال آیا کہ وہ مجھے اس ہتک کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہے گا اور ایک شدید معرکہ آرائی ناگزیر ہے۔ میرا خیال صحیح تھا۔

❁

رمضان کے مہینے میں ڈاکٹر سعید نے ایک متقی مومن کا روپ دھار لیا۔ اس کی سبز دانوں کی تسبیح ہاتھوں سے کبھی جدا نہ ہوتی، گنجے سر پر سفید، کروشیے کی کڑھی ٹوپی منڈھ لی، اور پیروں میں کھلے کھلے چپل ڈال لیے جس میں سے اس کی پھولی پھولی انگلیاں اپنے سینگوں جیسے ناخنوں کی طرح آگے کو نکلی ہوئی ہوتیں۔ اس کا دن دفتر اور غسلخانے کے درمیان گزرتا جہاں جا کر بار بار وضو کرتا، اور جب دیکھو ''سبحان اللہ!'' کا ورد کر رہا ہوتا۔ بڑی پابندی سے نماز میں کارکنوں کی قیادت کرتا، اور قرآن کے ایک بڑے نسخے سے بیٹھا تلاوت کرتا رہتا جسے ڈیسک پر اپنے سامنے کھلا رکھتا۔

رمضان کے پہلے دن میں اپنی ڈیسک کے سامنے آ بیٹھا، اخبار کھولے، اور پڑھنے لگا۔ اس صبح میں نے معمول کے مطابق عبدالعلیم سے ایک پیالی قہوہ لانے کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ ہچکچا رہا ہے، ساتھ ساتھ دبی زبان میں کچھ بڑبڑا بھی رہا ہے، لیکن میں نے کوئی توجہ نہ دی اور پھر اخبار بینی میں مصروف ہو گیا۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا اور وہ قہوہ لے کر نہیں آیا۔ جب وہ کسی کام سے اندر آیا تو میں نے پوچھا اور اس نے گستاخی سے جواب دیا، ''آج کوئی قہوہ نہیں ملے گا۔ ہر سال سلامت باشد! رمضان مبارک باد!''

اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، اس نے سرعت سے بات جاری رکھی، ''یہ ڈاکٹر سعید کی ہدایات کے مطابق ہے۔ رمضان کے دوران نہ چائے نہ قہوہ۔''

Scanned with CamScanner

عبد العلیم ایک سالخوردہ منوفی دہقان تھا۔ وہ کارکنان کی جاسوسی کرتا اور پھر جاکر ڈاکٹر سعید کو سب کچھ بتاتا۔ بقیوں کی طرح وہ بھی مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے لہجے سے بالکل واضح تھا کہ وہ اپنے انتقام کا مزہ لے رہا ہے، کیونکہ وہ ایک نوکر تھا، اور نوکروں کو اپنے آقاؤں کو کمزور حالت میں دیکھ کر مدہوشی کی حد تک منحوس لذت کا احساس ہوتا ہے۔

میں نے برہمی سے اسے دیکھا اور گالیاں دینے اور حکم دے کر قہوہ تیار کروانے کے قریب ہی تھا— جو ہونا ہے ہوتا رہے— لیکن پھر میں نے رہنے دیا، سگریٹ سلگائی، اور دوبارہ پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔

اُس رات میں فجر کی اذان ہونے تک جاگتا رہا۔ اتنا مشتعل ہو گیا تھا کہ نیند نہ آئی۔ یہ خیال کہ وہ جانور سعید میرے طرزِ عمل کو آنکنے جانچنے اور میرے طور طریق پر نگراں ہو، اور شعبے کے وہ لال بھبکو خادم میرے ساتھ شوخ چشمی سے پیش آئیں — ان باتوں نے مجھ میں تلخی بھر دی تھی۔

آنے والی صبح میں نے کچھ نہ کچھ کرنے کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ میں نے خادمہ ہدیٰ سے کہا کہ قہوہ بنا کر پوری تھرموس بھر دے، اسے بغل میں دبایا اور معرکہ آرائی کرنے چل پڑا۔ جب اپنے کمرے پہنچا تو دیکھا کہ دروازے پر ایک کاغذ چسپاں ہے جس پر لکھا ہے، ''شعبۂ تحقیق کے ارکان سے درخواست کی جاتی ہے کہ براہ مہربانی روزہ داروں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے رمضان شریف کے مہینے کے دوران مشروبات کے استعمال سے احتراز فرمائیں۔ دستخط: ادارہ'' میں ڈاکٹر سعید کی لکھائی پہچان گیا۔ میں نے درشتی سے کاغذ پھاڑ کر اتارا، مسل کر گولہ بنایا اور فرش پر پھینک دیا۔ پھر جھگڑنے کے لیے اِدھر اُدھر کسی کو تلاش کرنے لگا، لیکن راہداری خالی پڑی تھی۔ میں دفتر میں داخل ہوا، پیالی بھر قہوہ انڈیلا اور سگریٹ سلگائی۔ اخبار بینی کی کوشش کی لیکن اتنا بھڑکا ہوا تھا کہ ارتکاز نہیں کر سکا۔ میں آنے والی مڈبھیڑ کو محسوس کر سکتا تھا اور اسے جلد لانے کی تدبیریں کر رہا تھا۔ میں اس ٹٹو کو ایسا سبق دوں گا کہ ساری عمر یاد رکھے گا، میں نے سوچا، پھر تصور کیا کہ اسے زمین پر پچھاڑ رہا ہوں اور جوتے سے اس کی گنجی چندیا رگید رہا ہوں یہاں تک کہ اس سے خون جاری ہو گیا ہے۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد مجھے راہداری میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور جلد ہی ڈاکٹر سعید دروازے پر نمودار ہوا، پیچھے پیچھے عبد العلیم تھا۔ میرے ہاتھ میں سگریٹ دیکھ کر بڑی اونچی آواز میں

Scanned with CamScanner

بولا، ''یہ کیا، عصام؟ کیا کرتے ہو؟ یہ بالکل ناقابلِ قبول ہے۔''

''کیا ناقابلِ قبول ہے؟'' میں نے برانگیختگی سے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

ڈاکٹر سعید کی آواز اور زیادہ بلند ہوگئی۔

''برادر، بُرا کام کرنا ہی ہے تو کم از کم چھپا کر کرو۔ تم مسلمان ہو کہ نہیں؟''

''نہیں۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر سعید نے ہکا بکا ہو کر کہا۔

''کیا آپ نے ابھی ابھی نہیں پوچھا تھا کہ مسلمان ہوں؟ سو میں نے اب بتا دیا ہے — نہیں ہوں۔ میں مسلمان نہیں ہوں۔''

''اچھا تو پھر کیا ہو؟''

''اس سے آپ کو کیا مطلب؟''

خاموشی کا ایک لمحہ گزر گیا۔ پھر سعید چند قدم آگے بڑھا اور اس کی طیش میں آئی ہوئی آواز گونجی:

''نہیں! تم حد سے باہر نکل گئے ہو۔ صاحبزادے، میری بات سنو۔ میں ماہِ شریف میں تم سے گالی گلوچ کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ تم اپنے انتظامی افسرِ اعلیٰ سے کلام کر رہے ہو۔ سمجھے؟''

غیظ و غضب سے میرا جسم لرز رہا تھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا، بس کھڑا ہو کر اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگا، جبکہ وہ استہزا سے مسکرایا، میری طرف انگلی گھمائی اور کہا، ''مزید، کیا بتا سکتے ہو کہ تم جیسی بالغ عمر کا لڑکا روزہ کیوں نہیں رکھ سکتا؟''

''اِس کے پاس کوئی نہ کوئی معقول وجہ ہوگی، ڈاکٹر!'' کارکنوں میں سے جو ڈاکٹر سعید کے پیچھے جمع ہو گئے تھے ایک نے کہا، اور چند قہقہے بلند ہوئے۔ میں اتنا غصے میں آ گیا تھا کہ سمجھ بوجھ کھو بیٹھا اور دیکھا تھرموس پر دوہتڑ مار رہا ہوں، جو بڑی زوردار کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ فرش پر جا گری، ڈھکنا نکل کر دور جا پڑا اور قہوہ فرش پر لُنڈھنے لگا۔ کارکن دو قدم پیچھے ہٹے اور دم بخود ہو گئے، اور میں غصے سے بپھر کر پورے زور سے چلایا، ''جاہلو! میرا مذاق اڑاتے ہو؟ تم کچھ نہیں جانتے۔''

میری پھٹن پر وہ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گئے، پھر اسی کارکن نے، جو احمد جودت کہلاتا تھا، کہا، ''بالکل ٹھیک کہا۔ بس ایک آپ ہی سب کچھ جانتے ہیں، عبقری صاحب۔''

Scanned with CamScanner

وہاں جو کھڑے تھے ان میں سے بعض ٹھٹھا مار کر ہنسنے لگے اور جودت نے تالی بجا کر احمقانہ انداز میں آواز کھینچ کر کہا، ''عب ب ب قری صاحب!'' پر شور قہقہہ اور اونچا ہو گیا اور میں ان پر چلایا، لیکن میری آواز شور میں دب گئی، ''ٹھیک ہے! خوب قہقہے لگاؤ! میں نے اسلام کے بارے میں تم سے کہیں زیادہ پڑھا ہے۔''

انھوں نے میری بات نہیں سنی اور ہنسی ٹھٹھول جاری رکھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں ان پر چلاتے ہوئے جیسا نظر آ رہا ہوں گا اس سے ان کی تفریح بازی اور بڑھ گئی تھی۔ بس پھر کیا تھا، دوبارہ بھڑک اٹھا اور ان پر چلایا، ''احمقو! تالی کے کیڑو!''

قہقہہ زنی یکبارگی تھم گئی۔ ہر طرف کھسر پھسر شروع ہو گئی اور ڈاکٹر سعید نے میری طرف بڑھتے ہوئے چلا کر کہا، ''منھ کو لگام دو!''

''لگام تم دو، جانور! تم بالکل گھامڑ ہو اور کچھ نہیں جانتے!''

وہ لوگ سکتے میں آ گئے۔ ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر اچانک عبد العلیم ہاتھ اٹھائے مجھ پر جھپٹا اور خرخراتی آواز میں چلایا، ''کافر! کتے!''

اس کے بعد کیا ہوا اس کے بس الجھے الجھے سے تاثرات یاد میں باقی رہ گئے ہیں۔ عبد العلیم نے خود کو مجھ پر پچھاڑا اور میں نے اسے منھ پر طمانچہ مارنے کی کوشش کی، لیکن نشانہ خطا گیا اور ضرب منھ کے بجائے گردن پر پڑی۔ اس نے میری قمیص جکڑ لی اور مغلظات برسانی شروع کیں۔ کارکنوں نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کیا اور مجھے بزور دھکیلتے ہوئے کمرے کے باہر لے گئے، ڈاکٹر سعید کے چلانے کی بھاری بھرکم آواز میرے پیچھے آتی رہی، ''لوگو، دیکھو، یہ کمیونسٹ ہے! مجھے شروع دن سے شک تھا۔ اس کی فوراً چھان بین کراؤ!''

5

دیکھنے میں پانی کا قطرہ بلور کی طرح شفاف نظر آتا ہے، لیکن اگر اسے عدسے کے نیچے مکبّر کیا جائے تو ہزاروں آلائشیں نظر آنے لگتی ہیں۔ ماہتاب جب تک دور ہوتا ہے، حسین اور صاف ستھرا نظر آتا ہے، لیکن اگر اس کے قریب آئیں تو کسی گندے اور اجاڑ ساحل آب جیسا لگتا ہے۔ اپنے محبوب کا

Scanned with CamScanner

چہرہ بھی، جس کی تازہ، گلابی رنگت آدمی کا دل مسحور کر لیتی ہے، قرینے سے دیکھنے پر کسی بھدّے سلوٹ زدہ کپڑے کی طرح معلوم ہونے لگتا ہے۔ آپ جس وقت بھی چاہیں اس حقیقت کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ حسن و خوبصورتی سے ہماری چاہت ایک فریبِ نظر ہے، اور نظر جتنی زیادہ پھیل جاتی ہے، سلوٹیں اتنی ہی زیادہ صاف نظر آنے لگتی ہیں۔

6

ہمارا گھر چالیس کی دہائی کی طرز کا بنا ہوا ہے؛ چھت بلند اور نقشین؛ چھوٹے چھوٹے چوکھٹوں والے بڑے بڑے ٹائلوں کا فرش، جن کے رنگ لوگوں کے قدموں کے نیچے آ کر مٹ متا گئے ہیں؛ متین، چوبی فرنیچر جس سے کہنگی کی بو باس آتی ہے؛ کرسیوں کے غلاف اور میز پوش جن کے رنگ بدل گئے ہیں اور جو اپنی قدامت کے باعث جگہ جگہ سے پھٹ گئے ہیں۔ ہمارے گھر کے کمرے کشادہ اور گونج دار تھے، سڑک کے رخ بڑی بالکنیاں، اور دوسری طرف تنگ چھجے، ایک بڑا غسلخانہ مالکوں اور ایک چھوٹا سا، نظروں سے ڈھکا چھپا، نوکروں اور ناگہانی ضرورت آ پڑنے پر استعمال کے لیے، اور داخلے کے لیے دو الگ الگ دروازے، ایک جو گھر والوں کے لیے تھا اور دوسرا جو سیدھا اس بیٹھک میں کھلتا تھا جسے میرے والد نے اپنے اسٹوڈیو میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہمارے گھر کی ہر چیز سے ایک گزری ہوئی پُرآسائش زندگی کی بھنک آتی تھی جو اب اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ والد کی وفات کے بعد میں ان کے اسٹوڈیو میں منتقل ہو گیا۔ میں نے ہر چیز کو — دیوار برابر تہہ در تہہ جمی پینٹنگز کا انبار، رنگوں کے ٹین کے ڈبے، رنگ ملانے کی بیضوی تختی، چھوٹا سا اسٹول، وہ جگہ جہاں دوست احباب بیٹھتے تھے، چھوٹے چھوٹے گاؤ تکیے اور قالین؛ حتیٰ کہ گڑگڑی، انگیٹھی اور کوئلوں کے تھیلے — ویسا کا ویسا ہی رہنے دیا۔ بس اتنا کیا کہ کمرے کے دور کے کونے میں اپنے تصرف کے لیے ایک جگہ بنائی اور یہاں اپنے سونے کے لیے ایک 'سفری' بستر ڈال لیا۔ ہر رات آنکھیں بند کرنے سے پہلے میں اسٹوڈیو پر نظر ڈالتا۔ یہ میرے والد کی جگہ تھی اور یہاں میں ان کے وجود کو مبہم لیکن بڑے اٹل طور پر محسوس کر سکتا تھا۔ میں ان کی چیزوں کے پاس ان کی حفاظت کے لیے سوتا۔ جب، ایک دن، وہ لوٹ آئیں گے تو انھیں ہر چیز کو اپنی جگہ پا کر اطمینان ہو گا اور میں اپنے سابقہ کمرے میں

Scanned with CamScanner

لوٹ جاؤں گا۔ اپارٹمنٹ کے ایک کمرے میں میری علیل والدہ سوتی تھیں اور دوسرے میں میری اسی سے اوپر عمر کی نانی۔ ملازمہ ہدیٰ دونوں کے کمروں کے بیچ کی راہداری میں اپنا بستر ڈال لیتی اور اپنی دودھ پیتی بچی کو لپٹائے سو جاتی۔ ہدیٰ نے ایک پلمبر سے شادی کی تھی جو دو سال پہلے کام کرنے عراق چلا گیا تھا اور اس کے بعد اس کی کوئی خیر خبر نہ ملی، سو وہ خدمت گیری کے لیے واپس ہمارے گھر چلی آئی تھی۔ میرے ماموں نے، جو میری والدہ کے اکلوتے بھائی تھے، سعودی عرب میں دس سال گزارے تھے اور اسی لیے وہ ہم سب — میری، والدہ، نانی، ہدیٰ، اور اس کی بچی — کی کفالت کرتے تھے۔ ہم پرانے طرز کا ایک مربوط خاندان تھے، لیکن میں قریب آیا، اور میں نے دیکھا۔

7

ایک دن کام سے واپسی پر دیکھا کہ والدہ خاموش اور پریشان ہیں۔

جب میں نے اصرار کر کے پوچھا تو رونے لگیں اور بتایا کہ وہ ہراساں ہیں لیکن وضاحت نہیں کی۔ ان کے پیچھے سے ہدیٰ نے مجھے اشارہ کیا اور باورچی خانے میں الگ لے جا کر بتایا کہ والدہ کے سینے پر سوجن سی ہے جس کے باعث وہ خوفزدہ ہیں۔ سوجن چند ماہ پہلے نمودار ہوئی تھی لیکن انھوں نے کسی کو نہ بتانے کا فیصلہ کیا اور اپنے طور پر اس کا علاج کرتی رہیں۔ ہر چیز آزما کر دیکھ لی۔ سینے پر گندھا ہوا آٹا ملا، پلستر لگائی، پانی میں بھیگی شکر کی پٹی باندھی — حتیٰ کہ ایک پڑوسن کے کہنے پر ضبط تولید کی گولیاں بھی کھا کر دیکھ لی تھیں — اور آخر میں، جب یہ سارے حربے ناکارہ ثابت ہوئے، تو میری والدہ نے ورم سے تجاہل برتنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ بس گپ شپ کرو، ہنسو ہنساؤ، تیور چڑھاؤ، اور یوں زندہ رہو جیسے ورم کا وجود ہی نہ ہو۔ ایک موہوم سی امید نے کہہ رکھا تھا کہ ایک صبح اٹھنے پر ورم اسی تیزی سے غائب ہو چکا ہو گا جس تیزی سے اچانک نمودار ہوا تھا۔ لیکن بے سود۔ ورم بالکل جمے رہنے کے لیے آیا تھا، حملہ آور ہو کر پھیلنے کے لیے، اور جب وہ ان کی گردن تک سرک آیا اور وہ پھول کر نیلی نیلی رگوں سے بھر گئی، تو اسے چھپانا یا نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا۔

شام کے وقت ڈاکٹر کا کلینک مریضوں اور ان کے رشتے داروں سے بھرا رہتا تھا۔ میں ایک

ہی نظر میں مریضوں کو ان کے گھر والوں سے الگ پہچان لیتا تھا، صرف ان کی پیلاہٹ، اور اضمحلال ہی سے نہیں، بلکہ ان کی خالی خالی اور جیسے اندھیرے سے ڈھپی آنکھوں سے، یوں جیسے کہ جب وہ آپ کی طرف دیکھ رہی ہوں، تو گویا آپ کے پیچھے کچھ دیکھ رہی ہوں— کوئی مبہم سی شے جس کی جھلک صرف موت سے پہلے نظر آجاتی ہو۔

ڈاکٹر بیک وقت گومڑوں کے علاج (oncology) کا استاد اور مسلح افواج کا بریگیڈیر جنرل تھا اور مذہبی بھی (اس کی پیشانی پر نماز پڑھنے کے باعث سیاہ گٹا پڑا تھا اور اس کے سر کے اوپر دیوار پر دیدہ زیب مطلاً خوش خطی میں آیت الکرسی ٹنگی ہوئی تھی)۔ بڑی احتیاط سے والدہ کا معائنہ کرنے کے بعد وہ اپنی ڈیسک پر آیا اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے ساتھ گفتگو شروع کی۔ پھر سر جھکا کر، تاکہ والدہ سے نظریں نہ ملیں، ان سے کہا، ''حاجہ، آپ خدا پر ایمان رکھتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابِ کریم میں کہا ہے، قل لن یصیبنا الا ما کتب اللّٰہ لنا، صدق اللہ العظیم۔ [''آپ کہہ دیجیے کہ ہم پر کچھ پیش نہیں آسکتا مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے''؛ قرآن، 51:9] مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کو سخت موذی اور منتشر رسولیاں نکل آئی ہیں۔ ہم اسے 'چوتھے درجے' کی نوع قرار دیتے ہیں اور بدقسمتی سے انھیں آپریشن کے ذریعے نکالا نہیں جاسکتا۔ ہمیں کیموتھیراپی پر زیادہ اعتماد ہے اور اس سے بھی زیادہ خدائے سبحانہ وتعالیٰ پر۔''

کالج میں میرے اساتذہ اپنے تجربات کے لیے چوہے استعمال کرتے تھے لیکن پہلے انھیں مار دیتے تھے۔ جب کسی چوہے کا پیغامِ اجل آجاتا اور سفید دستانے میں ملفوف استاد کا بڑا سا ہاتھ اسے پکڑنے کے لیے پنجرے میں جاتا تو چوہا اس کی گرفت سے نکل جانے کی جان توڑ کوشش کرتا؛ جب، بالآخر، اس میں ناکام رہتا اور ہاتھ اسے مضبوطی سے گرفت میں لے لیتا اور مار دینے کے لیے پنجرے سے نکالتا تو چوہا وقفے وقفے سے چیخیں مارنے لگتا اور بے ساختہ فضلہ خارج کر دیتا۔ ڈاکٹر کے کلینک میں والدہ بھی خوب چلائیں، گالوں پر طمانچے مارے اور فرش پر خود کو گرا دیا۔ بڑی جدوجہد کے بعد ہی ڈاکٹر اور میں انھیں پُرسکون کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر نے کچھ دوائیں اور ٹیسٹ لکھ کر دیے اور میں والدہ کو ٹیکسی میں بٹھا کر گھر لایا۔ راستے میں میں نے ان سے کچھ نہیں کہا لیکن اندھیرے میں ان کے چہرے پر روشنی کے جھماکے، اور ایک سسکی سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رو رہی

ہیں۔ گھر پہنچتے ہی والدہ نے اپنے بھائی عباس کو فون کیا؛ بات کرنے کے دوران کرب کا تاثر ان کے چہرے پر گڈ گیا جو پھر کبھی وہاں سے رخصت نہ ہوا۔

مہینوں تک علاج ہوتا رہا۔ والدہ کا جسم خشک پڑ گیا، چھاتیاں بالکل تباہ ہو گئیں، جلد کا رنگ سیاہ پڑ گیا، اور بال جھڑ گئے، لیکن وہ کرب لمحہ بھر کے لیے بھی ہل کرنہ دیا۔ ہونی کا دھڑکا جسے یکسو نہ کیا جا سکے ان پر حاوی ہو گیا اور ایک ہی خیال ان پر غالب آ گیا— کہ ہر قیمت پر موت کو دور پرے کر دیا جائے، منڈلاتے شکنجے سے فرار پایا جائے اور زندہ رہا جائے۔ میں نے ایک دفعہ پڑھا تھا کہ جب ہاتھی کی موت کا وقت قریب آ جاتا ہے، تو وہ خود ہی اس جگہ چل پڑتا ہے جو اس نے اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر منتخب کی ہوتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ہاتھی کے قدم آپ ہی آپ ٹھہر جاتے ہیں اور وہ سکون سے اپنی موت کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ دلیری اور ہاتھ پاؤں نہ پٹخنے سے زیادہ عالی مرتبت اور کیا فعل ہو سکتا ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ میں والدہ کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ مجھے چاہتی تھیں؛ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر انھیں میری موت اور اپنی مکمل شفایابی میں سے کسی کو چننا پڑتا تو وہ بلا تردد میری موت ہی کو چنتیں— چاہے بعد میں یہ چناؤ انھیں کتنا بھی افسوس کیوں نہ دلاتا رہے، کم از کم وہ تو ٹھیک ٹھاک رہیں گی۔

والدہ پر دہشتِ مرگ اس طرح غالب آ گئی تھی کہ انھیں کسی اور چیز کی فکر کرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ جب عباس ماموں ملنے آتے تو والدہ اپنے ضعف و عجز کے اظہار میں اور بھی غلو سے کام لیتیں۔ ان کی اور زیادہ چاپلوسی کرتیں، بڑی گرمجوشی سے خدا سے دعا کرتیں کہ ان کے مال و دولت میں اضافہ کرے اور ان کے بچوں کو محفوظ رکھے۔ جھوٹی شفقت سے ان کے سینے پر ہاتھ پھیرتیں اور مجھ پر غصے سے برستیں — ظاہر ہے اس وقت میری کیا قدر و قیمت ہو سکتی تھی؟— کہ میں نے کھڑکی کھلی چھوڑ دی ہے اور ٹھنڈی ہوا سے میرے ماموں کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جب ماموں رخصت ہونے کے لیے کھڑے ہوتے تو والدہ خوب ٹسوے بہانے لگتیں کہ انھیں خوف ہے کہ کسی دن اس زنِ حرام (یعنی اُن کی بیوی) کی پیہم خوردہ گیری سے ماموں کا دل اُن کی طرف سے سخت نہ پڑ جائے۔ اس پر ماموں مسکرا دیتے، جھک کر والدہ کی پیشانی چومتے، جیب سے پیسوں کا لفافہ نکالتے، جو پہلے سے تیار کیا ہوا ہوتا، اور اسے ان کے تکیے کے نیچے سرکاتے ہوئے، تشویش کے ساتھ سرگوشی میں کہتے، ”بھولے سے بھی میری بیوی سے میرے یہاں آنے کا ذکر نہ کرنا۔ تمھیں معلوم ہی ہے، حکمت بوڑھی

Scanned with CamScanner

اور بدمزاج ہوتی جا رہی ہے، اور میرے سر پہلے ہی سے بہت سے پریشانیاں لگی ہوئی ہیں۔"

⊕

میں ملازمہ ہدیٰ کے ساتھ جفتی کرنے لگا تھا۔ خواہش مجھے کھا جاتی، میرے اعصاب کو یوں کھوند کر رکھ دیتی کہ میں اس کے جسم سے اٹھتی ہوئی سڑاند، اس کے بھدے، غلیظ ہاتھوں، بدہیئت پاؤں کے چٹخے ہوئے بھورے ناخنوں کی بھی پروانہ کرتا۔ میں اسے بلاتا اور وہ میری آواز کے لہجے سے جان جاتی کہ میں کیا چاہتا ہوں اور میرے کمرے میں چلی آتی، پیچھے دروازہ بند کر دیتی اور میری طرف دیکھے بغیر خاموشی سے انتظار کرنے لگتی۔ میں جھپٹ کر اپنی بانہیں اس کے گرد ڈال دیتا اور سب کچھ آنِ واحد میں، ایک لفظ بھی نکالے بغیر، تمام ہو جاتا۔ مجھے نمٹ جانے کی بیتابی ہوتی اور جب ہم فارغ ہو جاتے تو وہ میری گرفت سے پھسل کر نکل جاتی اور اپنے کپڑے سمیٹنے لگتی۔ ملاپ کی تفصیلات، جن میں سے لذت کی شوریدگی غائب ہوتی، میرے شعور پر خالی پن کی طرح چھا جاتیں اور مجھے وہی تنفر محسوس ہونے لگتا جو کالج کے ایام میں مینڈک کے چیپ دار لجلجے پیٹ سے ہاتھ مس ہوتے وقت محسوس ہوتا، اور جس سے پیچھا چھڑانے کے لیے میں گرم گرم پانی سے نہاتا۔

ہمارے تعلق کے اوائل میں میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ والدہ کے سو جانے کے بعد ہی ہدیٰ کو کمرے میں بلاؤں۔ لیکن کچھ مدت کے بعد اس تکلف سے بے پروا ہو گیا۔ والدہ کو پتا تھا کہ کیا گل کھل رہے ہیں لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی یا، کم از کم، معترض ہونے کی جرأت نہیں کی، کیونکہ وہ دائم ہدیٰ کی محتاج تھیں۔ ہدیٰ ہی انھیں کھانا کھلاتی، ان کے جسم کی صفائی کرتی، کپڑے بدلواتی، غسلخانے لے جاتی، اور اس نے ساری دواؤں کے استعمال کے اوقات منھ زبانی یاد کر رکھے تھے۔

ہدیٰ سے ہم بستری کے بعد میں کمرے کے باہر نکلتا تو والدہ کو بستر میں چوکنا بیٹھا ہوا پاتا۔ وہ ہمیشہ خود ہی گفتگو میں پہل کرتیں یا کوئی سوال کرتیں، گویا اس خیال ہی کو رد کر رہی ہوں کہ جو کچھ ابھی ابھی میرے کمرے میں ہوا ہے، وہ اس سے کسی بھی طرح باخبر ہیں۔ جب کبھی میں ان سے شکایت کرتا کہ ہدیٰ میرے کاموں سے بے توجہی برت رہی ہے اور میں اسے نکالنے کی سوچ رہا ہوں، تو وہ میری طرف دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھ کر کہتیں، "رہنے دو، میں آج ہی اسے بھیج کر تمھارا کمرہ صاف کرواتی ہوں۔"

Scanned with CamScanner

مجھے پورا یقین تھا کہ اسے میرے کمرے میں بھیجنے سے ان کی مراد اسے جنفتی کے لیے بھیجنا تھا۔ ہدیٰ کے بنا والدہ اپنے جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں، اور یہ خیال کہ کوئی اسے اتنا برہم کر دے گا کہ گھر چھوڑ کر چلی جائے، انھیں وحشت زدہ کر دیتا تھا۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سارا دن اور رات اسی کے پاس بیٹھی رہتیں۔ اس خیال سے وہ کانپنے لگتیں کہ کسی دن ضرورت پڑنے پر وہ ہدیٰ کو نہیں پا ئیں گی، اور جب ہدیٰ اپنی بچی کوثر کی دیکھ بھال میں — دودھ پلانے یا پوتڑے بدلنے میں — ان سے غافل ہو جاتی تو اس صورتِ حال پر میں والدہ کی شدید ناراضگی کو محسوس کر سکتا تھا۔ ایک بار کوثر بیمار پڑ گئی اور سخت بخار چڑھ آیا۔ میں نے ہدیٰ کو دس پاؤنڈ دیے کہ جا کر ڈاکٹر کو دکھا لائے، لیکن والدہ نے اعتراض کیا اور یوں ظاہر کیا کہ یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ وہ مصر تھیں کہ بچوں کو اکثر بخار چڑھتا رہتا ہے اور خود بخود اتر جاتا ہے، نہ انھیں علاج ولاج کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ یہ کوئی نقصان پہنچاتا ہے۔ خود ہدیٰ بھی تقریباً قائل تھی کہ ڈاکٹر کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر میں نے اصرار نہ کیا ہوتا تو گئی بھی نہ ہوتی۔ بالآخر جب ہدیٰ اپنی بیٹی کو لے کر گئی اور والدہ اور میں تنہا ہوئے تو انھوں نے میرے اصرار کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ کی۔ میں نے کہا کہ بچوں کو دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے اور بخار کسی اندیشہ ناک بیماری کی علامت ہو سکتا ہے۔ والدہ ایک لمحے کو خاموش ہو گئیں اور اپنی انگلی منھ میں ڈال لی (یہ عادت انھوں نے بیماری کے ساتھ ساتھ ڈال لی تھی)؛ پھر انھوں نے چہرے پر دہشت زدگی اور شیطنت کے تاثر کے ساتھ مجھے دیکھ کر سرگوشی کی: ''عصام، ذرا سوچو تو، اگر ہمارا رب بیٹی سے ہدیٰ کی جان خلاصی کرا دے تو وہ میری دیکھ بھال کے لیے بالکل آزاد ہو جائے گی!''

میں مذمت کے طور پر کچھ بڑبڑایا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، لیکن والدہ نے اپنا چہرہ مجھ سے جس قدر دور ہو سکا پھیر لیا، ہاتھ ہلا کر کچھ اشارہ سا کیا اور یوں بولیں جیسے بات نہایت غیر اہم ہو، ''اس میں کیا برائی ہے؟ آخر بہت سے شیر خوار مرتے ہی ہیں۔ جانے والوں میں ایک اور جا شامل ہوگا۔''

8

ہدیٰ، جسے کوئی یتیم خانے کے دروازے کے سامنے ڈال گیا تھا اور بعد میں، جب وہ بچی ہی

تھی، تو اسکندریہ کی کسی خاتون نے گھریلو کام کاج کے لیے ملازم رکھ لیا تھا، ذرا سی غلطی یا بھول چوک پر اپنی بانہوں یا سینے پر آگ میں تپائے ہوئے کفگیر کے داغ سہنے کی عادی ہوگئی تھی: ہدیٰ، جس کے چہرے پر اولین دکھوں نے وہ تاثر چھوڑا تھا جس کے باعث وہ لذت کی گرم خیزی میں کسی آوارہ کتے کی طرح نظر آتی جو بے صبری اور غیر یقینی سے کسی اچانک مل جانے والے لقمے کو ہڑپ کر رہا ہو— یہی وہ ہدیٰ تھی جس کی قسمت میں ہم سب پر — مجھ پر، والدہ پر، اور نانی پر — راج کرنا اور ہمارے ارادے کو اپنی انگلیوں کی گرفت میں لے کر نچوڑ ڈالنا لکھا تھا۔ بعض اوقات (جفتی اور اپنی شہوت کی تسکین کے بعد) میں اس پر گرم بھی ہو جاتا، برس پڑتا اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا، جیسا کہ مالک اپنی خادماؤں سے کیا کرتے ہیں۔ اُس وقت وہ صرف ایک نگاہ ہی سے میرا سارا غصہ ٹھنڈا کر دیتی اور میں نرمی سے اسے اس کی غلطی سے آگاہ کر دیتا۔ اس کی وہ نگاہ مجھ سے کہہ رہی ہوتی، ''بھول گئے ہو کیا؟'' کبھی کبھی وہ پورے ہفتے، یا دو ہفتے مجھے اپنے غیظ وغضب پر نادم ہونے دیتی: میں اسے کمرے میں بلاتا تو آکر دروازہ بند کر دیتی اور وہیں کھڑی ہو جاتی، اور جب میں کارروائی شروع کرنا چاہتا تو مجھے بڑے عزم سے دھکا دے کر پرے کر دیتی اور بڑا قاتل، پرسکون قدم اٹھا کر چلی جاتی، جو میری شہوت کو اور بھڑکا دیتا۔ ایک بار اس کا انکار مہینے سے زیادہ تک قائم رہا اور میں باقاعدہ اس کی منت سماجت کرنے لگ گیا — اُس کی منت سماجت! وہ دیر تک مجھے دیکھتی رہی تاکہ آخری بار مجھ پر اپنی ظفرمندی پکی ہو جائے، اور پھر اپنا جسم میرے حوالے کر دیا۔ رات کے وقت والدہ غسلخانے جانے کے لیے ہدیٰ کو پکارتیں؛ یہ ایک رات کے عرصے میں دو تین بار ہوتا۔ کبھی ہدیٰ یوں ظاہر کرتی جیسے سو رہی ہے اور اسے سنائی نہیں دے رہا، اور والدہ مسلسل پکارتی رہتیں، پیشاب دبائے اور اس کی تکلیف اٹھاتے ہوئے پکارتی رہتیں، اور آخر میں جب وہ رونے اور گڑگڑانے لگتیں تو ہدیٰ کسی دیوی کی طرح بڑے آرام آرام سے اپنی استراحت سے اٹھتی اور والدہ کو غسلخانے لے جاتی۔ اپنے آنسوؤں کے باوجود والدہ کی یہ مجال نہیں تھی کہ اسے قصوروار ٹھہرائیں۔ اس کے برخلاف، وہ تو ہاتھ بھر بھر کر دعاؤں سے اس کی پذیرائی کرتیں۔ اب باقی بچیں میری نانی۔ ہدیٰ انھیں سب کے سامنے ڈانٹ ڈپٹ کرتی، جس میں والدہ بھی شریک ہو جاتیں۔ نانی اسّی کو پہنچ رہی تھیں، سو اب کسی کو ان سے محبت نہیں رہی تھی، کیونکہ مہر وعنایت کے جذبات کا بھی متعین عرصۂ حیات ہوتا ہے جس کے بعد یہ بھی

مرجھا کر ماند پڑ جاتے ہیں اور متوقع عمر کے بعد بھی زندہ رہے چلے جانا خواہ مخواہ لوگوں کو جز بز کر دیتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تیس چالیس قبل والدہ اور عباس ماموں نانی سے بہت محبت کرتے ہوں گے، اور اپنے علی الرغم ان کے یومِ مرگ کا سوچتے ہوں گے، اور یہ کہ وہ کس طرح برسوں تک ان کا سوگ منائیں گے۔ لیکن اس غمزدہ دن کے آنے میں تاخیر ہو گئی تھی، یہاں تک وہ خود اپنے اختتام کے قدموں کی چاپ سن سکتے تھے، اور نانی ابھی تک اپنی جگہ پر جمی ہوئی تھیں اور موت انھیں ہلانے سے عاجز تھی۔

سو اس تکلیف دہ حقیقت کا رد انھوں نے یہ نکالا تھا کہ اس سے تجاہل برتا جائے۔ یہ تجاہل وہ سزا تھی جو وہ نانی کو ہنوز اپنا مورچہ سنبھالے رکھنے پر دے رہے تھے۔ عباس ماموں دیر دیر تک والدہ کے پاس بیٹھے رہتے، باتیں کرتے، ہنستے ہنساتے اور چائے پیتے، لیکن اُسی کمرے میں لیٹی ہوئی نانی کی طرف ایک بار بھی ملتفت نہ ہوتے۔ انھوں نے نانی کی موجودگی کا احساس یکسر محو کر دیا تھا، اور باتوں اور ہنسی کے درمیان نانی وہیں اپنے بستر پر پڑی پڑی خاموشی سے اپنے مڑے تڑے چشمے اور اپنی بڑھاپے سے سفیدائی ہوئی آنکھوں سے چھت کو گھورتی رہتیں۔ وہ وہاں گھنٹوں پڑی رہتیں، پھر اچانک کچھ کر بیٹھتیں، جیسے حاضرین سے کوئی سوال جسے ان کے ضعفِ ارتکاز اور منتشر ذہنی پر محمول کیا جا سکتا ہو۔ گرمیوں کا جلتا ہوا حصہ ہی کیوں نہ ہو، وہ والدہ سے کمبل اڑھانے کو کہتیں، کیونکہ انھیں سردی لگ رہی ہوتی۔ کبھی وہ عباس ماموں سے اس طرح مخاطب ہوتیں جیسے وہ بدئی ہوں، اور بعض اوقات بستر سے نکلنے کی کوشش کرتیں اور ناکام رہتیں، لیکن کوشش کیے جاتیں یہاں تک کہ گر پڑنے کو ہوتیں۔ پھر کسی نہ کسی کو لپک کر مدد کرنی پڑتی، جس سے سالخوردہ نانی کا مقصد صرف خوف وہراس پھیلانا اور اس فضا کو برباد کرنا ہوتا جو ان کے بغیر قائم کی گئی تھی، حاضرین کی یاددہانی کراتا کہ وہ عمر رسیدہ اور ناتواں ہیں، اور اس دیکھ بھال کی محتاج جو اس لیے نہیں دی جا رہی کہ یہ لوگ اپنی ذمے داری سے جان چرا رہے ہیں۔ چند ماہ پہلے نانی نے اپنے کپڑوں میں پیشاب کرنا شروع کر دیا تھا، اور ماموں اس نئی مصیبت کے تدارک کے لیے ایک ڈاکٹر لے آئے تھے۔ معائنہ کر کے ڈاکٹر باہر آیا، اور میں اس کے چہرے سے اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بولا، ''بڑھاپے کا مرض ہے، اس کا کوئی علاج نہیں۔'' پھر ایک دوا لکھ دی جس کے سات قطرے ہر رات ڈراپر سے ٹپکانے

Scanned with CamScanner

تھے۔ ہدیٰ کے دوا پلاتے وقت والدہ چلا کر بڑی سختی سے اس سے کہتیں، ”سات مت ڈالنا، دس یا بارہ دینا۔ کسی نہ کسی طرح اس کی غلاظت بند کرواؤ!“

جن وقتوں میں نانی خود کو بھگو تیں ان کا انتخاب بڑی ہوشیاری سے کیا جاتا تھا — یعنی جب ملاقاتی آئے ہوئے ہوں، خواہ یہ اقربا ہوں یا اجنبی۔ ٹھیک جب گفتگو میں لطف آنے لگا ہو اور ملاقاتی اپنی نشستوں پر اطمینان سے پسر گئے ہوں، نانی اچانک پیشاب کر دیتیں، اور ماحول میں بے آرامی اور انقباض در آتا۔ ایک بار نادیہ نام کی ہماری ایک نوجوان رشتے دار ملنے آئی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ نانی اٹھیں اور دھیمے قدموں سے کمرے کے بیچ میں پہنچ کر کھڑی ہو گئیں، ان کے خد و خال پر سکون چھایا ہوا تھا، پھر کسی مجرم بچے کی طرح سر جھکا لیا، اس حال میں کہ پیشاب نیچے گر رہا تھا، ان کے کپڑے تر بتر کر دیے اور فرش پر بھی بہنے لگا۔

جب نادیہ نے یہ ماجرا دیکھا، تو ایک لمحے یوں تکتی رہی جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو، اور پھر بری طرح رونے لگی، اور والدہ اور ہدیٰ کا عتاب نانی پر نازل ہوا۔ دونوں کی چیخیں خلط ملط ہو گئیں، تاہم والدہ کی آواز زیادہ بلند تھی اور وہ یہ کہتی ہوئی سنی جا سکتی تھی، ”بڑھیا، شرم کر! ہم صبح سے تجھے غسلخانے جانے کے لیے کہہ رہے تھے۔“

والدہ، جنھیں سرطان لاحق تھا، زردی کھنڈی ہوئی تھی اور موت سے دہشت زدہ تھیں، اور بوڑھی نانی کے درمیان بڑی تلخ عداوت تھی جو بنفسہٖ گہری محبت اور بے کراں غم کی دلیل ہو سکتی تھی — دو ایسے افراد کے درمیان جو مدت سے کسی تنگ کوٹھڑی میں محبوس ہوں اور کبھی رہا ہونے کی امید کھو چکے ہوں، دانت اور پنجے کا سا شدید مگر لاطائل تنازع۔ جب والدہ نانی پر مغلظات اور کوسنے برساتیں تو مجھے لگتا کہ نانی کے پرسکون چہرے پر ایک موہوم سی لرزش دوڑ گئی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی اہانت پر پیچ و تاب کھاتی تھیں لیکن انھیں والدہ کی بے رحمی کا استادی سے بدلہ لینا بھی آتا تھا۔ ایک دفعہ دونوں گھر میں تنہا تھیں اور نانی نے موقعے سے فائدہ اٹھایا۔ اُس وقت تک والدہ کے سر کے بال سرطان کی دواؤں کے باعث گر چکے تھے اور وہ اپنے گنجے سر کو رومال سے ڈھانپے رہتی تھیں، جو آسانی سے ڈھلک جاتا اور ان کی چکنی سیاہ چندیا اور اس کی جھڑتی ہوئی جلد کو ظاہر کر دیتا۔ نانی بغیر کسی کے سہارے بستر سے نکلیں اور صاف سنائی دینے والے دھیمے اور بھاری قدموں سے والدہ کے

Scanned with CamScanner

کمرے کی طرف جانے والی راہداری عبور کی۔ جب کمرے میں داخل ہوئیں، والدہ ان پر چلائیں،
''کیا چاہتی ہو؟''

نانی نے جواب نہیں دیا اور والدہ کے قریب آئیں۔ ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جو کسی بچے کے چہرے پر اس وقت ہوتی ہے جب وہ لطف اور خطرے کے ملے جلے احساس کے ساتھ کسی کھلونے کی طرف بڑھ رہا ہو۔ وہ اور قریب ہوئیں یہاں تک کہ پسری ہوئی والدہ کے برابر آ گئیں، ان کی دم بدم بلند ہوتی ہوئی چیخ و پکار سے لاپروا، ان پر جھکیں، ہاتھ بڑھایا اور جھپٹا مار کر سر سے رومال کھینچ لیا اور اسے برہنہ کر دیا۔ پھر والدہ کی طرف دیکھا اور بڑے صاف وشفاف لہجے میں کہا،
''یا اللہ! بال کہاں چمپت ہو گئے!''

جب کچھ لمحات کے بعد میں والدہ کے پاس آیا تو آنسو جاری تھے اور وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھیں، ''اب تک کیوں زندہ ہو؟ مر کیوں نہیں جاتیں؟ مر جاؤ کہ ہمیں آرام ملے!''

میں نے نانی کو انھیں بھاری قدموں کے ساتھ، طوفان کو پیچھے چھوڑ کر، کمرے سے نکلتے دیکھا، اور ٹھیک اسی لمحے مجھے ان کے سالخوردہ چہرے پر تسکین اور راحت کے آثار نظر آئے۔

9

میں قریب آیا ہوں اور میں نے دیکھا ہے —— اور نہ میں نادم ہوں اور نہ خوش۔ آئینے میں اپنے خدوخال بغور دیکھتے ہوئے آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ اپنے چہرے کی تفصیلوں کو پہلی بار قریب سے دیکھنے پر ایک خاص سی حیرت۔ لیکن آپ کے نقوش —— ناک، آنکھیں، ابرو، اور منہ —— آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ آپ کا چہرہ دوسروں کے چہروں سے مختلف ہے۔

اب میں بھی اپنے بارے میں یہی سب محسوس کرتا ہوں۔ صداقت میری گرفت میں آ گئی ہے۔ میں نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور اس نے مجھ پر اکیلے پن کا حکم لگا دیا ہے۔ عزلت میرا مقدر بن چکی ہے کیونکہ میں سمجھ گیا ہوں۔ تنہائی کو حاصل کرنا اتنا آسان نہیں، اور نہ یہ سرعت سے ہاتھ آتی ہے۔ میں نے اس کے لیے بڑی سخت جدوجہد کی ہے۔ بالآخر کامیاب ہونے سے پہلے میں نے متعدد کوششیں کیں اور ناکام رہا۔ ایک ٹھوس لیکن شفاف دیوار، جو صرف دیکھنے ہی کی اجازت دیتی

Scanned with CamScanner

ہے، چھن گئی ہے، اور میں اپنی حدود میں سمٹ سمٹا گیا ہوں۔ مجھے سائنس داں کا وہ ٹھہراؤ اور سکون حاصل ہے جس سے وہ نلکیوں میں مختلف محلول ملاتا ہے اور ان کے رد عمل کو اپنی چھوٹی سی کتبیا میں درستی اور معروضیت سے درج کرنے کا انتظار کرتا ہے۔

اب نہ میں کسی چیز کی موافقت میں ہوں نہ مخالفت میں —— بالکل تنہا ہوں، اور یہ تنہائی مجھے اطمینان اور راحت پہنچاتی ہے۔ مجھے اب اپنی برتری ثابت کرنے کی پروا نہیں رہی، نہ دوسروں کو ان کی کمتری کا احساس دلانے ہی کی۔ جھگڑوں اور مشکلوں کے ایام گزر گئے ہیں۔ میں ہر صبح بیدار ہوتا ہوں، کتابیں اٹھاتا ہوں، شعبے پہنچتا ہوں، اور دن یوں گزارتا ہوں جیسے اپنے ذاتی دفتر میں ہوں۔ مطالعے کی فہرست تیار کرتا ہوں اور پھر اسی حساب سے پڑھتا ہوں۔ شروعات اخبار بینی سے ہوتی ہے، پھر کوئی رسالہ وسالہ، اس کے بعد نطشے (Nietzsche) یا اسپنگلر کا ایک باب۔ دن کا اختتام شیکسپیئر یا کسی عربی ناول پر ہوتا ہے۔ ادارے کے کارکن شاذونادر ہی مجھ سے بات کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سعید سے میری چپقلش کے بعد وہ مجھے کوئی خاص مخلوق سمجھنے لگے ہیں اور میرے ساتھ تعامل سے ہچکچاتے ہیں کہ اگر کبھی ہوا تو یہ انھیں غوروفکر کی اجنبی اور تکلیف دہ راہوں پر ڈال دے گا۔ بعد ازاں میری نسبت سے انھوں نے ایک خاموش اجتماعی فیصلہ کر لیا ہے —— کہ مجھے میرے تاریک اور مبہم گوشے میں میرے حال پر چھوڑ اپنی بندھی ٹکی گذشتہ زندگی کی طرف لوٹ جائیں جس کے ہمیشہ سے عادی رہے ہیں۔ انھیں میرا خیال کبھی کبھار اس وقت آ جاتا ہے جب شعبے کی کسی زنانہ ہمکار نے بچہ جنا ہوتا ہے یا کوئی مرد ہمکار شادی کرتا ہے اور وہ اسے تحفہ دینے کے لیے پیسے جمع کر رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت وہ چپراسی عبد العلیم کو میرے پاس بھیجتے ہیں، جو اب مجھ سے بڑے ادب کے ساتھ بات کرنے لگا ہے۔ کبھی کبھی اسے دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے چہرے پر موہوم سی لرزش آ گئی ہے اور وہ کسی بھی لمحے میرے پھٹ پڑنے اور اس پر کچھ پھینکنے کا متوقع ہے۔ میں اس خیال پر اپنی مسکراہٹ کو دبا لیتا ہوں اور مطلوبہ رقم اس کے حوالے کر دیتا ہوں اور دوبارہ مطالعہ کرنے لگتا ہوں۔ عزلت میرے لیے نعمت ہے، اور میں شدومد سے اس کا تحفظ کرتا ہوں۔ رات پڑنے پر میں والد کے اسٹوڈیو میں آ کر دروازہ بند کر کے اکیلا بیٹھ جاتا ہوں۔

بعض اوقات میں کئی کئی دن والدہ کو دیکھے بغیر گزار دیتا ہوں اور اس سے لاپروا رہتا ہوں کہ

Scanned with CamScanner

گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ ہدیٰ کی خواہش بھی مجھے بس کبھار کبھار ہی ہوتی ہے؛ شہوت بھی اب اس زندگی کا حصہ ہے جس سے میں کنارہ کش ہو گیا ہوں۔ میں نے والد کے اسٹوڈیو میں اپنی ایک الگ تھلگ، انصاف پسند اور خوشنما، دنیا بنالی ہے جس میں ہر رات پناہ لیتا ہوں، کسی خوفزدہ بچے کی طرح جو ماں کی آغوش میں امان لے رہا ہو، بڑے اشتیاق سے اس کی اطمینان بخش شگندھ میں سانس لے رہا ہو، شکایت کرر ہا ہو اور رو رہا ہو، یہاں تک کہ پرسکون اور مطمئن ہو کر سو جاتا ہو—— پنکھڑیوں میں لپٹے ہوئے گلاب کی طرح میری حشیش کے غبار میں ملفوف حسین وجمیل دنیا۔ حشیش عادل حکمراں ہے؛ ہر فرد کو وہی دیتا ہے جس کا وہ مستحق ہے اور ہر حقدار کو اس کا حق۔ سادہ طبیعت والوں کو خندہ آور بہجت، اور رہا مفکر جس کی سچائی سے محبت سلطانِ حشیش پر عیاں ہوتی ہے، تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب لاتا ہے اور اسرار سربستہ اس پر منکشف کرتا ہے۔ جب حشیش کے تلخ وتند ذائقے سے میرا گلا جل اٹھتا ہے اور اس کا اثر پھیلنے لگتا ہے، تو میں نئے آفاق کے ماورا گھومتا پھرتا اور علم حاصل کرتا ہوں۔ صداقت واحد اور ازلی ہے، جس سے مختلف اور منتشر اشکال پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسے نازک تاروں سے مربوط ہوتی ہیں جو دور سے دیکھنے پر نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ میں ہیملٹ، علی بن ابی طالب، سقراط، ایوا پیرون، جہان سادات، عائشہ بنت ابی بکر، قدیم روم، بغداد، اور نیویارک کے بارے میں پڑھتا ہوں۔ جو چاہو پڑھ لو، قریب آؤ اور غور سے دیکھو، اور چیزوں کو ایک دوسرے سے منسلک کرنے والے تار عیاں ہو جائیں گے اور حیرت انگیز وحدت کی حقیقت تم پر کھل جائے گی۔ گاہے بگاہے میں والدہ کے ساتھ ناشتہ کرتا ہوں۔ میں انھیں چار چمچے شہد، پھر ایک پیالی دودھ، اور رکابی بھر انڈے، گویا حیوانی حرص کے ساتھ، ہڑپ کرتے دیکھتا ہوں۔ وہ مجھ سے تشخیص میں ڈاکٹروں کی غلطیوں کی گفتگو کرتی ہیں، اور دعوے سے کہتی ہیں کہ ہمارے آباواجداد جانتے بھی نہیں تھے کہ مرض کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہ خود کو چاق و چوبند محسوس کرتے تھے۔ عاجزی سے مسکرا کر کہتی ہیں، ''عصام، جانتے ہو، میں ڈاکٹر کے کہے ہوئے ایک لفظ کا بھی یقین نہیں کرتی! مجھے سرطان ورطان نہیں ہے اور میں اس کتے کے بچے کو دفن ہوتا دیکھنے کو زندہ رہوں گی۔''

پھر وہ خوب زور سے ہنستیں اور پپوٹوں کے پیچھے سے مجھے دیکھتیں۔ مجھے محسوس ہوتا کہ اگر ان سے اختلاف کیا یا غمگین نظر آیا، حتیٰ کہ ہمدردی سے مسکرایا بھی، تو وہ مہین تار بھی کٹ جائے گا جو

Scanned with CamScanner

انھیں ایک موہوم سی امید سے ابھی تک مربوط کیے ہوئے ہے۔ میں خاموشی سے انھیں ہنستا ہوا دیکھتا ہوں اور جلی حروف میں اپنے دماغ میں درج کرتا ہوں، ''زندگی کے لیے ہماری ذلیل حرص واقعی قابلِ نفرین چیز ہے۔'' مستعد اور پُر نشاط کارکن کا تصور کیجیے جو اپنے کام سے محبت کرتا ہے۔ اسے سو پاؤنڈ تنخواہ ملتی ہے۔ اس نے کسی دن بھی اپنے کام سے غفلت نہیں برتی ہے اور ادنیٰ سی کوتاہی کا بھی مرتکب نہیں ہوا ہے۔ لیکن ایک صبح وہ یہ دیکھ کر چونک جاتا ہے کہ اس کے باس نے اس کی تنخواہ گھٹا کر دس پاؤنڈ کردی ہے، جس کی وجہ باس کی خواہش کے سوا اور کچھ نہیں۔ ایسے کارکن کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جو اس کے بعد بھی نوکری چھوڑ کر نہیں چلا جاتا؟ اگر وہ دس پاؤنڈ کے عوض کام جاری رکھتا ہے اور باس کے سامنے اپنے راضی اور مطمئن ہونے کا اظہار کرتا ہے تو کیا وہ نفرت انگیز نہیں ہے؟

اگر والدہ رومال ہٹا کر آئینے کے سامنے اپنے سر اور لٹکے ہوئے مضمحل چہرے پر نظر ڈالیں اور پھر سامنے اپنی کوئی پرانی تصویر رکھ کر دیکھیں جب ان کے بال حسین اور کڑھے ہوئے اور مسکراہٹ کھلتی ہوئی ہوا کرتی تھی، ان کی مسرت کے دن — اگر کبھی والدہ ان دو پیکروں کا مقابلہ کرکے پوچھیں، کیوں؟ تو کیا وہ انکار اور احتجاج نہیں کریں گی؟ ان کی ناتوانی کوئی عذر نہیں، کیونکہ وہ اس کے باوجود اس ظالم اور باؤلی ناانصافی کا خاتمہ کردینے پر ہمیشہ قادر ہیں۔ رتی بھر دلیری — بس رتی بھر، اور کارکن کم تنخواہ پر کام کرنے سے انکار کردیتا ہے۔ ہاتھی صبر سے اپنے خاتمے کا انتظار کرتا ہے۔ محمد کُریم اپنے دشمن فرانسیسیوں کو جزیہ دے کر اپنی جان بچانے سے انکار کردیتا ہے اور سکون، کرامت، اور سرخروئی کے ساتھ اپنی موت سے ہمکنار ہوجاتا ہے۔ ایتھنز کے گھامڑ باشندے سقراط کو سزائے موت سنا دیتے ہیں، اور جب موت دی جانے والی رات اس کا شاگرد افلاطون چوری چھپے، فرار کا منصوبہ لے کر، اس سے ملنے آتا ہے، تو استاد اپنے جوشیلے تلمیذ کی پوری بات سنتا ہے اور فرار ہونے سے انکار کردیتا ہے، اور جب افلاطون حیرت سے اس کا سبب پوچھتا ہے، تو سقراط حزن سے مسکرا کر جواب دیتا ہے، ''کیونکہ میں نے اس نفرت انگیز دنیا پر اپنی پیٹھ پھیر لی ہے۔''

10

خاتمہ۔ میں حجام کی کرسی میں بیٹھا تھا۔ حجام — جیسا کہ حجام عام طور پر ہوتے ہیں — غلامانہ

Scanned with CamScanner

ذہنیت کا مالک، متجسس، اور باتونی تھا۔ وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا، کیونکہ میں پورے دو سال سے اس کی دکان پر آرہا تھا لیکن وہ ابھی تک میرے بارے میں ایک بات بھی نہیں معلوم کرسکا تھا۔ صرف میرے نام کا پہلا حصہ۔ مجھ سے گفتگو کرنے کی اس نے ساری کوشش کرڈالی لیکن میں ٹس سے مس ہوکر نہ دیا۔ مایوس ہوکر اس نے کوشش ہی چھوڑ دی اور خاموشی سے میرے بال تراشنے لگ گیا۔ کبھی کبھی یہ خاموشی اس کی بساط سے باہر ہوجاتی اور وہ دوسرے گاہکوں سے باتیں کرنے لگتا۔ اس دوران میں سر نیچا کیے پڑھتا رہتا۔ اُس دن میں اپنے ساتھ کوئی کتاب لانا بھول گیا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ پڑھنا تو بہرحال تھا ہی۔ سو میں اپنے سامنے آئینے کی شیلف پر رکھے رسالوں کی طرف متوجہ ہوا جو فرانسیسی رسالے L'Art Decor (فن آرائش) کے پرانے شمارے تھے۔ مجھے آرائش سے کوئی دلچسپی نہیں، پھر بھی میں نے ایک شمارہ اٹھا کر اس موضوع سے متعلق بعض مضامین کی ورق گردانی شروع کردی۔ مختلف طرز کے ساز و سامان کی بے شمار تصویریں تھیں۔ میں نے تیزی سے صفحے الٹے اور اس کی جگہ ایک دوسرا شمارہ اٹھالیا۔ اس دوسرے شمارے کے پہلے صفحے پر وہ مجھے نظر آئی — ایک تصویر جس پر میری نظر ٹھہر گئی اور جو مجھے اتنی زیادہ پسند آئی کہ ابھی تک بالکل صاف یاد ہے۔ یہ جدید طرز کی خوابگاہ کی تصویر تھی — فرش سے قریب کشادہ، نیچا سا پلنگ، جو سیاہ ریشمی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیوار پر ایک بڑی تصویر آویزاں تھی جس میں ایک مضبوط لمبی چوڑی ناک بنی ہوئی تھی اور سفید اور سیاہ کے درمیانی رنگ کی متعدد ایک دوسرے میں گھستی ہوئی پرچھائیوں سے گھری ہوئی تھی۔ کمرے کا پورا فرش سفید سمور سے ڈھکا ہوا تھا اور سفیدی اور سیاہی کا یہ تداخل بڑا شاندار لگ رہا تھا۔ میں تصویر کو انہماک سے دیکھتا رہا اور ایک حسین اور حیرت انگیز احساس مجھ میں رسنے لگا اور دیکھتے دیکھتے غلبہ آور چاہت میں تبدیل ہوگیا۔ تصویر میں جو حسن تھا اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مجھے کئی منٹ لگ گئے۔ میں نے ورق پلٹ کر کسی دوسری تصویر کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن ایسا نہ کرسکا؛ ایک ہی لمحہ گزرنے پر میں پھر پہلی والی تصویر کی طرف لوٹ آتا۔ حجامت بنوانے کے بعد پیسے دیتے ہوئے میں نے پوچھا، ''کیا میں یہ رسالہ لے سکتا ہوں؟''

وہ فوراً اور بخوشی راضی ہوگیا، کیونکہ اس سے اسے میری زندگی میں مخل ہونے کا موقع مل رہا تھا، پھر فرانسیسی آرائش اور نفاست پر تقریر جھاڑنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں لگی ہوگی کہ پوچھنے لگا،

Scanned with CamScanner

"جناب، کیا نئے مکان کے لیے یہ رسالہ درکار ہے؟ ہزار بار مبارکباد، عصام صاحب!"

میں نے حجام سے اپنی جان چھڑائی، رسالہ بغل میں دبایا اور گھر کے لیے ٹیکسی لی۔ میں ہانپ رہا تھا، جیسے ایک نوعمر، جیب میں ننگی عورت کی تصویر رکھے، اپنے کمرے کی طرف لپکتا ہے، دروازہ مقفل کرتا ہے، اور خواہش سے لرزتے ہوئے تصویر نکالتا ہے، اور پھر گھنٹوں تک ایسی لذت میں گم ہو جاتا ہے جیسے یہ جیتی جاگتی عورت ہو۔ میں نے ساری رات حشیش پیتے اور تصویر کو تکتے ہوئے گزار دی۔ اس کا ہر جز میرے اندر ایک مختلف احساسِ حسن کو جنم دے رہا تھا — تصویر کے وسط میں ناک، شکن آلود پلنگ پوش، سفید براق فرش۔ میں اس حسن کو اس وقت تک پیتا رہا جب تک پیاس بجھ نہ گئی، اور جب سونے کے لیے لیٹا تو اس وقت سپیدۂ سحر کھڑکی کی درزوں سے چھن کر آ رہا تھا، اور میں جانتا تھا کہ میرے لیے ایک بے بہا اور حیرت انگیز تجربے کی ابتدا ہو رہی ہے۔

اگلے دن شعبے سے نکلنے پر میں گھر نہیں لوٹا، بلکہ سلیمان پاشا چوک میں اخباروں کی بڑی دکان گیا۔ دکاندار مسکرایا، جس سے اس کے سونے کے دانت نظر آنے لگے، اور ایک کونے کی طرف اشارہ کر کے بولا: "نئے غیر ملکی جریدے دائیں طرف ہیں اور بائیں طرف پرانے، چوتھائی قیمت پر۔"

میں نے پرانے رسالوں پر توجہ نہ دی: گرد آلود یا گھسے پٹے غیر ملکی رسالوں کے تصور ہی سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ میں دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ رسالوں کے صفحے الٹ کر دیکھے اور مقابلہ کیا اور انجامِ کار دو رسالے خرید کر روانہ ہو گیا — ایک فرانسیسی (حالانکہ مجھے فرانسیسی نہیں آتی تھی)، دوسرا امریکی۔

11

یہ رات بھی میں نے گذشتہ شب کی طرح ہی بتائی — سکوت، حشیش، تصویریں اور خواب۔ امریکی رسالے میں ایک سیاسی مضمون پڑھنے کی کوشش کی لیکن اکتا گیا اور بند کر دیا۔ یہ تصویریں ہی تھیں جن میں مجھے کشش محسوس ہوتی تھی۔ تصویروں میں ہر شے شاندار دکھائی دیتی؛ حتیٰ کہ چھوٹی سے چھوٹی تصویر بھی ایک دبی دبی سی رونق کی حامل تھی۔ سرخوشی سے مملو، متنوع اور چہچہاتی ہوئی زندگی۔ سڑکیں اور عمارتیں اور لوگ، حتیٰ کہ بارش اور برف اور پانیوں کے کنارے۔ اپنی تصویروں کے

Scanned with CamScanner

سامنے استادہ لمبی ڈاڑھیوں والے فنکار، اپنے سازوں اور موسیقی کے اوراق کے سامنے بیٹھے ہوئے سیاہ پوشاک موسیقار۔ اور تو اور، مظاہرے بھی بڑے شاندار تھے — وسیع وعریض اور صاف ستھرے چوکوں میں مارچ کرتے ہوئے سینکڑوں لوگ، سفید چہرہ اور زرّیں بال، احتجاجی جھنڈے اٹھائے خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے؛ ان کے اردگرد پھیلے اور ان کی حفاظت کرتے ہوئے شاندار وردیوں میں ملبوس، بلّے لگائے، مضبوط جسم والے پولیس کے سپاہی۔ کبھی کوئی سیاستداں مظاہرین سے مخاطب ہو رہا ہوتا، اس صورت میں وہ باوقار اور عام طور پر سونے یا چاندی کے فریم والا بڑا نفیس چشمہ لگائے ہوتا۔ میں نے دونوں رسالے ختم کیے اور اگلے دن چند اور خرید لایا، اور بعد میں چند اور۔ میں دن بدن مکمل طور پر ان کے سحر میں آتا جا رہا تھا۔ میں حد سے باہر نکل گیا تھا، اور اگرچہ میں اپنی یومیہ خریداری سے بڑا خوش تھا، میں نے ایک سے زائد بار رسالہ فروش کو دیکھا کہ مجھے شک اور تشویش کے ساتھ رسالوں کی ورق گردانی کرتے دیکھ رہا ہے۔ لگتا تھا کہ یہ اس کی توجہ میں آ گیا ہے کہ میں صرف تصویریں دیکھتا ہوں، اسی لیے وہ ایک دن میرے پاس آیا اور بولا، ''اندر ہمارے پاس ایک پوسٹر ہے جو آپ کو پسند آئے گا۔ دیکھیں گے؟''

میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا پوسٹر ہے، لیکن جب میں اس کے پیچھے پیچھے اندر آیا تو پتا چلا کہ یہ ایک بہت بڑی رنگین تصویر ہے جو پوری دیوار کو محیط ہے۔ میں نے پیسے گنے تو کافی نہیں تھے۔ میں نے خریدا نہیں، لیکن گھر آ کر کچھ رقم والدہ سے قرض لی، واپس گیا اور چار بڑے پوسٹر اٹھائے لوٹا۔ انھیں میرے کمرے کی چاروں دیواروں پر لگانے میں ہدیٰ نے میری مدد کی۔ ان کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے واسطے مجھے والد کی تمام تصویروں کو کونے میں ڈھیر کرنا پڑا، اور مجھے اس پر کوئی افسوس یا ندامت محسوس نہیں ہوئی۔ اب میرا تاریک کمرہ بہجت سے جگمگانے لگا۔ بستر پر لیٹے لیٹے میں دیوار پر ڈھلواں چھت والے ایک مضافاتی گھر کو دیکھ سکتا تھا جس کے چاروں طرف ایک باغ پھیلا ہوا تھا اور سفید، پتلی چوبی پٹیوں کی باڑ احاطہ کیے ہوئے تھی اور دور فاصلے میں اونچے اونچے سایبان کے درختوں کا گھنا جنگل تھا۔ سردیاں تھیں: زمین برف پوش تھی اور درختوں اور چھت پر برف کے ننھے ننھے نازک گالے پڑے ہوئے تھے۔

مجھے کیا ہو رہا تھا؟ میں کوئی نوخیز لڑکا نہیں تھا۔ پینتیس سال کا تھا۔ ناگہانی جوش وولولے اور

Scanned with CamScanner

تپتے جذبات کے دن لد چکے تھے۔ غیر ملکی تصویروں سے میری لگاوٹ کسی تصور سے وابستہ تھی جسے الگ کر کے دیکھنا اور سمجھنا میرے لیے ازبس ضروری تھا۔ ایک کرسی یا پلنگ کی تصویر میں آخر وہ کیا بات تھی جو میرے روم روم میں یہ سرخوشی دوڑا رہی تھی؟ کیا یہ دیوانگی تھی؟ جنونیوں کی یقیناً اپنی منطق ہوتی ہوگی، لیکن ہم اس سے واقف نہیں ہوتے، کیونکہ جس لمحے وہ ہم سے مختلف رویہ اختیار کرتے ہیں، ان سے ہمارا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔ کیا دیوانگی بھی ایسی ہی طوفانی خواہش ہے جس نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا؟ میں نے مسلسل راتوں تک اپنا دماغ چھان مارا یہاں تک کہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا، جو یکبارگی اور مکمل وضاحت سے سامنے آیا۔ یہ تصویریں نہیں تھیں جن کا میں شیدائی تھا، بلکہ میری شیفتگی ان احساسات سے تھی جو یہ مجھ میں جگاتی تھیں۔ شادیوں اور تہواروں پر مصر کی دہقانی عورتیں بڑے بھڑک دار اور متصادم رنگوں کے آرائشی کپڑے پہنتی ہیں، ہاتھوں اور پیروں پر مہندی لگاتی ہیں، پھر گاڑی کرائے پر لیتی ہیں، جسے اندھیری چڑھا گدھا کھینچ رہا ہوتا ہے، اور سارا دن گاڑی پر تالیاں بجاتے، غوغو کرتے اور گانے گاتے ہوئے گزار دیتی ہیں۔ گاڑی پر چڑھی عورتوں کا منظر مجھ میں ایک مخصوص ''مصری'' احساس ابھارتا ہے — ٹھیک اسی طرح برف سے ڈھکے گنجان بن یا منہ میں پائپ دبائے ڈاڑھی والے فنکار کی تصویر ''مغربی'' احساس کو جنم دیتی ہے۔ یہ ان تصویروں کی روحِ مغرب تھی جس نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ ٹھیک یہی بات تھی — مغرب کی روح ہمیں گھیرے ہوئے ہے، یہ ہمیں ہر چیز میں نظر آتی ہے، لیکن ہم شاذ و نادر ہی اسے اس کے مظاہر سے جدا کر کے دیکھتے ہیں۔ ہماری جس چیز میں نفاست پائی جاتی ہے ناگزیر طور پر مغرب کی دین ہے! مثالیں؟ معالج کا سفید ایپرن، سائنسی حتیٰ کہ گھریلو آلات، فلمی ستارے کے گلے کی ٹائی، ایک پرتعیش، حالیہ ماڈل کی کار — ہر چیز۔ ہماری ہر پسندیدہ چیز کا مرجع وہی ہیں۔

جب میری سوچ وضاحت کی اس حد پر پہنچی تو ایک خوف نے آ لیا: جو بات سمجھ میں آئی ہے کہیں بھول نہ جاؤں، یا یہ کہ کم اہم خیالات بعد میں اس فہمیدگی کو محو نہ کر دیں۔ چنانچہ میں نے اپنی ڈیسک سے ایک بیاض نکالی اور پہلے صفحے پر لکھا، ''مجھے ابھی ابھی یہ ادراک ہوا ہے کہ میں روحِ مغرب کا اسیر ہو گیا ہوں، کیونکہ مجھے جتنا زیادہ ہمارے ناکارہ ہونے کا یقین ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی زیادہ مجھے اُن کی روح حیرت انگیز امکانات سے چھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔''

12

میری گرویدگی کا معما حل ہوتے ہی ان تصویروں سے میری فریفتگی بھی لامحالہ سرد پڑنے لگی۔ تصویریں تو محض ''محبوب'' تک پہنچنے کا ایک وسیلہ تھیں، اسے قریب تر لانے کے لیے بہت سے دوسرے اور وسیلے بھی تھے۔ اس روح کو تصویروں میں تلاش کرنے کے بجائے اسے اپنے میں کیوں نہ اتار لوں — اس کا تجربہ کروں، اس میں سانس لوں، اسے چھو کر دیکھوں؟ میں اُن کے ملکوں کا سفر کروں گا، ان کے سورج، ان کی برف، ان کی عمارتوں، ان کے چہروں کا۔ اور اگر میں سفر کے نا قابل ہوا تو یہیں مصر میں انھیں کھوجوں گا۔ وہ یہاں آتے ہیں اور سڑکوں پر گھومتے ہیں۔ پہلے یہ مجھے بہت نظر آتے تھے لیکن میں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ یہ عجیب بات ہے کہ حسن درجنوں بار نظر آئے اور آپ اس سے اثر لیے بغیر گزر جائیں؛ پھر ایک دن کسی الہامی لمحے میں یہ آپ پر منکشف ہو، اور آپ کا جسم بے خودی کی تمازت سے لرزنے لگے۔

میں شعبے میں کئی کئی دن خالی الذہنی اور قلق کے عالم میں گزار دیتا۔ میں نہ مطالعہ کرتا نہ کسی کی طرف دیکھتا۔ میں اپنے پیاروں کا چشمِ تخیل میں نظارہ کرتا اور ان سے ملنے کی خواہش میں پھنکتا رہتا۔ گھر لوٹنے کا وقت آتے ہی میں اُن کی طرف لپکتا۔ میں ان جگہوں پر جاتا جہاں وہ پائے جاتے تھے — اہرام، مصری عجائب گھر، قلعۂ صلاح الدین۔ ہر دن کسی نئی جگہ پر ان سے مڈبھیڑ ہوتی۔ میں ظاہر کرتا کہ انھیں کی طرح اس مقام کو دیکھ رہا ہوں، جبکہ نظروں سے ان کا پیچھا کر رہا ہوتا۔ میں انھیں ندیدے پن سے ہڑپ کرتا اور ان کی ہر تفصیل ذہن میں محفوظ کر لیتا — ان کے چہرے اور جسم، ان کی ہنسی اور آوازیں۔ پھر ہر رات حشیش پیتے ہوئے لذت سے ان پر سوچ بچار کرتا۔ کبھی کبھی اپنے سے پوچھتا، ''کیا خدا نہیں جانتا کہ یہ اس کی نفیس ترین مخلوق ہیں؟ کیا انھیں ہماری ہی طرح عذاب دینے کا عزم کیے بیٹھا ہے؟ ان کی زانی عورتیں، ان کے چور اچکے، ان کے قاتل لوگ — کیا وہ ان کے حسین سفید جسموں کو بھی نارِ جہنم میں جھلسنے کی سزا دے گا؟ یہ کہاں ممکن ہے؟ خدا نے یہ درخشانی بعد میں بھسم کرنے کے لیے ہرگز پیدا نہ کی ہوگی۔''

ایک رات میں آئینے کے سامنے اپنے کرخت بالوں اور قبیح سیاہ چہرے پر غور کرنے لگا۔ میں

Scanned with CamScanner

والدہ، والد، اور ہر شخص کے چہرے کو ذہن میں لایا جس سے میں واقف تھا۔ سخت کراہت محسوس ہوئی اور بہ سرعت بیاض میں یہ لکھنے کے لیے لپکا، ''ہم عذاب کے مستحق ہیں کیونکہ ہماری صورتیں مسخ ہیں۔''

بعض اوقات میں والدہ سے پیسے قرض لیتا اور کبھی ان کے بٹوے سے چرا لیتا۔ ان سے اپنے لیے خوش وضع نئے کپڑے خریدتا جنھیں ہر روز پہنتا، اور درآمدہ سگریٹوں کا پیکٹ، اور اُن کی طرف جاتا: کھانوں کے میلے، ثقافتی مراکز، کلاسیکی موسیقی کے جلسے — غرض جس جگہ بھی ان کے ہونے کا امکان ہوتا، جاتا، اور وقت کے ساتھ ساتھ مجھ میں عاشقوں کی سی سوجھ بوجھ پیدا ہوگئی۔ جان گیا کہ اطالوی 'پیتزا' کرارا اور پتلا ہوتا ہے اور امریکی دبیز اور بھرا اٹھنسا۔ میں ایک نگاہ ہی میں جرمنوں کی استقامت، فرانسیسیوں کی نزاکت، اطالویوں کی بشاشت، اور امریکنوں کی فطری شفافی اور سادگی میں تمیز کر لیتا تھا؛ یہ تمام دیدہ زیب تنوعات، شاندار رنگوں کی طرح، جداگانہ نظر آتے، لیکن آخر میں مدغم ہو کر روشنی بن جاتے۔ محبت اور معرفت کے اقطاب بغل گیر ہوتے اور دائرہ مکمل ہو جاتا، اور یوں مجھے اس کا اہل بنا دیتا کہ اوپر کی طرف تازہ قدم اٹھاؤں جو مجھے بے خودی میں گھل مل جانے کے اور قریب لے آئے گا۔

13

جرمن ثقافتی مرکز ایک پرشور سڑک پر واقع خوشنما چھوٹی سی عمارت ہے۔ یہاں عکسی تصویروں کی نمائش لگی ہوئی تھی۔ تصویر ساز کھڑا ناظرین کا استقبال کر رہا تھا۔ یہ بیس سے ذرا اوپر کی عمر کا نوکدار ڈاڑھی والا جرمن نوجوان تھا جس کی آنکھیں نیلگوں تھیں اور لڑکیوں جیسے لمبے بال، جنھیں اس نے ایک لٹ کی شکل میں باندھ رکھا تھا جو اس کی پیٹھ پر جھول رہی تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا، مسکرا کر خوش آمدید کہا، اور دبی سی آواز میں چند انگریزی لفظ بڑبڑا کر کہے۔ میں اندر داخل ہوا۔ ناظرین جرمن تھے اور مصری۔ جرمن جینز اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھے اور مصری خوش وضع لباس۔ قیمتی خوشبوئیں مختلط ہو رہی تھیں اور پرتعیش نئے لباس دمک رہے تھے۔ میں نے بھیڑ کے بہاؤ سے کٹ کر نمائش کو اس کے آخری سرے سے دیکھنا شروع کیا، اور تصویروں کو تنہا اپنے طور پر دیکھنے لگا۔ بعض

فوٹوگرافر کے شہر میونخ میں اتاری گئی تھیں لیکن بیشتر یہیں مصر میں۔ یہاں سیاح کو خوش کرنے والی ہر چیز موجود تھی — لیموؤں سے بھرا ٹھیلا، جھانجھ بجاتا ہوا ملیٹھی کا شربت بیچنے والا، اور ایک دوسری تصویر جس میں ایک دستار پوش شخص تربوز خرید کر پھیری والے سے کٹوا کر دیکھ رہا تھا کہ تیار ہے۔ میں الحسین چوک میں کھڑے متعدد لڑکوں کی تصویر کے سامنے ٹھہر گیا جن کے جسم گھلے ہوئے اور چہرے لاغری اور قلتِ غذا کے باعث مضمحل تھے۔ وہ تار تار جلبابوں میں، ننگے پیر، کیمرے کے سامنے کھڑے ہنس رہے تھے، اور ایک نے اپنا جلباب پنڈلیوں تک اٹھایا ہوا تھا اور پچھاڑی آگے کر کے اسے ناشائستگی سے حرکت دے رہا تھا۔

"یہ تصویر مصر کی آبرو پر حملہ ہے، ایسا نہیں؟"

آواز میرے پیچھے سے آئی۔ صاف انگریزی اور دوستانہ لہجے میں۔ میں مڑا اور اسے دیکھا۔

ایک عام سے دن کسی عام سے کام سے آپ سڑک پر جا رہے ہیں؛ کیمرے ناگہانی آپ کو آ لیتے ہیں اور راہ نورد آپ کی طرف لپک کر ہاتھ ملانے اور مبارکباد دینے لگتے ہیں، اور یہ سب اس خوشی میں کہ اُس صبح محض سب سے پہلے سڑک پار کرنے پر آپ کو بھاری انعام ملا ہے — بس اسی قسم کا تعجب مجھے اُس کو دیکھ کر ہوا۔ گہری نیلی آنکھیں، جو ایک مرتبہ نظر آئیں تو پھر آپ انھیں دیکھ کر اس طرح نہیں گزر سکتے جس طرح بیسیوں دوسرے چہروں سے۔ میں ان کی طرف کھنچا چلا گیا اور اس کا بقیہ حسین چہرہ پس منظر میں چھپ گیا۔ آنکھیں جن سے جائے فرار نہ تھی — میں نے انھیں دیکھا اور ہکلانے لگا۔ پھر اپنے تموّج کو چھپانے کے لیے میں نے گہری آواز میں کہا، "کیوں؟ اس تصویر میں مجھے تو کوئی توہین آمیز بات نظر نہیں آتی۔"

وہ قریب آئی اور اس کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس سے حسن پھوٹا پڑ رہا تھا۔ بولی، "مجھے مصر میں بہت سی ایسی خوبصورت چیزوں کا علم ہے جو برہنہ پا بچوں سے زیادہ تصویر کشی کی مستحق ہیں۔"

اب جا کر مجھے ایک چھوٹی سی ناک، بھرے بھرے گلابی ہونٹ، اور لمبے چمکدار سنہری بال، جنھیں کھلا چھوڑ دیا گیا تھا اور اس کے شانوں سے نیچے آ رہے تھے، نظر آنے لگے تھے۔ جسم بھرا بھرا اور بالغ تھا۔ اس کی شہوت انگیز، لذیذ، فراواں چھاتیوں کو تکنے سے خود کو روک کر میں نے کہا، "اگر آدمی برہنہ پا بچوں، فقیروں، اور مصری کوڑے کے انباروں کی تصویر نہ کھینچے تو پھر کس کی؟ اہراموں

Scanned with CamScanner

اور ابو الہول کی؟"

میں طنز کر رہا تھا اور میری آواز میں تلخی تھی۔ اس نے تعجب سے پوچھا، "کیا تم مصری ہو؟"

"ہاں۔ بدقسمتی سے۔"

اس کا تعجب بڑھ گیا اور اس نے کچھ نہ کہا۔ میں نے دوبارہ تصویر کی طرف رخ کر لیا، پھر اگلی تصویر کی طرف بڑھا اور کھڑے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ میرا دل دھڑکنے لگا، اور جب میں نے اس کے قدموں کی آواز اپنے پیچھے سنی تو باقاعدہ دھڑ دھڑانے لگا۔ مجھے اپنے پہلو میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا، اور دوبارہ اس کی آواز سنی، جو کہہ رہی تھی، "کیسی عجیب بات ہے کہ تم اپنے مصری ہونے پر متاسف ہو۔ میں جب ذرا سی بچی تھی، تبھی سے مصری ہونے کی آرزو کرتی تھی۔"

اس کے چہرے پر خفیف سی سرخی دوڑ گئی اور ایک خوابنا کی اس کی آنکھوں پر سے گزر گئی۔ میں ہنس پڑا اور پوچھا، "کس ملک سے آئی ہو؟"

"میں جرمن ہوں لیکن مصر کی عاشق۔ اس سے بڑی شدید محبت کرتی ہوں۔"

"تم مصر سے اسی طرح محبت کرتی ہو جس طرح سرکس کے کسی عجیب و غریب تماشے سے، یا چڑیا گھر کے کسی نایاب جانور سے۔ یقین جانو، اگر مصر میں پیدا ہوئی ہوتیں تو یہ ایک المیہ ہوتا۔"

گفتگو کا پھیلنا ناگزیر تھا۔ میری رائے پر اس نے تعجب کا اظہار کیا اور بتایا کہ دو سال سے مصر میں مقیم ہے اور اس عرصے میں بیسیوں مصریوں سے واقف ہوئی ہے لیکن اس سے پہلے کسی کو بھی یہ بات کہتے نہیں سنا۔ میں بڑے جوش کے ساتھ اپنی رائے کی تصدیق کرتا رہا اور وہ مسلسل سنے گئی۔ اس کے چہرے سے چھلکتی ہوئی حیرت اور بے یقینی نے مجھے اور زیادہ ڈھٹائی پر مائل کر دیا۔ میں نے اس سے بیان کیا کہ مصر ایک مردہ ملک ہے، اور تہذیبیں بھی کسی دوسرے وجود کی طرح ہوتی ہیں، جو طفولت، بچپن اور شباب کے مدارج سے گزر کر بوڑھا ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ بہت سی دوسری تہذیبیں بھی سینکڑوں سال پہلے مر کھپ چکی ہیں، سو اس تہذیب کے جی اٹھنے کی کوئی امید نہیں۔ میں نے کہا کہ مصریوں کی ذہنیت نوکروں اور غلاموں جیسی ہے اور صرف سونٹے کی زبان ہی سمجھتی ہے۔ پھر میں نے اسے شاعر المتنبی کا قصہ سنایا جب وہ مصر آیا تھا، اور ترجمہ کر کے وہ مصرعے سنائے جو اس طرح ہیں:

لاتشتری العبد الاو العصامعه/ان العبید لانجاس مناکید

(غلام کو سونٹے بغیر کبھی نہ خریدنا/ تحقیق کہ غلام نجس اور شاطر ہوتے ہیں!")

ہم اپنی گفتگو میں بالکل محو ہو گئے تھے اور تصویروں سے غافل۔ ہمیں وقت کے گزرنے کا خیال تک نہ آیا، اور آخر ہم نے خود کو، ہنوز گفتگو میں منہمک، باہر نکلنے کے راستے کی طرف جاتے ہوئے پایا۔ وہ ٹھہر گئی، مجھے عمیق، دوستانہ نظر سے دیکھا جو میرے دل میں اتر گئی، اور اپنی دائمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا،"سچ، میں اس پر لطف گفتگو کے لیے تمھاری شکرگزار ہوں۔ مجھے اس ملک کے بارے میں ایک ثقہ مصری کی رائے معلوم کر کے خوشی ہوئی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں تمھاری رائے سے متفق نہیں، لیکن اس کا احترام کرتی ہوں کیونکہ یہ مستند ہے۔"

پھر وہ ہنسی اور بات جاری رکھی،"دیکھو تو سہی! میں نے ابھی تک تمھارا نام بھی نہیں پوچھا۔"

جب وہ رک رک کر میرے نام کا تلفظ کرنے لگی تو میں جی بھر کے ہنسا، پھر اس کا نام پوچھا اور اس نے بتایا،"میرا نام 'یوتا' ہے۔"

اپنا نام بتاتے وقت اس کے ہونٹ اشتہا انگیز گلابی دائرے کی شکل میں وا ہوئے۔ پھر اس نے شانے اچکائے اور بولی،"بالکل جرمن نام ہے۔ تمھیں پسند آیا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور اس نے ہاتھ ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، اور الوداع کے طور پر کہا،"عصام، تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ امید کہ کسی اور وقت اس بحث کو جاری رکھنے کا موقع ملے گا۔"

پھر وہ جانے کے لیے مڑی لیکن میں نے یکبارگی آواز دے کر کہا،"اس وقت کہاں جارہی ہو؟"

"اس وقت؟"

وہ کچھ سوچتی نظر آئی، یہی کہ اس سوال کے پیچھے کیا تھا، پھر ہولے سے کہا،"کوئی خاص کام نہیں کرنا۔"

"تو پھر چلو اپنی گفتگو جاری رکھیں... کہیں اور۔ میں تمھیں دعوت دیتا ہوں۔ تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے گمبھیرتا سے دیکھا، پھر سر ہلا دیا، اور چند ثانیوں کے بعد ہم

Scanned with CamScanner

ٹیکسی میں داخل ہو رہے تھے۔ میں کچھ ہچکچایا، پھر ٹیکسی والے سے کہا، ''ہوٹل سمیر امیس۔''

14

نہ میں دلیر ہوں نہ عورتوں کے معاملے میں ماہر۔ لیکن میں نے یوتا کے ساتھ جو کیا اس کا جب کبھی خیال آتا ہے تو مجھے اپنی جرأت پر تعجب ہوتا ہے؛ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہ ساری حرکات کسی دوسرے سے سرزد ہوئی تھیں، وہ دوسرا اجری اور قادر شخص جو مجھ میں آسمایا تھا اور مجھے آگے دھکیل رہا تھا۔ میں نے مزاحمت کی، لیکن وہ میری کمزوری پر غالب آیا اور مجھے قوت بخشی۔ جب اچانک آگ لگتی ہے یا کوئی ڈوبنے کے قریب ہوتا ہے یا کوئی ناقابلِ یقین واقعہ رونما ہوتا ہے، تو وہ شخص جو عام زندگی میں بالکل غیر اہم ہوتا ہے ایک لمحے میں غیر معمولی ہستی میں منقلب ہو جاتا ہے اور بڑی استقامت سے ایسے افعال کر گزرتا ہے جو کوئی بھی تصور نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ وہ خود بھی نہیں، کہ ان کو کرنے کی سکت اس میں ہے۔ میں نے یوتا سے چلنے کے لیے کہا؟ میں نے؟ میں، وہ شکستہ روح جسے مضطرب کرنے کے لیے دربان کی ایک نگاہ ہی کافی تھی، جو کسی حسین عورت پر ایک نگاہ — صرف ایک نگاہ — ڈالنے تک کی جرأت نہیں کر سکتا تھا! ٹیکسی میں اس کے برابر بیٹھے میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے ہاتھ باندھے ہوئے تھے اور کھڑکی سے سڑک کا نظارہ کرنے کو پیچھے مڑی۔ وہ نیلی ڈینم کی جیکٹ پہنے تھی، نیچے سیاہ رنگ کی قمیص تھی جس سے سفید سینے کا بالائی حصہ اور گردن نظر آ رہی تھی، ہلکے سفید کپڑے کی چوڑی سی پتلون اور چھوٹے چھوٹے پیروں میں سادہ سے کالے جوتے۔ بال دھلے ہوئے تھے لیکن کنگھی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے ان کی فراوانی موٹی موٹی لٹوں کی شکل میں بٹ گئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ڈرائیور ٹیکسی کے آئینے میں سے دیکھ رہا ہے اور مسکرا رہا ہے، اس کے ذہن میں یوتا سے میرے تعلق کی واحد تفسیر میری جنسی قوت تھی۔ اس سے زیادہ ایک غلام کے ذہن کی پہنچ سے باہر تھا۔ یکبارگی مجھے ڈرائیور کے خلاف طیش محسوس ہوا لیکن میں نے اسے دبالیا اور یوتا سے پوچھا، ''مصر میں کیا کر رہی ہو؟''

اس نے ہنس کر جواب دیا، ''اوہ! یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں سیاحوں کے ایک گروہ کے ساتھ مصر آئی تھی اور اس کے عشق میں اس بری طرح مبتلا ہوگئی کہ اس نے میری بقیہ زندگی کا ستیاناس کر

Scanned with CamScanner

دیا۔ جب جرمنی واپس گئی تو وہاں ہر چیز موت کی حد تک بے کیف لگی، میں نے مصر لوٹ جانے اور یہیں رہنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ سو اب میں یہاں ہوں۔''

''یہاں کام کرتی ہو؟''

''ہاں۔ ایک مصری دوست کے توسط سے درآمد برآمد کی ایک کمپنی میں سیکرٹری کا کام مل گیا ہے۔ اچھی خاصی تنخواہ ملتی ہے لیکن ہر چھ ماہ بعد مجھے اپنی اقامت کی تجدید کے لیے بڑی بھاری رقم ڈالروں میں ادا کرنی پڑتی ہے۔''

میں شاید کچھ خاموش ہو گیا تھا کیونکہ اس نے یکبارگی ہنس کر پوچھا، ''کیا میری کہانی عجیب معلوم ہوتی ہے؟''

لمحہ بھر ہچکچا کر میں نے کہا، ''ہاں۔''

ہوٹل کھچا کھچ بھرا ہوا تھا — رفیع الشان چھت، لٹکتے ہوئے بڑے بڑے قیمتی، گنجلک فانوس، کوریڈور اور روشنیاں اور تمام تر سیاہ پوش خدام۔ جب میں یوتا کے ساتھ داخلے سے گزرا تو اس نے پوچھا کہ کیا میں اس ہوٹل سے واقف ہوں اور میں نے بتایا کہ نہیں، سو اس نے سر ہلایا اور مرمریں زینے پر میری قیادت کرتی ہوئی بار میں لے آئی۔ معلوم ہوتا تھا وہ یہاں سے خوب واقف ہے۔ ایک خوش لباس بیرے نے ہمارا استقبال کیا اور دریائے نیل کے رخ کھلنے والی ٹیرس کی ایک میز پر لایا۔ یوتا نے زندہ دلی سے پوچھا، ''اگر شراب منگواؤں تو تمھیں برا تو نہیں لگے گا؟''

''اگر کسی اور مشروب کا آڈر دیا تو ضرور برا لگے گا،'' میں نے جواب دیا۔

جب وہ ہنستی تو اس کے چھوٹے چھوٹے، خوش ترتیب، چمکتے ہوئے سفید دانت ہونٹوں سے منکشف ہو جاتے۔ بیرا میرے لیے بیئر اور یوتا کے لیے جن کا جام لے آیا۔ اچانک اس خیال سے میں پریشان ہو گیا کہ جانے میرے پاس کتنے پیسے ہوں، لیکن پھر مطمئن ہو گیا کہ کم از کم میری بیئر اور اس کے لیے ایک اور جام کی قیمت ادا کرنے کے لیے کافی ہوں گے۔ دور، دوسرے کنارے پر روشنیاں جھلملا رہی تھیں اور شام کی خنک ہوا پانی کی سطح کو دھکیل کر موجیں پیدا کر رہی تھی جو مدھم سروں میں گنگنا رہی تھیں۔ یوتا نے اپنے جام کی چسکی لی اور رات کو دیکھا، بظاہر ماحول سے مدہوش ہو کر، پھر اس نے پوچھا، ایسے لہجے میں جو ملامت اور تفریح بازی کے بین بین ڈول رہا تھا، ''کیا کوئی اتنے حسین

Scanned with CamScanner

ملک سے نفرت کرسکتا ہے؟''

''یقین کرو، فطرت جرمنی میں بھی اس سے کچھ کم حسین نہیں، لیکن تم اس سے مانوس ہو، اور ہر مانوس شے اپنا حسن کھودیتی ہے۔''

''یہ صحیح نہیں، یہاں دو سال رہنے کے بعد نیل اب بھی مجھے مسحور کر دیتا ہے— شروع کے مقابلے میں اب اور بھی زیادہ۔ اور یہ بھی ذہن میں رہے کہ مجھے مصر میں جو چیزیں بھاتی ہیں وہ صرف اس کے مناظر ہی نہیں۔''

''اچھا، تو اور کیا کیا پسند ہے؟'' میں نے مذاق اڑانے والے انداز میں پوچھا، کہ اب کچھ میں بھی تھوڑا اسا مدہوش ہو چلا تھا۔

''یہاں کے لوگ بڑے گرم وگداز جذبات کے مالک ہیں۔''

میں اتنے زور سے ٹھٹھا مار کر ہنسا کہ اگلی میز پر بیٹھی ہوئی خاتون نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ یوتا نے پوچھا، ''کس بات پر اس طرح ہنس رہے ہو؟''

''مصریوں کے بارے میں تمھارے خیال پر۔ ٹھیک کن 'گرم وگداز جذبات' کی بات کر رہی ہو؟ مصری محض زہریلے کیڑے ہیں۔ یہ ان کی علمی تعریف ہے۔''

''میں نے تو یہ کبھی نہیں دیکھا۔''

''ظاہر ہے، کیسے دیکھ سکتی ہو، تم غیر ملکی جو ٹھیریں، عورت، اور وہ بھی حسین! سنو۔ کیا یہ ہمارے لیے درست ہوگا کہ اس بیرے کو صرف اس لیے رحمدل آدمی سمجھیں کہ ہمارے ساتھ ادب سے پیش آتا ہے؟ گاہکوں کے ساتھ یہ شائستگی اس پر ان حالات نے مسلط کی ہے جو اس سے زیادہ قوی ہیں۔ اگر تم واقعی اس کی حقیقت جاننا چاہتی ہو تو اس کے کسی پڑوسی یا اہلِ خانہ سے پوچھو۔''

اس نے اپنی ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکا دی اور ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا، پھر بولی، ''تمھاری گفتگو کا انداز روکھا ہے، اور دیکھنے کا انداز بھی اتنا ہی بے رس، پھر بھی جانے کیوں مجھے اچھا لگتا ہے۔''

میں نے اس کے لیے ایک اور مشروب اور اپنے لیے بیئر کا آڈر دیا اور باتیں کرنے، بیان کرنے کی شدید خواہش محسوس کی۔ مجھے یہ خوف دامنگیر تھا کہ کہیں یوتا بے لطف نہ ہو جائے، اور اس کے سامنے اپنی روح کو یوں کھول کر رکھ دینے پر ندامت محسوس ہوئی، لیکن جب شراب چڑھنے لگی،

Scanned with CamScanner

میرے اندر ایک وفور ابھرا جس کے باعث میں بڑے جوش و خروش سے بولنے لگا۔ میں نے اسے اپنے والد اور والدہ کے بارے میں بتایا اور ادارۂ کیمیا کے بارے میں۔ حتیٰ کہ ملازمہ ہدیٰ کا بھی ذکر کیا۔ یوتا دلچسپی کے ساتھ سنتی رہی۔ کبھی بیچ میں روک کر کسی تفصیل کے بارے میں کوئی سوال کرتی، اور کبھی میں تلخی کی زیادتی کے باعث زور سے ہنس پڑتا، لیکن اس سے وہ میری ہنسی میں شریک نہ ہوتی۔ بس اپنی گہری آنکھوں سے مجھے تکتی، اور مجھے محسوس ہوتا کہ وہ میری بات سمجھ رہی ہے۔ جب میں فارغ ہوا تو بار اس وقت تک تقریباً خالی ہو چکی تھی۔ یوتا نے اپنے جام کو دیکھتے اور ہتھیلیوں کے درمیان گھماتے ہوئے آہستگی سے کہا، ''عصام، تم نے جو کہا ہے اس پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتی۔ ڈر ہے کہ جو کہوں گی، احمقانہ اور بچکانہ معلوم ہوگا۔ لیکن اس وقت مجھے ایک جرمن دوست فریڈرک کا خیال آ رہا ہے جو مجھے مصر کے بارے میں بتانے والا پہلا شخص تھا۔ انجینئر ہے اور مصر میں دس سال گزار چکا ہے۔ معلوم ہے اس نے ایک دفعہ مجھ سے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ دنیا کے زیادہ تر ملک دیکھ چکا ہے لیکن مصر کے سوا کوئی ملک ایسا نہیں ملا جہاں خداداد صلاحیت رکھنے والے لوگ اتنی زیادہ تعداد میں موجود ہوں، اور اسے افسوس ہے کہ ان باصلاحیت مصریوں کو اتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔''

یہ اس نے مجھ پر نظر جما کر دھیرے دھیرے سر ہلاتے ہوئے کہا، جیسے معنی پر تاکید کرنا چاہتی ہو، اور اس لمحے مجھے خیال آیا کہ جیسے مجھے اس کے چہرے کے دو مختلف روپ دکھائی دیتے ہیں: کبھی نازک اور خوابناک، اور کبھی کسی زندہ دل، ننھی سی بچی جیسا۔ اور کبھی کبھی اس کے خدوخال متغیر ہو جاتے اور ان پر سختی چھا جاتی۔

''چلو ایک جام اور ہو جائے،'' میں نے کہا اور اس نے نرمی سے جواب دیا، ''معاف کرنا، بہت دیر ہو گئی ہے، مجھے اب چلنا چاہیے۔''

جب میں بل کی طرف دیکھ رہا تھا تو میری پریشانی عیاں ہو گی کیونکہ وہ اپنا سر قریب لائی اور سرگوشی میں کہا، ''میں اس میں شریک ہو سکتی ہوں۔''

میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا اور خود ہی بل ادا کر دیا، اور بیرے کے لیے اچھی خاصی بخشش چھوڑی۔ ہم اٹھے اور خاموشی کے عالم میں زینے سے اترنے لگے۔ ایک ہٹ دھرم سوال ہمارے درمیان اٹکا ہوا تھا اور مجھے اس کا احساس تھا کہ میرا دماغ جس ادھیڑ بن میں لگا ہوا ہے اس

سے وہ بھی واقف ہے۔ کیونکہ جیسے ہی ہم باہر سڑک پر آئے، اس نے فوراً خدا حافظ کہنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''بہت شکریہ،'' وہ بولی۔ ''میرا بہت اچھا وقت گزرا۔ امید کہ دوبارہ ملاقات ہوگی۔ تمھارے گھر ٹیلیفون ہے؟''

میں ایک لمحہ اسے دیکھتا رہا، پھر اچانک اور بالکل غیر مبہم لہجے میں کہا، ''میں تم سے کبھی جدا نہیں ہوں گا۔''

وہ ہنس دی اور پوچھا، ''تمھارا مطلب؟''

''تم میرا مطلب خوب جانتی ہو۔ مجھ میں تمھیں چھوڑنے کی تاب نہیں۔ میں تمھاری رفاقت میں رہنا چاہتا ہوں۔''

ایک بار پھر میری جرأت نے مجھے حیران کر دیا۔ یوتا نے مجھے دیکھا، جیسے میرا اندازہ لگا رہی ہو۔ اس کا چہرہ اپنی سنجیدہ وضع پر آ گیا۔ پھر اس نے ہر لفظ پر وزن دے کر کہا، ''عصام، سنو۔ یہ صحیح ہے کہ تم مجھے پسند ہو اور دلچسپ لگتے ہو۔ اگر تم میرے ساتھ گھر چلو تو مجھے اس پر بھی اعتراض نہ ہوگا۔ لیکن اس سے میں ایسی مشکلوں میں پڑ جاؤں گی کہ جو نہ ہوں تو ہی بہتر ہے۔''

''کیسی مشکلیں؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے لمبی سانس بھری اور کہا، ''میرے مصر آنے سے پہلے مجھے فریڈرک نے خبردار کر دیا تھا، کیونکہ مصریوں کی اپنی الگ روایات ہیں — ظاہر ہے تم جانتے ہی ہو۔ لیکن میں نے اس کی تنبیہ کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اور ایک رات میں نے ایک مرد دوست کو اپنے اپارٹمنٹ میں بلانے کی کوشش کی، جس نے شعبان صاحب کو بہت برافروختہ کر دیا، یہاں تک کہ تقریباً فضیحتا کھڑا ہو گیا۔''

''کون شعبان؟''

''شعبان سبزی فروش۔ اس کی دکان میری عمارت کے نیچے ہے اور وہ نصف شب تک جگتا رہتا ہے۔ میں اس سے جھگڑا مول نہیں لینا چاہتی۔ بڑا متشدد مذہبی ہے اور میرا کسی مرد کو گھر لانا اسے قبول نہیں۔ یہ اس نے پہلی بار ہی مجھ سے صاف صاف کہہ دیا تھا۔''

میں نے خود کو طیش سے چلّاتے ہوئے پایا، ''کیا تم ایک بقال کو اپنی ذاتی زندگی پر حکم چلانے

Scanned with CamScanner

دو گی؟''

''مہربانی سے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں اس کے جذبات مجروح نہیں کرنا چاہتی، اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ مصر میں روایات کو للکارنے کا نتیجہ تباہ کن نکلتا ہے۔ فریڈرک نے یہ بالکل واضح کر دیا تھا۔''

میرا طیش اپنی حد کو پہنچ گیا اور میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر میں نے اچانک خود کو اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے دیکھا، جبکہ وہ چلا کر بولی، ''عصام! پلیز ٹھہرو! میں بالکل سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔''

میں نے اس کے چلانے کی کوئی پروانہ کی اور اپنے ساتھ کھینچ لے گیا حتیٰ کہ ہوٹل کے سامنے کھڑی ٹیکسی میں اسے داخل کر دیا۔ پھر میں اس کے برابر بیٹھ گیا اور تحکم سے اس کے کان میں سرگوشی کی، ''ڈرائیور کو اپنا پتا بتاؤ!''

اس نے تردد سے میری طرف دیکھا، پھر ٹوٹی پھوٹی عربی میں ڈرائیور کو بتایا، ''مدینۃ نصر، شارع عباس العقاد۔''

اس کے گھر کے راستے میں ہم باتیں کرتے رہے لیکن چونکہ خفیف سی فکرمندی نے قدرے تناؤ کی کیفیت پیدا کر دی تھی، ہماری گفتگو ہوتے ہوتے ختم ہو کر رہ گئی۔ میں خوفزدہ نہیں تھا۔ میں اپنے اعضا میں آگے کو دھکیلتی ہوئی بے قابو توانائی کو لہریں مارتے ہوئے محسوس کر سکتا تھا۔ بے شک یہ شراب کا اثر تھا، لیکن میں اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ اپنی زندگی کے اہم ترین لمحات سے گزر رہا ہوں اور مجھے ان کو اپنی گرفت میں لے لینا چاہیے، ورنہ یہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ میں شعبان سے دوبدو ہونے کے لیے تیار تھا۔ اگر اس نے یوتا کے ساتھ میرے اوپر جانے پر اعتراض کیا تو میں اس کی ٹھکائی کر دوں گا۔ اس کی دکان سے کوئی وزنی چیز اٹھا کر سر پر دے ماروں گا۔ مرتا ہے تو مرے، میری بلا سے؛ میں یوتا کو ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا اور کسی کو مجھے اس سے دور کرنے اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔ یہ شعبان کون تھا؟ بقال... مذہبی شخص! ایسا شخص جسے اپنے گاہکوں کو دھوکا دینے میں عار نہیں ہوتا ہو گا اور جو کوئی نماز قضا نہیں ہونے دیتا ہو گا۔ ہر مصری کی طرح دَنی، غبی، طفیلی، اور کینہ پرور۔ میں اس سے اس زبان میں بات کروں گا جسے وہ سمجھتا ہے ـــــ بقول المتنبی: ''غلام کو سونٹے بغیر

Scanned with CamScanner

کبھی نہ خریدنا۔'' یوتا نے ٹیکسی اپنی رہائش سے کچھ دور رکوانے کا فیصلہ کیا اور جب ہم اترے اور ٹیکسی رخصت ہوئی تو یوتا نے گھر پر نظر ڈالتے ہوئے تشویش سے سرگوشی کی، ''شعبان کی دکان کھلی ہوئی ہے۔اب مصیبت آئے گی۔''

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اعتماد سے کہا، ''جب عمارت کے دروازے کے پاس پہنچیں تو تم بلار کے آگے بڑھتی جانا اور میں اس سے نمٹ لوں گا۔''

چھوٹی سی دکان تھی جس پر ''بقالۃ الایمان'' (Faith Grocery) کی تختی لگی تھی۔ سفید جلباب میں ملبوس ایک موٹا تازہ باریش آدمی چیزیں سمیٹ رہا تھا اور کنستر اور ڈبے گھسیٹ کر اندر لا رہا تھا۔ یہ شعبان تھا جو دکان بڑھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ یوتا کے ساتھ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ مجھے اپنے بشرے سے، خونخوار آدمی معلوم ہوا جس سے معرکہ آرائی آسان نہیں ہوگی۔ ہم دروازے پر پہنچے اور یوتا تیزی سے اندر داخل ہوگئی، جبکہ میں نے دکان کے سامنے اپنی رفتار کم کر دی۔ میں ٹھہر گیا اور مڑ کر شعبان کی طرف دیکھا، جو ڈبے چھوڑ کر میرے پاس آیا اور مجھے چوکسی سے دیکھنے لگا۔ میں نے اسے غضبناکی سے گھور کر بلند آواز میں کہا، ''السلام علیکم!''

اس نے جواب نہیں دیا، بس خاموشی سے مجھے تکتا اور ڈاڑھی میں انگلیوں سے خلال کرتا رہا، جیسے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے صورتِ حال کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اس کی آنکھیں تنگ اور دغاباز تھیں اور پیشانی چوڑی، جس کے بیچ میں نماز پڑھنے کی وجہ سے گول سیاہ گٹا پڑا تھا۔ کیا یہ کسی باایمان شخص کا چہرہ ہوسکتا تھا؟ وہ اپنے آپ سے کس قدر راضی خوشی نظر آ رہا تھا! بے شک اسے پورا یقین تھا کہ اپنے رب کی کامل خوشنودی اسے حاصل ہے۔ مجھے اس قسم کے جانوروں سے نفرت ہے — جاہل اور گھٹیا اور گھمنڈی۔ میں نے آگے قدم اٹھائے یہاں تک کہ اس کے بالکل روبرو آ گیا۔ وہ تھوڑا سا فاصلہ جو ہمارے درمیان باقی رہ گیا تھا وہ اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور ایسی آدمی کی آواز میں بولا جو جھگڑا شروع کرنے کو بیتاب ہو، ''میں نے السلام علیکم کہا تھا!''

لمحہ بھر کو یوں لگا جیسے وہ سمجھا نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ میرا اچانک سامنے نمودار ہونا ہو یا اس نے میرے منہ سے آتی ہوئی شراب کی بو سونگھ لی ہو، بہرحال اس نے تیزی سے اپنی نگاہ نیچی

کر لی، مڑا اور اپنی پہلی وضع پر واپس آتے ہوئے بڑبڑایا: ''والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اہلاً!''

شعبان کا ٹھستا اتر چکا تھا اور وہ اپنے ڈبوں کی طرف لوٹ گیا لیکن میں ذرا دیر اسے غور سے دیکھتا رہا یہاں تک کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے پھر سے اپنا کام شروع کر دیا ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ پھر میں آہستہ آہستہ اس سے دور ہوا تا کہ وہ مجھے بزدل سمجھ کر معرکہ آرائی کے لیے پھر نہ لوٹ آئے۔ داخلے کے دروازے کی طرف بڑھتا ہوا میرا ہر قدم جیسے اس کے بے ہنگم، احمق سر کو کچلتا ہوا جا رہا ہو۔ یوتا دروازے پر میری منتظر تھی۔ وہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ جب ہم اس کے اپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو اس نے پوچھا، ''تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟ اس نے تمھیں روکنے کی کوشش نہیں کی؟''

میں نے اترا کر یوں کہا جیسے جو کچھ پیش آیا تھا حقیر سی چیز تھا، ''میں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو مصریوں کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔''

دروازہ کھلا اور اپارٹمنٹ سے آتی ہوئی مرطوب سی مہک نے ہمارا استقبال کیا۔ یوتا نے ہاتھ بڑھا کر بجلی کا بٹن دبایا۔ ایک بڑا استقبالیہ کمرہ تھا، باورچی خانہ، غسلخانہ، اور ایک اندرونی کمرہ جسے طویل سی راہداری استقبالیہ کمرے سے جدا کر رہی تھی۔ فرنیچر — جیسا کہ عام طور پر ساز و سامان کے ساتھ کرائے پر اٹھائے جانے والے اپارٹمنٹوں میں ہوتا ہے — پرانا، استعمال شدہ، اور اِدھر اُدھر سے اکٹھا کیا ہوا نظر آتا تھا، جیسے کسی ردّی سے کھیل کا اسٹیج سیٹ ہو۔ میں ایک لمبے سے سرخ صوفے پر بیٹھ گیا۔ میرے سامنے ایک میز تھی جس پر بکھرے ہوئے کاغذات، نوٹ، ریزگاری اور ایک کھلا ہوا جرمن رسالہ پڑا تھا۔ یوتا مسکرائی اور ایسی آواز میں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب خود کو میزبان محسوس کر رہی ہے، بولی، ''پینے کے لیے میرے پاس سرخ وائن کی دو بوتلوں کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔ کیا خیال ہے؟''

''کیا کہنے!''

وہ باورچی خانے میں گئی اور چند منٹ بعد سینی پر وائن کی بوتل اور دو گلاس اٹھائے واپس ہوئی۔ میرے لیے گلاس میں وائن انڈیلتے ہوئے اس نے کہا، ''سرخ وائن عام طور پر گرم ہی پی جاتی ہے لیکن میں سرد پینا پسند کرتی ہوں۔ امید ہے تمھیں اعتراض نہ ہوگا۔''

Scanned with CamScanner

''کوئی مضائقہ نہیں،'' میں نے گلاس سے چسکی بھرتے اور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ شراب انڈیلتے میں، جب اس کے لمبے، سنہری بال اس کی آنکھوں کے سامنے جھولنے لگے اور اس نے انھیں اپنے شاندار، نازک ہاتھ کی ایک جانب سے اوپر ہٹایا، تو وہ کسی گلگوں خواب کا حصہ معلوم ہو رہی تھی جو یقین آنے سے کہیں زیادہ حسین ہو۔ وائن کے ذائقے میں لذیذ سی کاٹ تھی۔ اس نے پوچھا، اب پھر اس کے چہرے پر سنجیدگی اُمڈ آئی تھی: ''تمھارا کیا خیال ہے، شعبان ہم پر پولیس بلائے گا؟''

''کس لیے؟''

وہ زور سے ہنس دی، پھر اعتذاراً مسکرائی اور بولی، ''مجھے کمزور نہ سمجھنا۔ میں بزدل نہیں، لیکن میں مشکلیں نہیں کھڑی کرنا چاہتی اور مجھے متشدّدوں کا حال معلوم ہے۔ یہ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے جرمنی میں بھی متشدّد پائے جاتے ہیں۔''

''شعبان کو بالکل بھلا دیں تو کیسا رہے گا؟'' میں نے مسکرا کر پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور خوش دلی سے بولی، ''جانتے ہو، عصام، آج رات ہماری ملاقات میری زندگی کا عجیب ترین واقعہ ہے۔''

وہ ہنسی۔ میں خاموش رہا تو وہ بولے گئی اور کرسی سے پیٹھ ٹیک لی، ''میں کوئی 'اچھی لڑکی' نہیں ہوں، اس لفظ کے عام معنی میں۔ میں اکثر تعلقات میں پڑ جاتی ہوں، صرف اس لیے کہ ملول اور بے کیف ہوتی ہوں یا اس لیے کہ کوئی آدمی ایک مخصوص ماحول میں مجھے کسی مخصوص انداز میں پرکشش نظر آتا ہے۔ اس قسم کے تعلق کو ہمارے یہاں 'ایک شب کا معاملہ' کہا جاتا ہے۔ تاہم ایسا پہلی مرتبہ ہو رہا ہے کہ میں اتنی سرعت سے کسی مرد کے ساتھ بستر میں آ گئی ہوں۔ ذرا سوچو، چند گھنٹوں پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہ تھے اور اب تم رات میرے اپارٹمنٹ میں گزار رہے ہو، اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے صدیوں سے تمھیں جانتی ہوں۔''

شراب نے رہا سہا باک بھی چلتا کیا تھا اور میں کھڑا ہو گیا، اس کے پاس آیا، اس کا ہاتھ تھام کر اسے چوم لیا، اور اپنا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا دیا۔ لیکن وہ دور ہو گئی اور بولی، ''نہیں۔ اتنی جلدی نہیں۔ اگر ہم اپارٹمنٹ کے دروازے سے سیدھے خوابگاہ میں جائیں تو یہ مضحکہ خیز بات ہو گی۔''

میں بیٹھ گیا، اپنے لیے ایک اور گلاس انڈیلا، اور خیال کیا کہ جو ہو رہا ہے وہ اتنا حسین ہے کہ

Scanned with CamScanner

میں اسے طول دینا چاہتا ہوں، تا کہ اس کی ہر تفصیل سے لذت اندوز ہو سکوں۔ میں ہمیشہ لذت کی انتہا تک پہنچنے میں جلد بازی کر جاتا ہوں، اور جب پہنچ جاتا ہوں تو یہ ایک لمحے کو پورے اشتعال سے بھڑک کر ماند پڑ جاتی ہے، پیچھے کچھ رہ جاتا ہے تو بس ایک دور افتادہ نرم و گداز یاد۔ پھر میں اداسی سے مغلوب ہو جاتا ہوں اور اتنی جلد بازی کے ساتھ لذت سے گزر جانے پر خود پر لعن طعن کرتا ہوں، جبکہ یہ میری قدرت میں تھا کہ دیر تک اپنی انگلیوں سے اس کی پرورش کرتا رہوں۔

''کیا تمھیں اس کا احساس ہے کہ تمھارا بشرہ دھوکے باز ہے؟'' اس نے کہا۔

''وہ کیسے؟''

''پہلے میں سمجھی کہ تم کم آمیز ہو اور جسارت نہیں رکھتے، لیکن پھر پتا چلا کہ اس کے بالکل الٹ ہو۔''

''تمھارا پہلا تاثر ہی صحیح ہے۔ اس شب اپنے طرزِ عمل پر خود مجھے بھی تعجب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں کمزور آدمی ہوں اور عام طور پر سامنا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔''

''مجھے اس پر یقین نہیں۔''

''کم از کم، چند گھنٹوں پہلے میں ویسا ہی آدمی تھا۔''

وہ مسکرا دی اور چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ پھر مجھ سے قریب ہوئی اور بولی، ''اس سے تمھاری کیا مراد ہے؟''

''یہی کہ آج رات اگر جسارت سے پیش آیا ہوں تو اس لیے کہ تمھارے ساتھ ہوں۔''

وہ کچھ اور قریب ہوئی اور سرگوشی کی، ''مجھے تمھاری باتیں بھاتی ہیں۔''

میں نے اسے چوما اور اس نے سر پیچھے کر کے کہا، ''مجھے سُستی آ رہی ہے۔ کیا جا کر باورچی خانے سے دوسری بوتل نہ لے آؤ گے؟''

میں نے کھڑے ہوتے ہوئے اسے پھر چوما۔ میں نے اس کے رخسار کی بافت کو اپنے ہونٹوں کے نیچے سپر انداز ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں نے اسے اپنے بوسوں سے ڈھانپ دیا اور وہ سکون سے میری آغوش میں آ گئی۔ پھر وہ مسکرائی، اپنی بانہیں پھیلائیں اور بولی، ''دیکھا، تم نے مجھے کیا کر دیا ہے؟''

Scanned with CamScanner

اس کی بانہوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے کہا، ''اس کے کیا معنی؟'' اور وہ ہنسی اور بولی، ''اس کے معنی بہت اہم ہیں۔''

میں نے اسے پھر چوما، میری آنکھیں جو دیکھ رہی تھیں اس میں اب اور تمیز کرنے سے عاجز۔ میں نے اپنی ناک اس کے بالوں میں غرق کر دی، ہر شے ایک سحر انگیز حسن میں پگھلتی جا رہی تھی، اور اس نے ہنستے ہوئے سرگوشی کی، ''کیوں کیا خیال ہے، ایک بات پر اتفاق نہ کر لیں؟ تم باورچی خانے سے بوتل لاؤ اور میں خوابگاہ میں تم سے پہلے پہنچوں۔''

❀

کمرے کے اندھیرے میں تین موم بتیوں کی روشنی رقص کر رہی تھی۔ روشنی اور اندھیرا گھل مل رہے تھے، وائن ذائقہ، حرارت، سکون، اور اس کے جسم سے آتی ہوئی بھلی سی خوشبو کی لپٹیں — میں نے اسے اپنے سے چمٹا لیا، میرے احساسات پھیلنے لگے، ان کی جڑیں مضبوطی سے گڑنے لگیں، اور میں ایک حقیقی لمحے کی طرف لوٹ آیا جسے میں کبھی جانتا تھا، بہت پہلے، پھر وہ کھو گیا تھا، اور جس کی طرف میں اب واپس آ گیا تھا۔ میرا جی چاہا کہ جو محسوس کر رہا ہوں اسے سرگوشی میں بتاؤں، یہ کہ میں اسے اپنے احساسات میں سمو سکتا ہوں، جس طرح اپنے جسم میں سموئے ہوئے ہوں۔ ایک طلسمی خواب نے مجھے مانوس، کریہہ حقیقت سے، جو ہمیشہ اپنی بے رحم گرفت میں مجھے مسلتی رہی تھی، باہر نکال لیا تھا۔

اس نے مجھ سے کہا، ''مجھے نیند آ رہی ہے۔''

پھر وہ قریب ہوئی اور سرگوشی کی، ''میں چاہتی ہوں کہ تم صبح تک مجھے اپنے بانہوں میں لیے رہو۔''

میں نے نیند کے سناٹے کو اس کے پرسکون چہرے پر ہولے ہولے اترتے ہوئے دیکھا۔

مجھے یقین تھا کہ تم سورج کی طرح نکلو گی اور میں نے تمھارا انتظار کیا تھا۔ میں نے انھیں تمھارے بارے میں بتایا تھا اور کسی نے میرا اعتبار نہیں کیا تھا، لیکن میں تکلیفیں اٹھاتا رہا اور امید کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مجھے تم پر یقین تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کبھی تم یکبارگی اپنی ساری آن بان

کے ساتھ ظاہر ہوگی، آ کر اپنے ہاتھوں سے میرے زخموں کا اندمال کروگی جو تشدّد نے لگائے تھے، اور اپنی مسکراہٹ سے اندھیرا دور کردوگی۔ اور اس وقت تنہائی، عجز، اور دکھ کی صرف ایک بھیانک اور چبھتی ہوئی یاد ہی باقی رہ جائے گی۔ میں تمھیں چمٹالوں گا اور انھیں تمھارے سینے میں خالی کردوں گا یہاں تک مجھے قرار آ جائے گا، پھر سو جاؤں گا۔

اندھیرے میں میرا چہرہ سکڑ گیا۔ ایک تھرتھراہٹ میرے اندر دوڑ گئی اور میں نے خود کو آہ و بکا کے سپرد کردیا۔ میرے آنسوؤں سے اس کا چہرہ بھیگ گیا اور وہ بیدار ہوگئی، ہاتھ بڑھا کر بستر کے اوپر کا لیمپ روشن کیا، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، اور تشویش کے ساتھ پوچھا، ''رو رہے ہو؟''

میں نے جواب نہیں دیا اور وہ لمحے بھر کے لیے خاموش ہو رہی، جیسے سمجھ گئی ہو۔ پھر اس نے گھڑی کی طرف دیکھا اور بولی، ''چھ! اب اٹھنا ہی پڑے گا! گھنٹے بھر میں مجھے اپنے دفتر میں ہونا ہے۔''

وہ برہنہ حالت میں بستر سے نکلی اور کھڑکی کے پاس جا کر اسے کھول دیا۔ کمرہ روشنی میں نہا گیا، اور ایک خنک سی ہوا دبے پاؤں اندر آنے لگی۔ اس نے آئینے میں اپنے چہرے پر نگاہ ڈالی اور کمرے سے نکلتے ہوئے مجھ سے پوچھا، ''ناشتے کے ساتھ چائے یا قہوہ؟''

قہوے کی چسکی لیتے ہوئے میں نے پوچھا، ''کیا آج شب تم سے مل سکتا ہوں؟''

''اگر واقعی ملنا چاہتے ہو تو۔''

میں مسکرایا اور کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

''چاہو تو کام ختم ہونے پر مجھے دفتر سے لے لینا۔ میں تین بجے وہاں سے نکلتی ہوں۔''

جب ہم وہاں سے نکلے تو شعبان کی دکان بند تھی اور سڑک بالکل ویران پڑی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا، ''میرے کام کی جگہ دیکھنے نہیں چلو گے؟ قریب ہی ہے، سڑک کے ختم پر۔''

میں چند منٹوں تک اس کے برابر چلتا رہا یہاں تک کہ وہ ایک دومنزلہ مکان کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئی۔ پہلی منزل کی بالکونی پر میں نے ایک بڑی سی تختی لگی دیکھی جس پر ''مصطفیٰ یُسری امپورٹ ایکسپورٹ'' لکھا تھا۔ یوتا نے تختیک ی طرف اشارہ کیا اور بولی، ''یہاں کام کرتی ہوں۔ پہلی منزل پر اپارٹمنٹ نمبر 3۔''

اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، تیزی سے جھکی، مجھے بوسہ دیا، اور سرگوشی میں کہا، ''تین بجے تم سے ملوں گی۔'' پھر وہ عمارت میں داخل ہو گئی۔

میں تنہا چلتا ہوا بڑی سڑک پر آ گیا، جہاں میں نے ٹیکسی رکوائی۔ نیند کے آثار ڈرائیور کے چہرے پر ابھی تک باقی تھے۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑکوں پر زندگی ہمکنے لگی تھی۔ لوگ ہر صبح کی طرح بس کے اڈّے پر جمع ہو رہے تھے، ایسے چہروں کے ساتھ نئے دن کا آغاز کر رہے تھے جن پر گذشتہ دن کی تھکاوٹ ابھی تک موجود تھی۔ مجھے عجیب لگا کہ اس صبح کچھ بھی تو مختلف نہیں تھا۔ میں یہ توقع کر رہا تھا کہ ہر شے ایک نئے اور شاندار روپ میں نظر آئے گی، لیکن ہر چیز پہلے جیسی ہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے میں یوتا سے کبھی ملا ہی نہ ہوں یا وہ قوی آدمی جس کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے حسین ترین لمحات گزارے ہوں، کبھی میرے اندر بیدار ہوا ہی نہ ہو۔

گھر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی مجھے والدہ چلّاتی اور روتی ہوئی ملیں، ''میرا دل اور خدا قیامت کے دن تک تم سے ناراض رہیں گے۔''

میں نے انھیں نظر انداز کر دیا اور خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف قدم بڑھانے لگا، لیکن انھوں نے راہداری میں مجھے آلیا، ہاتھ پکڑ لیا اور بولیں، ''مجھ سے پیش آنے کا یہ کوئی طریقہ ہے، عصام؟ تمھیں شرم نہیں آتی؟ تمھیں اس کی پروا نہیں کہ ساری رات مجھے پریشان ہونے کے لیے چھوڑ دیا؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں بیمار ہوں اور اس قدر تشویش کی متحمل نہیں ہو سکتی؟''

انھیں فکر تھی تو بس یہ کہ پریشانی ان کی صحت پر اثر انداز ہو گی۔ میں نے ان پر نظر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں گھور کر دیکھا یہاں تک کہ تفصیلات غائب ہو گئیں اور میری بصارت پر دھواں سا اُمڈ آیا۔ یہ صورتِ حال چند لمحوں تک جاری رہی۔ جب میرے حواس ٹھکانے آئے تو میں مضمحل قدموں سے کمرے کی طرف جانے لگا، اور والدہ اپنی بدقسمتی کا دکھڑا آنسوؤں سے بھرائی آواز میں سناتی رہیں۔ میں جانتا تھا کہ سو نہیں سکوں گا، اور میں نے دیر تک اس کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کھول دیے اور سورج کی شعاعیں سارے کمرے میں پھیل گئیں۔ ہدیٰ اخبار اور قہوہ لائی۔ میں نے سرخیوں کو سرسری سا دیکھا اور اخبار ایک طرف ڈال دیے۔ ارتکاز کرنے کی قدرت، جاتی رہی تھی۔ تین بجے تک انتظار کرنا ہے — میں اس سے زیادہ سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تین بجے اس

سے ملاقات ہوگی۔ میں اسے چوموں گا اور چمٹاؤں گا اور وہ میری آغوش میں سو جائے گی، جس طرح کل سوگئی تھی۔ وقت ایک پورے دہر کی طرح گزرا اور جب تقریباً دو بج گئے تو میں کھڑا ہوا، منہ ہاتھ دھوئے، اور کپڑے پہنے۔ والدہ کی نظر مجھ پر جا پڑی، وہ گھبرا کر میرے پیچھے لپکیں اور پوچھا، ''باہر جا رہے ہو؟''

میں نے بغیر مڑے بدبدا کر ''ہاں'' کہا اور انھوں نے میرا کندھا پکڑ کر کہا، ''نہ جاؤ، عصام، تمھاری منت کرتی ہوں۔ تم سوئے نہیں ہو اور تمھارے اعصاب تھکے ہوئے ہیں۔''

میں نے زبردستی کندھا ان کی گرفت سے چھڑایا اور دروازہ زور سے اپنے پیچھے بند کر کے باہر نکل گیا۔

فضا گرم تھی اور پسینہ میری پیشانی سے بہہ رہا تھا۔ بھیڑ کے درمیان ٹرام کا انتظار کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ اس سے ٹیکسی کا خرچ بچ جائے گا، ابھی گھنٹہ بھر باقی ہے اور آج رات مجھے پیسوں کی ضرورت بھی ہوگی۔ ٹرام آدھے گھنٹے بعد آئی اور کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ میں دھکم پیل کرتا ہوا دوسرے مسافروں میں اتنی دور تک گھس گیا کہ ان کے جسموں سے روشنی چھپ گئی اور میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ مدینۃ نصر پہنچ کر میں نے جیب سے وہ پرزہ نکالا جس پر میں نے اس خیال سے یوتا کا پتا لکھ لیا تھا کہ بھول جانے پر کام آئے گا۔ اس کے دفتر پہنچنے کے لیے میں دس منٹ چلتا رہا۔

گرمی اتنی شدید ہوگئی کہ میں نے جیکٹ اتار دی اور قمیص کے بٹن کھول دیے۔ عمارت صبح ہی کی طرح دکھائی دے رہی تھی، اور تختی پر بھی عین مین وہی ''مصطفیٰ یُسری امپورٹ ایکسپورٹ'' لکھا تھا۔ اس بار میں تمنا کر رہا تھا کہ دربان مجھے عمارت میں داخل ہونے سے روک دے گا۔ لیکن کل سے میں ایک مقتدر حاکم بن گیا تھا۔ میں اسے اعتماد اور سختی سے اپنے سے دور کر دوں گا۔ کسی نے مجھے نہیں روکا اور جب میں دفتر میں داخل ہوا تو اس وقت میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اب یوتا مجھے نظر آئے گی۔ کیا مجھے چاہیے کہ اس کی طرف تیزی سے جاؤں، اسے چمٹا لوں، اور اس کے ہمکاروں کے سامنے اس کے چہرے کو بوسوں سے بھر دوں؟ میں نے اس بارے میں سوچنا بند کر دیا۔ دروازے کے سامنے دفتر خالی تھا۔ سگریٹ کا پیکٹ اور کھلا ہوا اخبار اس بات پر دلالت کر رہا تھا کہ یہاں پر بیٹھنے والا کارکن کسی کام کے لیے اٹھا ہے اور کوئی دم جاتا ہے کہ واپس آجائے گا۔ کمرے کے کونے میں

حجاب لگائے ایک نوجوان لڑکی بیٹھی کچھ ٹائپ کررہی تھی۔ ایک منٹ تک میں خالی ڈیسک کے سامنے کھڑا رہا، پھر جدھر وہ لڑکی بیٹھی تھی اس طرف رخ کیا۔ اس نے ٹائپ کرنا بند کر دیا اور چہرہ اٹھا کر مجھے دیکھا۔ خوبصورت لڑکی تھی لیکن جس انداز میں اس نے مجھے دیکھا تھا وہ کسی تاثر سے خالی تھا، جیسے مجھے جانتی نہ ہو، نہ میرا استقبال ضروری ہو، تاہم میری موجودگی پر نہ متعجب ہو نہ متفکر۔ اگر اس نے سر کی خفیف حرکت سے میری سلام علیک نہ لوٹائی ہوتی تو میں یہی سمجھتا کہ اس نے مجھے سرے سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

''براہ کرم، کیا میں مس یوتا سے مل سکتا ہوں؟''

''کون؟''

''مس یوتا، جرمن خاتون۔''

لڑکی مسکرائی۔ بعد میں، جب میں نے اس مسکراہٹ کی بابت غور کیا، تو سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا۔

''یہاں اس نام کا کوئی فرد کام نہیں کرتا۔''

''نہیں۔ وہ یہیں کام کرتی ہے، مجھے پکا یقین ہے۔ میری اس سے ملاقات طے ہے۔ مہربانی کر کے اس سے کہہ دیں کہ عصام اس کا انتظار کر رہا ہے۔''

اس بار اس نے میری طرف رخ نہیں کیا۔ ٹائپ رائٹر کی کلیدیں کھٹکھٹاتی رہی۔ میری موجودگی سے اس کی لاتعلقی نے مجھے مکدر کر دیا، چنانچہ میں اس کے پاس آیا اور چلّا کر کہا، ''مس! کیا تم سن نہیں رہیں؟ میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ یوتا کو میری موجودگی سے مطلع کردو۔''

وہ سر اٹھا کر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہی۔ پھر دوبارہ ٹائپ کرنے میں مشغول ہو گئی۔ مجھے اپنے اعصاب پر قابو نہ رہا۔ میں چلّانے اور جلد ہی اسے برا بھلا کہنے لگا اور پھر اس کے کندھے کو دھکا دیا۔ مجھے اپنے ہاتھ میں اس کے کندھے کی ہڈی کی مضبوطی محسوس ہوئی۔ شور کی آواز سن کر چند کارکن نمودار ہوئے اور ایک چالیس کے لگ بھگ عمر کا دبلا پتلا گنجا آدمی، جو بڑا نفیس سرمئی سوٹ پہنے ہوئے تھا اور جس کی آنکھیں بڑی بڑی اور طاقتور تھیں، میری طرف آیا۔ اس نے میرا بازو پکڑ لیا اور درشتی سے پوچھا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یوتا سے ملنا چاہتا ہوں، اور جب اس نے بھی وہی

Scanned with CamScanner

جواب دیا جو حجاب والی لڑکی نے دیا تھا، تو میں اس کے چہرے کے عین سامنے پھٹ پڑا۔ اس نے بس اتنا کیا کہ میری کلائی پر اپنے ہاتھ کی گرفت اتنی سخت کر دی کہ وہ دکھنے لگی اور میں بالکل شل ہو کر رہ گیا۔ میں چیخنے چلانے اور ان پر لعن طعن کرنے لگا اور میرے کانوں میں ''پاگل'' اور ''پولیس'' کی صدائیں ایک دوسرے سے خلط ملط ہونے لگیں اور میں نے دیکھا کہ سوٹ والا مجھے دروازے کی طرف گھسیٹ رہا ہے۔ پھر اس نے بڑے زور سے میری پیٹھ کو دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا اور اپارٹمنٹ کے باہر نکال دیا۔

میں لڑکھڑایا اور سیڑھیوں پر تقریباً گر پڑا، اور اس آدمی نے دھڑ سے دفتر کا دروازہ بند کر دیا۔

میں ہڑبڑا کر سیڑھیاں اترا اور جتنی جلدی ہو سکا، سڑک پر آ گیا۔ مجھے نہ تعجب محسوس ہوا نہ غصہ۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جو ٹھیک آخری لمحے میں تباہی کو روکنا چاہتا ہو۔ میں سڑک پر دوڑنے لگا۔ میں اپنی آنکھ کے کنارے سے دیکھ سکتا تھا کہ راہ گیر رک کر مجھے حیرانی سے دیکھ رہے ہیں۔ چند منٹوں بعد میں یوتا کی عمارت پہنچ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے سامنے ٹھہر گیا۔ میں ہانپ رہا تھا اور پسینہ بری طرح میرے چہرے اور گردن پر بہہ رہا تھا۔ میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ ایک گہری آواز نے مجھے اچانک آ لیا۔

''کہاں چلے، حضرت؟''

اس کا لہجہ گستاخ تھا۔ اس کی طرف رخ کرتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ ہو نہ ہو یہ شعبان تھا، ڈاڑھی والا، پیشانی پر سیاہ گٹے والا، رذیل شعبان — شعبان جس کی کھردری جلد سے چکنائی اور خبث رستا تھا۔ میں اس پر جھپٹا اور اس کے چہرے پر دو ہتڑ مارا جو ٹھیک نشانے پر لگا اور اس کا گیم شحیم جثہ لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلے، ایک اور سریع ضرب رسید کی اور پیٹ پر زور سے لات ماری، پھر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ زمین پر جا پڑا۔ میں اس پر پل پڑا اور اس کے سر پر اتنی ضربیں لگائیں کہ مجھے اپنی انگلیوں پر خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔

❁

جال بڑی استادی سے بچھایا گیا تھا، اور اب جب میں ان واقعات اور تفصیلات پر سکون سے غور کرتا

Scanned with CamScanner

ہوں تو ان کی مہارت اور محتاط منصوبہ بندی پر داد دیے بغیر نہیں رہتا۔
فی الواقع انھوں نے کمال کی تدبیر کی تھی۔ چھان بین پر شعبان صاف مکر گیا کہ کبھی مجھ سے واقف رہا ہو یا ہمارے مابین کبھی پرانی عداوت رہی ہو۔ بولا کہ گذشتہ شب مجھے عمارت میں داخل ہوتے ہوئے تو ضرور دیکھا تھا مگر اس خوف کے مارے مجھ سے باز پرس نہیں کی کہ میں شراب کے نشے میں تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں اسے جراحت نہ پہنچادوں۔ اس نے — جس طرح عمارت کے بقیہ مکینوں، اس کے مالک اور دربان نے — بڑی شدومد سے نفی کی کہ وہاں کسی جرمن لڑکی کا قیام تھا۔ اسی طرح، مصطفیٰ یُسری (درآمد برآمد کے دفتر کا مالک، وہی گنجا جس نے سرمئی سوٹ پہن رکھا تھا) نے چھان بین کے شہادتی بیان میں مجھ پر پاگل ہونے کا الزام لگایا اور صاف انکار کیا کہ اس کے دفتر میں کسی جرمن لڑکی نے کبھی کام کیا تھا۔ اور تو اور، جب پولیس نے سمیرامیس بار کے بیرے کو طلب کیا تو اس نے کہا کہ گذشتہ شام میں نے بار میں گزاری تھی اور بہت زیادہ شراب پی تھی۔ اس نے بھی اس سے انکار کیا کہ کوئی جرمن لڑکی میرے ساتھ تھی۔ اس نے زور دے کر کہا کہ میں وہاں اکیلا ہی آیا تھا اور اکیلا ہی وہاں سے رخصت ہوا، صبح کے ڈیڑھ بجے۔ جب تفتیش کنندہ نے اس سے پوچھا کہ اسے میرے ضمن میں کوئی غیر معمولی بات نظر آئی تھی تو اس نے بتایا وہ اس پر متوجہ ہوا تھا کہ میں بلند آواز میں خود اپنے سے انگریزی میں بول رہا تھا اور ہنس رہا تھا، لیکن اس وقت اسے یہ بات بالکل معمولی معلوم ہوئی تھی، اور اس نے اسے میری حد سے بڑھی ہوئی مدہوشی پر محمول کیا تھا۔

15

گھیرا میرے گرد تنگ ہو گیا۔ اس میں کوئی رخنہ نہیں تھا جس سے فرار ہو سکتا۔ ان سھوں نے — جو میری قدر و قیمت سے واقف تھے اور میری برتری پر برافروختہ تھے — میرے خلاف سازش کی تھی۔ ہر متنفس جو مجھ سے نفرت کرتا تھا اور جسے میں حقیر سمجھتا تھا — ڈاکٹر سعید اور شعبان اور بیرا، حتیٰ کہ میری والدہ اور ہدیٰ اور میری کھوسٹ نانی — وہ سب ایک معلوم خطرے کی روک تھام کے لیے متحد ہو گئے تھے، یہ خطرہ کہ اگر میرا یوتا سے ملاپ ہو گیا تو یہ انھیں کچل کر رکھ دے گا۔ میں جو قریب آیا تھا اور جس نے دیکھا تھا۔ انھوں نے سازش کی اور کامیاب ہوئے اور پھر مجھے ایک مخصوص

Scanned with CamScanner

مقام پر بھرتی کرادیا تا کہ ان سے الگ ہو جاؤں، مجھ پر اپنی گرفت سخت کر دی، اور میرے پاس سپر انداز ہو جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ پھر انھوں نے مجھ پر افسوس کرنے کا سوانگ رچایا، اور اب یہ لوگ میرے لیے گلاب کے پھول اور چاکلیٹ کے ڈبے لے کر ملاقات کے لیے آتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر سے میرے بارے میں بات چیت کرتے ہیں، اپنے چہروں پر تشویش اور منت سماجت کا تاثر پیدا کرتے ہیں، پھر مجھ پر ایسی نگاہ ڈال کر جو انھیں اطمینان دلا دیتی ہے کہ اب میں کبھی ان کی گرفت سے پھسل کر نہیں نکل پاؤں گا، مجھے اللہ حافظ کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔

❀❀

Scanned with CamScanner

شاندور مارئی

ایستھر کا ورثہ

(ناولا)

انگریزی سے ترجمہ:

محمد عمر میمن

Scanned with CamScanner

شانڈور مارئی (Sandor Marai) 1900 میں آسٹرو ہنگیرین ایمپائر کے شہر کسّہ (Kassa) میں پیدا ہوا۔ 1930 کی دہائی میں اس کا شمار ہنگری کے ممتاز ترین ناول نگار کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ یہ فاشزم کا بڑا متشدد مخالف تھا۔ دوسری جنگِ عظیم میں کسی نہ کسی طرح بچ نکلا، لیکن جنگ کے بعد اشتراکیوں نے اس کی جان ضیق میں کردی اور اسے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ ملک چھوڑ دے۔ 1948 میں وہ اٹلی چلا آیا اور بعد میں امریکہ، جہاں سان دیاگو میں 1989 میں نواسی سال کی عمر میں گولی مار کر خودکشی کرلی۔

مارئی نے اپنی زندگی تنہائی اور گمنامی میں گزاری۔ ہنگری پر اپنے سیاسی تسلط کے دور میں اشتراکیوں نے اس کی کتابوں پر پابندی لگادی اور اس کی کثیر مطبوعات کی جلدیں چن چن کر تلف کردیں، اور یوں چالیس کی دہائی کا مشہور ترین ناول نگار منظرِ عام سے یوں روپوش ہوگیا جیسے اس کا کبھی وجود ہی نہ رہا ہو۔ مارئی کی تصانیف کی تعداد کوئی ساٹھ کے لگ بھگ ہے، جس میں تیئیس ناول ہیں اور کوئی بیس جلدیں ڈائریوں پر مشتمل ہیں۔ اس کی ایک کتاب ***Memoirs of Hungry (1944-1948)*** ہنگری پر جرمن قبضے اور اشتراکیوں کے عروج کے درمیانی عرصے میں اس ملک کے شب و روز کے بڑے بے ٹوک بیان پر مشتمل ہے۔ اگر مارئی کے ناول یوں دہائیوں تک منظرِ عام سے غائب نہ کردیے جاتے تو عین ممکن تھا کہ یہ ہم سے جدید مغربی فکشن کی تاریخ بہ انداز دگر مرتب کرواتے۔ ان دو درجن سے زائد ناولوں میں سے صرف سات کا اور ساری ڈائریوں کا پہلے جرمن زبان میں ترجمہ ہوا۔ انگریزی کے ناشروں نے مارئی کے ترجموں سے دلچسپی لینا ابھی پچھلے دس برس میں شروع کیا ہے۔

مارئی کے ناول ***Embers*** کا انگریزی ترجمہ 2002 میں شائع ہوا تھا۔ اردو میں اس کا ترجمہ انگارے کے عنوان سے شائع ہوچکا ہے۔ آئندہ صفحات میں اس کے ناولا ***Esther's Inheritance*** کا اردو ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔ اس نہایت دلچسپ فکشنی تحریر میں مرکزی کردار ایسطھر کو، جو کہانی کی راوی بھی ہے، ایک دغاباز شخص کے اشاروں پر ''گویا نیند میں چلتے ہوئے اپنی تباہی کی طرف جاتے'' دکھایا گیا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے کے یورپ میں لکھی گئی اس کہانی میں انسانی رشتوں میں پوشیدہ فاشسٹ رویوں کی جس ماہرانہ انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے اس نے بعض صاحب نظر پڑھنے والوں کو اس کے سیاسی مطالعے پر بھی اکسایا ہے۔ ان کے مطابق اس تحریر میں مضمر وسیع تر دائرے کو اس عمل کی علامت کے طور پر بھی سمجھا جاسکتا ہے جس کے تحت عوام خود کو دلکش مگر فریب کارانہ (اور انجامِ کار ہلاکت خیز) سیاسی ہتھکنڈوں کے سپرد کر کے اپنی آزادی اور اپنے وسائل سے محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

1

مجھے نہیں معلوم کہ قسمت مجھے اور کیا کچھ دکھانے والی ہے، لیکن میں چاہتی ہوں کہ مرنے سے پہلے اس دن کے واقعات رقم کردوں جب لیوش آخری بار مجھ سے ملنے آیا اور مجھے لوٹ لیا۔ میں تین سال سے اسے لکھنے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اب ایک ترغیب انگیز آواز مجھے یہ کر گزرنے پر اکسا رہی ہے، مصر ہے کہ اُس دن کے واقعات درج کردوں — اور ہر وہ بات بھی جو مجھے لیوش کے بارے میں معلوم ہے — کیونکہ ایسا کرنا میرا فرض ہے، اور میرے پاس زیادہ وقت بھی نہیں رہ گیا ہے۔ ایسی آواز کو پہچاننے میں غلطی نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے میں خدا کے واسطے اس کا کہا مان رہی ہوں۔

اب میں جوان اور تندرست نہیں رہی اور عنقریب مرجاؤں گی۔ کیا میں اب بھی مرنے سے خوفزدہ ہوں؟... اُس اتوار کو جب لیوش ہم سے آخری بار ملنے آیا تھا، میں بہت سی اور چیزوں کی طرح اپنے خوفِ مرگ سے بھی چھٹکارا پا گئی۔ شاید وقت، جس نے مجھے بخشا نہیں ہے، شاید یاد، جو اتنی ہی سفاک ہے جتنا وقت، شاید کوئی مخصوص فضل و کرم جو میرے دین کی تعلیم کے مطابق بعض اوقات کسی غیر مستحق اور سرکش فرد کو عنایت کیا جاتا ہے، شاید محض تجربے اور پیرانہ سالی نے اب مجھ میں موت کو سکون سے دیکھنے کی صلاحیت پیدا کردی ہے۔ زندگی مجھ پر غیر معمولی طور پر مہربان رہی ہے، اور اتنے ہی غیر معمولی طور پر اس نے میری ہر چیز چھین بھی لی ہے۔... اب اور کیا ہوسکتا ہے؟ موت تو لازمی ہے، کیونکہ یہی زندگی کا شعار ہے، پھر یہ کہ میں نے اپنے فریضے بھی پورے کرلیے ہیں۔

جانتی ہوں یہ بڑا وزنی لفظ ہے، اور اب اسے لکھا دیکھ کر مجھے تھوڑا سا خوف آرہا ہے۔ یہ ایک نک چڑھا لفظ ہے جس کے لیے مجھے کبھی کسی کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اپنے فرض کو

Scanned with CamScanner

پہچاننے میں مجھے کتنا وقت لگا اور اس کے آگے سپر انداز ہونے سے پہلے میں نے کس کس طرح اس کی مزاحمت نہ کی، چلا چلا کر اور بڑی بے جگری سے پیہم احتجاج کے ساتھ۔ موت نجات ہو سکتی ہے، یہ مجھے پہلی بار اس وقت معلوم ہوا جب میں جان گئی کہ موت ایک حل بھی ہے اور سکون بھی۔ کشمکش اور ذلت صرف موت ہی ہے۔ اور کشمکش بھی کیسی! اس کا حکم کس نے دیا تھا، اور اس سے دامن بچانا کیوں ناممکن تھا؟ میں نے اس سے فرار ہونے کے لیے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا، لیکن میرا دشمن میرا تعاقب کرتا رہا۔ اب میں جانتی ہوں وہ اس معاملے میں کچھ بھی کرنے سے عاجز تھا؛ ہم اپنے دشمنوں سے بندھے ہوئے ہیں، اور وہ بھی ہم سے نہیں بچ سکتے۔

2

اگر میں راست گوئی سے کام لوں —— اور نہ لوں تو پھر یہ سب لکھنے کا مقصد ہی کیا ہوا؟ —— تو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مجھے اپنی زندگی اور افعال میں کہیں بھی انجیلی غضب ناکی اور شدتِ جوش کا ادنیٰ سا نشان بھی نہیں ملتا، حتیٰ کہ اس سنگدلی اور قطعیت کا بھی نہیں جو ناواقفوں کو لیوش کے بارے میں میری آرا یا میری ذاتی قسمت کی بابت قابلِ ذکر نظر آتیں۔ ''مجھے اپنا فرض انجام دینا چاہیے!'' —— کیسا مستحکم، خطیبانہ فقرہ ہے۔ ہم زندگی گزارتے ہیں... پھر ایک دن ہماری توجہ میں آتا ہے کہ ہم نے اپنا فرض ''انجام دے دیا ہے'' یا ''نہیں دیا ہے۔'' میں سوچنے لگی ہوں کہ وہ عظیم اور فیصلہ کن لمحات جو کھلے کھلے انداز میں ہماری زندگیوں پر فرمانروائی کرتے ہیں وہ اپنے رونما ہونے کے وقت اس سے کہیں کم آگاہ ہوتے ہیں جتنا ہمیں بعد میں یادوں کی بازخوانی اور گزرے وقت کا حساب کتاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس وقت تک میں نے لیوش کو بیس سال سے نہیں دیکھا تھا، اور میرا خیال تھا کہ میں اپنی یادوں کی خوگر ہو گئی ہوں۔ پھر ایک دن مجھے یہ تار ملا، جو کسی اوپیرا کی موسیقی کے متن کی کھلی کتاب کی طرح تھا، اور اتنا ہی ڈرامائی، اتنا ہی خطرناک طور پر بچکانہ اور جعلی، جتنی کہ ہر وہ چیز جو اس نے بیس سال پہلے دوسروں سے کہی یا ان کو لکھی تھی —— یہ کسی اعلان سے زیادہ مشابہ تھا، عہد و پیمان سے بھرپور، اس قدر واضح اور شفاف طور پر نقلی —— نقلی! میں تار ہاتھ میں پکڑے پکڑے

باہر باغ میں ٹوٹو کے پاس چل دی اور وہیں برآمدے میں کھڑے ہو کر بلند آواز میں خبر کا اعلان کیا۔
''لیوش واپس آرہا ہے!''
میری آواز کیسی سنائی دی ہوگی؟ یہ تو بعید از قیاس ہے کہ میں خوشی کے مارے چلا رہی ہوں گی۔ ضرور ہے کہ میں کسی خواب خرام کی طرح بول رہی ہوں گی جو اچانک اپنی نیند سے جگ پڑی ہو۔ میں تو بیس سال نیند میں چلتی رہی تھی۔ بیس سال سے ایک کھڑی چٹان کے کنارے کنارے چل رہی تھی، تقریباً متوازن، پرسکون اور متبسم۔ اب میری آنکھ کھل گئی تھی اور میں جان گئی تھی کہ حقیقت کیا ہے۔ لیکن اب مجھے چکر نہیں آرہے تھے۔ احساسِ حقیقت، چاہے یہ زندگی کا ہو یا موت کا، قدرے سکون آور ہوتا ہے۔ ٹوٹو گلابوں کو باندھ رہی تھی۔ اس نے نیچے سے ہی میری طرف اوپر دیکھا، ایک گہرائی سے، گہری رنگت کے گلابوں کے نیچے سے، دھوپ سے جگمگاتی ہوئی، سن رسیدہ اور پرسکون۔
''ہاں، ظاہر ہے،'' وہ بولی۔
وہ گلاب باندھتی رہی۔
''کب؟'' اس نے پوچھا۔
''کل،'' میں نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے،'' اس نے کہا۔ ''میں چھری کانٹے تالے میں رکھ دوں گی۔''
میں ہنسنے لگی۔ لیکن ٹوٹو پر سنجیدگی طاری رہی۔ بعد میں وہ کنکریٹ کی بنچ پر میرے برابر آ بیٹھی اور تار پڑھا۔ ''ہم ایک کار میں پہنچیں گے،'' لیوش نے لکھا تھا۔ بقیہ عبارت سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ اپنے بچوں سمیت آرہا تھا۔ ''ہم پانچ نفر ہوں گے،'' تار کی عبارت جاری رہی۔ مرغی، دودھ، کریم —— ٹوٹو نے سوچا۔ یہ دوسرے دو کون ہیں؟ ہم اِس ادھیڑ بن میں پڑ گئے۔ ''شام تک رہیں گے،'' تار نے مزید اعلان کیا، جس کے بعد وہی آرائشی باتیں جن کی ترغیب میں لیوش کبھی آئے بغیر نہ رہتا، حتیٰ کہ ایک تار میں بھی نہیں۔ ''پانچ نفر،'' ٹوٹو نے کہا، ''صبح آئیں گے تاکہ شام تک لوٹ جائیں۔'' جب وہ گن رہی تھی اور حساب لگا رہی تھی تو اس کے بے رونق بوڑھے ہونٹ بنا آواز کے حرکت کر رہے تھے۔ وہ کھانے پر لگنے والے خرچ کا تخمینہ لگا رہی تھی۔ جب لگا چکی تو بولی:
''مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن واپس ضرور آئے گا۔ لیکن خبردار جواب کے اکیلا آیا! وہ

Scanned with CamScanner

اپنے ساتھ کمک لے کر آ رہا ہے، بچے اور اغیار۔ لیکن اب یہاں دھرا ہی کیا ہے!''

ہم باغ میں بیٹھی ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔ نونو کا خیال ہے کہ وہ میرے بارے میں ہر بات جانتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ حقیقت سے آگاہ ہی ہو، وہ سادہ سی قطعی حقیقت جس کی ہم اپنی ساری زندگی اتنے بہت سے چیتھڑوں میں پردہ پوشی کرتے رہتے ہیں۔ مجھے نونو کی ''ہمہ دانی'' ہمیشہ تھوڑی سی ہتک آمیز لگی ہے۔ لیکن اس نے میرے ساتھ ہمیشہ بہت بھلا سلوک کیا ہے، اور اس کی بھلائی بڑی دانشمندانہ رہی ہے، بڑی خشک اور غیر پیچیدہ۔ ہوتا یہ ہے کہ آخر میں میں ہمیشہ اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتی ہوں۔ اُن آخری سالوں میں، جب میری زندگی ایک غیر مرئی مرطوب دھند میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی، نونو وہ مشعل ثابت ہوئی جس کی کمزور سی دھیمی روشنی میں میں قدم بڑھانے کے قابل ہو گئی تھی۔ مجھے تو اس ملاقات کے نتائج کا واقعی پر خطر اور دہشت انگیز نکلنا قرین قیاس نظر نہیں آتا تھا، بالکل جس طرح مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ تار کے پہلے چند لفظ پڑھنے کے بعد اس کی یہ تجویز کہ چھری کانٹوں کو تالے میں رکھ دینا چاہیے، ایک مذاق تھا۔ یہ ایک مبالغہ ہے، مجھے خیال آیا۔ نونو میرے ساتھ دل لگی کر رہی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ انجام کار، ٹھیک آخری لمحے، حقیقت میں نونو چھری کانٹوں پر تالا چڑھا دے گی، اور اس کے بعد بھی، جب ہم چھری کانٹوں کو بھول بھال گئے ہوں گے، جب ہم اس پورے معاملے پر بحث کر رہے ہوں گے، اس چیز پر جو چھپائی نہیں جا سکتی، تو اس وقت نونو اپنی کنجیوں سمیت کہیں قریب ہی ہو گی، اپنا بہترین سیاہ ڈریس پہنے ہوئے، اپنی جھریوں، اپنے خاموش، باریک بیں احتیاط کے انداز کے ساتھ۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب وہ لمحہ وارد ہو گا، میں ہر قسم کی انسانی مدد سے دور جا چکی ہوں گی، حتیٰ کہ نونو کی مدد سے بھی دور۔

لیکن یہ سب ''جاننا'' بے مصرف تھا۔ لہٰذا یک لخت میری طبیعت ہلکی ہو گئی ہے، جیسے کوئی چیز مجھے ذرا دھمکا نہ سکتی ہو۔ مجھے یاد ہے، میں نونو سے ہنسی مذاق کر رہی تھی۔ ہم باغ میں بیٹھی آخر خزاں کے تتیوں کی مدہوش بھنبھناہٹ سن رہی تھیں، دبی آواز میں اور دیر تک لیوش اور بچوں کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں، اور میری مرحومہ بہن ولما کے بارے میں۔ ہماری نشست مکان کے آگے تھی، اس کھڑکی کے نیچے جس کے پٹوں کے پیچھے اماں کا پچیس سال پہلے انتقال ہوا تھا۔ ہمارے

سامنے نیبو کے درخت اور والد کے مگس خانے تھے، لیکن یہ سب اب خالی تھے۔ نونو کو شہد کے چھتوں کے درمیان الجھتے پھرنا ناپسند تھا، اور ایک دن ہم نے شہد کی مکھیوں کے کل اٹھارہ جھنڈ بیچ ڈالے تھے۔ یہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ دن نرم اور معتدل تھے۔ وہاں بیٹھے ہوئے، ہم مامونیت کے مانوس احساس کے زیر اثر تھیں، جس سے کچھ کچھ تباہی جھلکتی ہے اور کچھ کچھ ایسی مسرت جس میں خواہش کا دخل نہیں ہوتا۔ چھوڑو بھی، میں نے سوچا، اب بچا ہی کیا ہے جو لیوش غصب کرلے گا؟— چمچے، چھری کانٹے؟ یہ ایک مضحکہ خیز خیال ہے: آخر چند مڑے تڑے چاندی کے چمچوں کی قیمت ہی کیا ہے؟ میں نے حساب لگایا کہ اب لیوش کی عمر پچاس سے اوپر ہوگی، حقیقت میں وہ گرمیوں میں ترپن سال کا ہوگیا ہوگا۔ یہ بعید از قیاس بات ہے کہ کوئی چاندی کے چمچوں سے اس کی مدد کرسکے۔ اگر اس قسم کی چیز سے واقعی مدد ہوسکتی ہو تو ٹھیک ہے، اسے لے جانے دو۔ نونو بھی شاید ایسی ہی کوئی بات سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور اندر چلی گئی، برآمدے میں پہنچ کر مڑکر دیکھا۔

''ہوشیار رہنا، اس کے ساتھ اکیلے میں بہت زیادہ وقت مت گزارنا۔ لاتسی، تبھور، اور چچا اینڈرے کو بھی لنچ پر مدعو کرلینا، ٹھیک جیسے تم ہر پندرھواڑے اتوار کو کرتی ہو، جب تم لوگ اکھٹے ہو کر روحوں سے دل لگی بازی کرتے ہو۔ لیوش ہمیشہ اینڈرے سے خائف رہا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے اس کا کسی چیز کے لیے مقروض ہے۔ یاد ہے، کیا کوئی ایسا بھی ہے جس کا اس پر کچھ نہ نکلتا ہو؟'' وہ بولی اور ہنسنے لگی۔

''وہ سب بھول بھال گئے ہیں،'' میں نے کہا اور خود بھی ہنسنے لگی۔

اے لو، میں ابھی سے اس کی مدافعت کرنے لگی تھی۔ میں کروں بھی تو کیا؟ میں نے اپنی زندگی میں صرف اسی کو چاہا ہے۔

3

تباہی اور فرحت کی خبر لانے والا یہ تار اتوار کو دن کے قریب بارہ بجے آیا تھا۔ لیوش کی آمد سے پہلے کی دوپہر اور شام مجھے دھندلی سی ہی یاد ہے۔ نہیں۔ نونو کی بات صحیح تھی: میں اب

Scanned with CamScanner

لیوش سے خوفزدہ نہیں تھی۔ ہم ان لوگوں سے خوفزدہ ہو سکتے ہیں جنھیں چاہتے ہوں یا جن سے نفرت کرتے ہوں، کسی ایسے سے جو بہت اچھا ہو یا حد درجہ سفاک یا جس نے جان بوجھ کر ہمارے ساتھ دغا کی ہو۔لیکن لیوش میرے ساتھ کبھی ناخوشگواری سے نہیں پیش آیا تھا: ہاں، یہ درست ہے، لیکن وہ بھلا آدمی بھی نہیں تھا، اس مفہوم میں جس میں اسکول کی درسی کتابیں بھلائی کا نقشہ کھینچتی ہیں۔ کیا اس نے میرے ساتھ دغا کی تھی؟ نہیں، مجھے کبھی یہ نہیں لگا کہ اس نے میرے ساتھ دغا کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ وہ جھوٹ بولتا تھا: وہ اس طرح جھوٹ بولتا تھا جس طرح ہوا چیختی چلاتی ہے، ایک فطری توانائی کے ساتھ، بڑی زندہ دلی سے۔ وہ بڑے شاندار جھوٹ بول سکتا تھا۔ مثال کے طور پر، اس نے جھوٹ بولا کہ مجھ سے محبت کرتا ہے، صرف مجھی سے۔ پھر جا کر میری چھوٹی بہن ولما سے شادی کر ڈالی۔ گو بعد میں مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے اس کی باقاعدہ منصوبہ بندی نہیں کی تھی، یہ کوئی پلاٹ یا سازش نہیں تھی، اس میں نیت کا کوئی دخل نہیں تھا: لیوش دانستہ کینہ پرور نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے چاہتا ہے —— اور مجھے اس میں شک نہیں تھا، اور نہ اب ہے، کہ اس کی مراد بھی یہی تھی —— لیکن بس اتفاق سے شادی ولما سے کر ڈالی، شاید اس لیے کہ وہ زیادہ خوبصورت تھی، یا شاید اس دن اتفاقاً ہوا پورب سے چل رہی تھی، یا شاید ولما یہی چاہتی تھی —— لیوش نے کبھی اس کی وجہ نہیں بتائی۔

لیوش کی متوقع آمد سے پہلے کی رات —— مجھے خوب معلوم تھا یہ زندگی میں آخری بار ہوگا —— میں دیر تک جاگتی اور مختلف یادگاروں کو مرتب کرتی رہی، اس کی آمد کی تیاری کرتی رہی، اور سونے سے پہلے اس کے پرانے خط پڑھتی رہی۔ میں آج بھی یہ یقین رکھتی ہوں کہ یہ میری توہم پرستی ہے —— اور اس کے پرانے خط پڑھتے وقت یہ بات مجھے ایک بار پھر بڑی شدت سے محسوس ہوئی —— کہ لیوش کے پاس طاقت کا کوئی مخفی سرچشمہ تھا، کہ وہ بلند پہاڑوں پر نظر آنے والے ان چھوٹے چھوٹے چشموں کی طرح تھا جو بل کھاتے ہوئے بلا مقصد ڈھلانوں سے نیچے اترتے ہیں اور بغیر کوئی نام و نشان چھوڑے، کسی غار کی گہرائیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ کسی نے بھی اس طاقت کو استعمال نہیں کیا، نہ کسی راہ پر ڈالا۔ اب، اس کی آمد سے پہلے کی رات، جب وہ مجھ پر آسیب کی طرح مسلط ہونے والا تھا، اس کے خطوں کو دوبارہ پڑھتے ہوئے مجھے اس بے مدعا توانائی کی

Scanned with CamScanner

پرجوش عملیات پر حیرت ہوئی۔ ہر خط میں مجھے ایسی طاقت کے ساتھ مخاطب کیا تھا جو کسی کو بھی —
خاص طور پر ایک حد درجہ حساس عورت کو — متاثر کرنے کے لیے کافی تھی، حتیٰ کہ اچھی خاصی بھیڑ،
بلکہ ایک پورے جم غفیر کو۔ یہ نہیں کہ اس کے پاس کہنے کو کوئی خاص ''اہم'' بات تھی، اور نہ مجھے اس
کے خیالات میں کسی مخصوص فطری ادبی استعداد کا سراغ ملا: اس کے خطاب و القاب بکھرے
بکھرے سے اور اسلوب غیر منظم تھا— لیکن اس کا انداز، آواز جو تحریر کی ہر سطر میں سنائی دیتی، وہ
بلاشبہ اسی کی اور صرف اسی کی تھی! وہ ہمیشہ صداقت کے بارے میں لکھتا، کسی ایسی متخیلہ صداقت کے
بارے میں جو اسے بس ابھی ابھی محسوس ہوئی تھی اور جسے وہ چاہتا تھا کہ میں فوری جان جاؤں۔

اس نے کبھی اپنے جذبات کے بارے میں نہیں لکھا، حتیٰ کہ اپنے منصوبوں کے بارے میں
بھی نہیں، اس کے برعکس، وہ اس شہر کا نقشہ جہاں قیام ہوتا اتنی وضاحت سے کھینچتا کہ قاری کو فی
الفور وہاں کی سڑکیں اور وہ کمرہ جہاں لیوش بیٹھا یہ خط لکھ رہا تھا، صاف نظر آجاتے، لوگوں کی
آوازیں سنائی دینے لگتیں جنھوں نے گذشتہ دن کوئی برجستہ یا شگفتہ بات کہی ہوتی۔ اس پر مستزاد
اس خیال کا تفصیلی بیان جو فی الوقت اس کی توجہ کا طالب تھا، اور یہ سب اتنے معجزاتی استناد کے
ساتھ کہ ہر چیز اپنی طبعی جسامت سے کہیں زیادہ پرشکوہ اور بارعب نظر آنے لگتی۔ بس بات اتنی تھی
کہ اس میں سے کچھ بھی — اور یہ تو موجودہ بے حس قاری بھی محسوس کرسکتی تھی — سچ نہیں ہوتا تھا،
یا یہ کہ یہ سارے کا سارا سچ تھا لیکن اس طرح نہیں جس طرح لیوش نے لکھا تھا۔ اس کا بیانِ شہر اتنا
ہی حرف بہ حرف درست تھا جتنا کسی جغرافیائی نقشہ نگار کا، لیکن یہ ایک نقرئی شہر تھا، خالص شیخ چلی کا
گھر۔ وہ اس نقلی سچ کو زندگی بخشنے میں غیر معمولی توجہ اور احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اور لوگوں اور
منظروں کے ساتھ بھی یہی طرز عمل تھا۔ ہر چیز کو جزئیات پر زیادہ سے زیادہ توجہ کے ساتھ بیان کیا
جاتا تھا۔

میں نے خطوں کو پڑھا اور متاثر ہوئی۔ شاید — اور یہ ممکن بھی ہے — کہ ہم لیوش کی نسبت
بہت ناتواں تھے۔ آدھی رات کے قریب ایک بڑی تند و تیز گرم ہوا مکان کے گرد چلنے لگی۔ میں
بستر سے نکلی اور کھڑکیاں بند کردیں۔ میں اپنی نسوانی کمزوری کی عذرخواہی نہیں کرنا چاہتی، میرے
پاس اس کے لیے وقت نہیں بچا ہے، سچ مچ، لیکن اس رات میں اس مستطیل آئینے کے سامنے جا

Scanned with CamScanner

کھڑی ہوئی جو میری والدہ کی سنگھار میز کے اوپر لٹکا ہوتا تھا، اور اپنا تفصیلی جائزہ لیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ابھی بوڑھی نہیں ہوئی ہوں۔ اسے قسمت کی کوئی خاص ادا کہہ لیجیے، بیس سالوں میں مجھ پر عمر کا بہت زیادہ اثر نہیں ہوا تھا: ماہ و سال مجھ پر اپنے بہت کم آثار چھوڑ گئے تھے۔ میں غیر جاذب نظر تو کبھی نہیں تھی، لیکن میری خوبصورتی ایسی نہیں تھی جس کے پیچھے مرد دوڑتے پھرتے ہیں۔ میں ان میں احترام اور ایک نوع کی منمناتی ہوئی مردہ دلی کو ہوا دیتی تھی۔ باغبانی کی مصروفیت اور ممکن ہے خود اپنی جسمانی ساخت کے طفیل مجھ پر چربی نہیں چڑھی تھی: میں دراز و سَی قد تھی اور میرا جسم متناسب تھا۔ اب چند بال سفید ہو گئے تھے لیکن وہ بقیہ بالوں کے ہلکے سنہری رنگ میں، جو میرا سب سے نمایاں وصف ہے، بمشکل نظر آتے تھے۔ وقت نے میری آنکھوں اور منہ کے گرد چند بے حد باریک اور نازک لکیریں کھینچ دی تھیں، اور میرے ہاتھ بھی اب پہلے جیسے نہیں رہے تھے کیونکہ گھر کے کام کاج کے باعث ان میں قدرے سختی اور کھردراپن آ گیا تھا۔ اس کے باوجود جب میں نے آئینے میں دیکھا تو مجھے وہ عورت نظر آئی جو اپنے عاشق کا انتظار کر رہی ہو۔ یہ، ظاہر ہے، ایک مضحکہ خیز خیال تھا جو یونہی بیٹھے بٹھائے آ گیا تھا۔ میں پینتالیس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ لیوش کسی اور کے ساتھ رہ رہا تھا، ہو سکتا ہے اس نے شادی بھی کر لی ہو۔ برس ہا برس سے مجھے اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی۔ کبھی کبھار مجھے اس کا نام اخباروں میں نظر آ جاتا تھا، ایک بار کسی سیاسی فضیحتے کے ضمن میں۔ اگر کسی دن لیوش مشہور، یا بے شک بدنام ہی ہو جاتا تو مجھے اس پر کوئی تعجب نہ ہوتا۔ لیکن وہ فضیحتہ جلد ہی دب دبا گیا۔ ایک اور بار میں نے پڑھا کہ اس نے کسی بیرکوں کے پچھواڑے کسی کے ساتھ ڈوئل لڑا تھا، ہوا میں گولی چلائی تھی اور زخمی نہیں ہوا تھا! یہ سب عین اس کے کردار کے مطابق تھا، ڈوئل لڑنا بھی اور اس کا زخمی نہ ہونا بھی۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کبھی بیمار بھی پڑا ہو۔ اس کی قسمت کہیں اور تھی، مجھے خیال آیا۔ پھر میں واپس بستر پر آ گئی، اپنے خطوں اور اپنی گزری ہوئی جوانی کی کھٹی میٹھی یادوں کو لے کر۔

اگر میں یہ کہوں کہ میں ان گھڑیوں میں خود کو خاص طور پر بدقسمت محسوس کر رہی تھی تو یہ جھوٹ ہوگا۔ ہاں، بیس بائیس سال پہلے ایسا وقت ضرور تھا جب میں بدقسمت تھی۔ لیکن یہ احساس رفتہ رفتہ زائل ہو گیا، اور زخم پر کھرنڈ جم گئی۔ یہ ایک نامانوس طاقت تھی جس نے مجھے درد کی جولانی کو دبانے

کا اہل بنا دیا۔ ایسے زخم بھی ہوتے ہیں جنھیں وقت مندمل نہیں کر پاتا۔ مجھے پتا تھا کہ میرا زخم مندمل نہیں ہوا ہے۔ ہماری 'جدائی' کے چند ہی سال بعد لیوش کے اور میرے درمیان جو کچھ پیش آیا تھا —— اس کو بیان کرنے کے لیے مناسب لفظوں کا ملنا مشکل ہے —— وہ ایک ناقابلِ برداشت، اچانک، طبعی اور سادہ سی چیز بن گیا۔ مجھے اب اور کسی چیز کی حاجت نہیں رہی تھی: مجھے مدد طلب کرنے کی، پولیس یا ڈاکٹر یا پادری کو بلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح میں زندگی گزارتی رہی۔ بالآخر احباب کا حلقہ بن گیا، لوگ جنھوں نے یقین دلایا کہ انھیں میری ضرورت ہے۔ دو ایک نے تو شادی کا پیغام بھی دیا: تیبور، جو عمر میں مجھ سے چند سال چھوٹا تھا، اور ایندرے، جسے صرف نونو ہی مودبانہ ''مسٹر ایندرے'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے، حالانکہ وہ لیوش سے عمر میں ایک دن بھی بڑا نہیں ہے۔ کسی نہ کسی طرح میں اس کھیل یا حادثے سے کافی خوش اسلوبی کے ساتھ گزر ہی لی۔ مجھ سے شادی کے خواہاں افراد میرے اچھے دوست رہے۔ اس رات میں نے اس پر بھی غور کیا کہ زندگی معجزاتی طور پر مجھ پر میری توقع سے زیادہ مہربان رہی تھی۔

4

نصف شب گزر چکی ہوگی کہ نونو میرے کمرے میں آئی۔ ہمارا گھر ابھی تک بجلی کی روشنی سے محروم ہے —— ماما کے پاس اس ایجاد کے لیے وقت نہیں تھا، اور ان کی وفات کے بعد ہم خرچ کے باعث اسے ملتوی کرتے رہے —— چنانچہ نونو کا کمرے میں داخل ہونا کسی قدر ڈرامائیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس موقعے پر بھی وہ ہاتھ میں ٹمٹماتی موم بتی لیے کھڑی تھی، اس کے سفید بال ہر طرف کھڑے تھے، نائٹ گاؤن پہنے ہوئے، کسی نیم شبی خیالی پیکر کی طرح۔ ''لیڈی میکبیتھ،'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہاں آؤ اور بیٹھو۔'' مجھے معلوم تھا کہ وہ اس رات میری ٹن گن لینے ضرور آئے گی۔

نونو خاندان کی وہ فرد ہے جو گھر میں تمام دوسرے خاندان کے افراد کی 'قائم مقام' ہے۔ وہ تیس سال پہلے وارد ہوئی تھی، اس خانہ بدوشانہ عمل کا جز جس میں خاندان دنیا بھر میں اسطوری پیکروں کی طرح چکراتے پھرتے ہیں: وہ کسی باستانی ماضی سے آئی تھی، پرنانیوں اور پرنواسیوں

کے کسی نسبی پارچے کا حصہ، صرف چند ہفتوں کے لیے۔ پھر اس لیے رہ گئی کہ اس کی ضرورت تھی۔ اور اس کے بعد اس لیے کہ گھر میں اس کے علاوہ سبھی مر کھپ گئے۔ سویوں نونو قرن بہ قرن اور درجہ بہ درجہ خاندانی نظامِ مراتب کی سیڑھیاں چڑھتی گئی، تا آنکہ اس نے نانی کی جگہ لے لی، بالائی منزل کے کمرے میں منتقل ہو گئی اور ان کے دائرۂ اختیار کی وارث ہوئی۔ پھر ماما چل بسیں اور اس کے بعد وِلما بھی۔ ایک دن آیا جب نونو نے دیکھا کہ وہ اب کسی کی 'قائم مقام' نہیں رہی؛ وہ جو نووارد تھی——وہ جو باقیات میں سے تھی——اب خود اکیلی ہی پورا خاندان تھی۔

اس پیچیدہ کیریئر کے کامیاب انجام نے اس کا سر نہیں پھرایا۔ نونو کو میری 'ماں' بننے کی کوئی تمنا نہیں تھی، اور نہ ہی اس نے میری خاطر محافظ فرشتہ ہونے کا روپ بھرا۔ جوں جوں سال گزرتے گئے، وہ اور زیادہ کم گو اور باہوش ہوتی گئی، اتنی روکھی پھیکی اور سفاک باہوش کہ یوں لگتا تھا جیسے اس کے تجربے میں ہر وہ چیز آ چکی ہے جو زندگی پیش کرنے کے قابل ہے، اتنی ٹھوس اور جذبے سے عاری گویا ساز و سامان ہی کا ایک حصہ ہو۔ لاتسی نے ایک بار کہا کہ نونو کی وضع کسی روغنی چیز جیسی ہے، کسی پرانی اخروٹ کی لکڑی کی الماری کی طرح۔ سردی گرمی اس کا لباس ہمیشہ ایک جیسا ہی ہوتا، کسی ہموار سے کپڑے کا ڈریس جو نہ ریشم تھا نہ ہی تافتہ (taffeta)، جو نہ صرف اجنبیوں کو بلکہ خود مجھے بھی کچھ زیادہ ہی آرائشی معلوم ہوتا۔ قریبی سالوں میں وہ صرف اتنا ہی بولتی جتنا ضروری ہوتا، اس سے زیادہ نہیں۔ اس نے اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ وہ میرے ہر خیال، میری ہر فکر میں شرکت کرنا چاہتی تھی، لیکن یہ حجت بیکار تھی، اور جب اس نے کچھ کہا بھی تو کچھ اس طرح جیسے ہم مہینوں سے ایک ہی موضوع کے بارے میں بحث کرتے آ رہے ہوں، اور وہ بھی بڑی آتش مزاجی اور نہایت جوش و خروش سے، اور وہ بس ایک مختصر سے جملے کے ساتھ بڑی قطعیت سے اس بحث کو موقوف کر رہی ہو۔ اور اس وقت بھی اس نے میرے بستر پر بیٹھتے ہوئے اسی انداز سے بات کی۔

''تم نے انگوٹھی دِکھوالی ہے؟''

میں ایک دم اٹھ بیٹھی اور اپنی کنپٹیاں رگڑنے لگی۔ مجھے معلوم تھا وہ کیا سوچ رہی ہے؛ اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ درست کہہ رہی ہے: ہم نے کبھی اس کی بابت گفتگو نہیں کی تھی، ہو سکتا ہے

Scanned with CamScanner

میں نے انگوٹھی اسے کبھی دکھائی ہی نہ ہو، اس کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ اس کی بات درست ہی ہوگی، یعنی یہ کہ انگوٹھی نقلی ہی نکلے گی۔ اتنا اندازہ تو میں نے لگالیا تھا۔ نونو اسی طرح پر اسرار تھی۔ اس نے انگوٹھی کی بابت کب سنا ہوگا؟ میں حیرت سے سوچنے لگی، پھر اس سوال کو ایک طرف ڈال دیا، کیونکہ یہ بالکل قدرتی تھا کہ نونو ہر اس بات سے واقف ہو جس کا تعلق اس گھر سے تھا، اس خاندان سے، میری ذات سے، بے شک میری زندگی سے، بشمول ان تمام چیزوں کے جو میری مرحومہ بہن نے تہہ خانے یا بالا خانے میں چھپا رکھی تھیں۔ تو، ظاہر ہے، اسے انگوٹھی کے بارے میں بھی معلوم ہوگا۔ میں انگوٹھی کا قصہ تقریباً بھول چکی تھی، کیونکہ اس کی بابت سوچنا تکلیف دہ تھا۔ ولما کی موت کے بعد لیوش نے یہ انگوٹھی، جو نانی کا زیور تھی، مجھے دے دی تھی۔ پلاٹینم میں جڑا یہ درمیانہ جسامت کا ہیرا میرے گھرانے کی واحد قیمتی چیز تھا۔ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ یہ کیسے ہماری ملکیت میں رہا — والد بھی انگوٹھی کی قدر کرتے تھے، اسے تو ہم پرستانہ ہیبت سے دیکھتے اور اس کی بڑی دیکھ ریکھ کرتے، حالانکہ ان کا ہاتھ اراضی اور دیگر قیمتی اشیا کے معاملے میں خاصا کھلا واقع ہوا تھا۔ اپنی حیثیت میں یہ ان مشہور و معروف جواہرات کی طرح تھا جو شاہی ذخیروں میں ہوتے ہیں، جیسے کوہِ نور، اس قسم کے بیش قیمت جواہرات جن کا ذکر فہرستوں میں آتا ہے، جن کی موجودہ قیمت پر توجہ نہیں دی جاتی اور جن کی قسمت میں شاہی خاندانوں کی رسمی برسیوں کے موقعے پر جگمگانا ہوتا ہے، خاندان کے کسی ممتاز فرد کی انگلی پر یا کسی ملکہ کی پیشانی پر۔ سو اس طرح ہماری چار پشتوں نے اس کی حفاظت کی تھی، 'انگوٹھی' کی۔ مجھے اس میں جڑے نگینے کی صحیح قیمت کا کبھی علم نہیں ہوا تھا۔ کچھ بھی سہی، بیچا جاتا تو اچھی خاصی قیمت پر بکتا، لیکن اب اتنی شاہانہ قیمت پر بھی نہیں جو ہمارے خاندانی آثار کا حصہ تھی۔ یہ نانی سے ہو کر ماما تک پہنچی، اور ہماری والدہ کی وفات پر ولما کو ملی۔ جب ولما کی موت واقع ہوئی تو لیوش کافی جذباتی ہو گیا اور رقت کے ایک غیر معمولی شدید لمحے میں مجھے دے ڈالی۔

مجھے وہ منظر یاد رہے گا۔ ولما کو سہ پہر کے وقت، دفنایا گیا تھا۔ جب ہم تجہیز و تکفین سے لوٹے تو میں نڈھال ہو کر اپنے تاریک کمرے میں دیوان پر ڈھیر ہو گئی۔ لیوش داخل ہوا، سرتاپا سیاہ کپڑوں میں ملبوس، اس نے تجہیز و تکفین کے موقعے پر لباس اتنی احتیاط سے پہنا تھا گویا پریڈ کے

موقعے کا کوئی سپاہی ہو —— مجھے یاد آتا ہے کہ اس نے اس موقعے کے لیے خاص سیاہ رنگ کے بٹن بھی بنوائے تھے —— اور چند گمبھیر لفظوں کے ساتھ انگوٹھی میرے حوالے کر دی۔ میں اتنی خستہ حال اور پراگندہ خاطر تھی کہ مجھے کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور اسے دیوان کے برابر کی میز پر انگوٹھی رکھتے ہوئے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی، اور نہ میں نے بعد میں جب اس نے میری یاددہانی کرائی اور خود ہی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی تو کوئی اعتراض کیا۔ ''انگوٹھی تمھیں ملنی چاہیے،'' اس نے بڑی متانت سے اعلان کیا۔ بعد میں میرے ہوش وحواس ٹھکانے آئے۔ ظاہری بات ہے، انگوٹھی کی حقدار اَیوا تھی: یہ میری مرحومہ بہن کی بیٹی کی ملکیت تھی، بالکل۔ لیکن لیوش نے میرے استدلال کے خلاف بڑی انوکھی حجت ڈھونڈ نکالی۔ بولا کہ اس قسم کی انگوٹھی کوئی خاندانی ورثہ نہیں ہوا کرتی، بلکہ یہ تو ایک علامت ہے، خاندانی نظامِ مراتب کی علامت۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ والدہ اور ولما دونوں کی وفات کے بعد یہ مجھ تک پہنچے کیونکہ عمر میں مَیں ہی سب سے بڑی عورت ہوں۔ سو بات یوں یکسو ہوئی۔

میں کچھ نہ بولی اور انگوٹھی اٹھا کر کہیں رکھ دی۔ ظاہر ہے یہ میری نیت کبھی نہیں رہی تھی، ایک لمحے کے لیے بھی نہیں، کہ کسی موروثی چیز کی مالک بنوں۔ میرا ضمیر اور وہ خط جو میں نے وصیت نامے کے طور پر لکھ رکھا ہے —— یہ سائیڈ بورڈ میں انگوٹھی اور زیرجاموں کے برابر رکھا ہوا ہے —— دونوں اس کے شاہد ہیں کہ میں نے انگوٹھی ایوا کے لیے سنبھال رکھی ہے اور اس کا انتظام کر لیا ہے کہ یہ اسے میرے مرنے پر دے دی جائے۔ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ انگوٹھی ولما کی بیٹی کو منگنی پر یا اگر وہ شادی کرے تو اس موقعے پر بھیج دوں گی۔ یہ خط، جس کا تعلق میری چند واجبی سی املاک سے ہے، واضح طور پر ولما کی اولاد کو ان کا وارث مقرر کرتا ہے، صرف اس شرط پر کہ جب تک نونو حیات ہے وہ مکان اور باغ کو نہیں بیچیں گے۔ (کسی وجہ سے میں یہ سوچے بیٹھی تھی کہ نونو ابھی اور بہت برسوں تک زندہ رہے گی، اور کیوں نہیں؟ اس کے پاس مرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، بالکل جس طرح اس کے پاس زندہ رہنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے! بہرحال، یہ احساس کہ وہ میرے بعد بھی زندہ رہے گی، بیک وقت جذبات انگیز اور اطمینان بخش ہے۔) انگوٹھی میں نے اٹھا کر یوں رکھ دی کہ میں لیوش سے بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اور اس لیے بھی کہ اس واجبی سے زیور کا، جو ہماری حالت کو

دیکھتے ہوئے پھر بھی کسی نہ کسی کے کام آ سکتا تھا — میرے خیال میں اتنی رقم تو دلا ہی سکتا تھا جس سے کسی نوجوان عورت کے جہیز کا انتظام ہو جائے — میرے پاس رہنا اس سے بہتر تھا کہ اس اٹمبار میں کہیں کھو جائے جو لیوش کے گرد بالکل قدرتی طور پر جمع ہو جاتا تھا، وہ اٹمبار جس میں سازگار آب و ہوا میسر آنے پر سبزۂ بیگانہ کی طرح خوب اضافہ ہو جاتا تھا۔ وہ اسے بیچ دے گا، مجھے خیال آیا، یا تاش کے کھیل میں ہار جائے گا، اور میں اس کی پیشکش سے کافی متاثر ہوئی۔ اور ٹھیک اسی لمحے — خدا مجھے راست گو رہنے کی ہمت دے اور اس میں میری مدد کرے — جب ہم نے میری بہن کے تابوت کو بس ابھی قبر میں اتارا ہی تھا، میں نے آرزو کی تھی کہ لیوش اور بچوں کی، اور، ظاہر ہے، خود میری زندگی میں بھی نظم و ضبط آ جائے۔ انگوٹھی کی اب اہمیت نہیں رہی تھی، اہمیت تو پوری صورت حال کی تھی۔ چنانچہ میں نے انگوٹھی اٹھا کر رکھ دی۔ اور اس طرح جب ہم جدا ہوئے تو میں اسے اپنے وصیت نامے کے ساتھ لیتی آئی اور اپنی دیگر یادگاری چیزوں میں اسے وصیت نامے کے ساتھ چھپا کر رکھ دیا۔

دریں اثنا، ان برسوں میں جب لیوش کی ایک جھلک بھی نظر نہ آئی، میں نے ایک بار بھی انگوٹھی کی طرف نہ دیکھا، کیونکہ مجھے پورا یقین تھا، جس طرح ایک خواب خرام کو ہوتا ہے، کہ انگوٹھی نقلی ہوگی۔

''مجھے پورا یقین تھا۔'' یہ کیسی عجیب بات کہہ دی میں نے! میں نے تو انگوٹھی کو کبھی ہاتھ میں بھی نہیں لیا تھا۔ میں اس سے خوفزدہ تھی۔ مجھے اس آگہی سے خوف آتا تھا جسے میں کبھی لفظوں میں نہ اتار سکی تھی۔ خواہی نہ خواہی مجھے علم تھا کہ ہر وہ چیز جسے لیوش نے ہاتھ لگایا ہو، اپنی اصلی وقعت اور معنی کھو بیٹھتی ہے، اپنے اجزا میں بکھر جاتی ہے، ان پاکیزہ دھاتوں کی طرح بدل جاتی ہے جنھیں بس کیمیاگر کی خمیدہ نلکیوں میں آنے کی دیر ہو۔ میں یہ ماننے سے باز نہیں رہ سکتی تھی کہ لیوش نہ صرف دھاتوں اور نگینوں کی کایا کلپ پر قادر تھا بلکہ وہ تو کھرے لوگوں تک کو نقلی لوگوں میں بدل سکتا تھا۔ میں یہ جانے بغیر کیسے رہ سکتی تھی کہ ایک بار جب لیوش کا ہاتھ اس پر لگ گیا ہو تو انگوٹھی ایک معصوم شے کیسے رہ سکتی ہے۔ ولما ایک طویل عرصے بیمار رہی اور گھر کے سارے کام کاج پر نظر رکھنے سے معذور، چنانچہ سارا گھر کھلے بندوں لیوش کے تصرف میں آ گیا تھا اور اس نے انگوٹھی پر قبضہ کر لیا

ہوگا۔ بس، نونو کے کہنے کی دیر تھی اور مجھے یقین ہوگیا کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ لیوش نے انگوٹھی کے معاملے میں مجھے جُل دیا تھا، جس طرح تمام دوسری چیزوں کے معاملے میں دیا تھا۔ میں اچک کر بستر میں بیٹھ گئی، بالکل زرد۔

''کیا تم نے اسے دِکھوایا تھا؟''

''ہاں،'' نونو سکون سے بولی۔ ''ایک بار جب تم گھر نہیں تھیں اور چابیاں میرے پاس چھوڑ گئی تھیں، میں اسے جوہری کو دکھانے لے گئی تھی۔ اس نے تو نگینے کا گھاٹ بھی بدلوا ڈالا ہے۔ قبضے میں کوئی سفید سی دھات لگوا دی ہے۔ لوہا، پلاٹینم سے کم قیمتی ہوتا ہے۔ سفید سونا ہے، جوہری کہہ رہا تھا۔ اور اس نے نگینہ بھی بدلوا دیا ہے۔ جس انگوٹھی کی تم برسوں سے اتنی حفاظت کرتی رہی ہو اس کی قیمت پانچ کروئٹزر بھی نہیں۔''

''یہ صحیح نہیں،'' میں نے کہا۔

''ہوش میں آؤ، ایستھر!'' اس نے میری سرزنش کی۔

میں موم بتی کی لو کو دیکھنے لگی اور کچھ نہ بولی۔ بالکل، اگر نونو کہہ رہی ہے تو یہ لامحالہ صحیح ہوگا۔ اور مجھے یہ جتانے کی کیا ضرورت ہے کہ خود میں ایک طویل عرصے تک اس پر یہی شبہ کرتی رہی ہوں، ٹھیک اس لمحے سے جب لیوش نے انگوٹھی مجھے دی تھی۔ نقلی، میں نے کھڑے کھڑے فیصلہ کر ڈالا تھا۔ ہر چیز اس کے چھوتے ہی نقلی بن جاتی ہے۔ اور اس کا سانس طاعون کی طرح ہے، مجھے خیال گزرا۔ میں نے اپنا ہاتھ بھینچ کر مٹھی بنائی۔ یہ انگوٹھی کے باعث نہیں تھا — میں عمر کے جس حصے میں ہوں اس میں ایک انگوٹھی کی، بلکہ لاتعداد انگوٹھیوں کی بھی، کیا اہمیت ہے؟ اس کی چھوئی ہوئی ہر چیز جعلی ہے، میں نے سوچا۔ اور پھر مجھے ایک اور ہی خیال آیا، اور میں نے اسے اونچی آواز میں ادا کیا:

''کیا انگوٹھی کی پیشکش ایک سوچا سمجھا فعل تھا؟ کیا اس لیے کہ اسے یہ خوف دامنگیر تھا کہ بعد میں بچے یا کوئی اور اس کا پیچھا کریں گے — اور چونکہ انگوٹھی بہر کیف ایک نقل تھی، اس نے یہ مجھے اس لیے دے دی کہ انھیں اس کا پتا چل جائے، اور جب معلوم ہو کہ یہ نقلی ہے تو وہ اس کا الزام مجھے دیں؟''

میں بآواز سوچ رہی تھی، جیسا کہ ہمیشہ نونو کی رفاقت میں کیا کرتی تھی۔ اگر کوئی لیوش کو سمجھا تھا

نو وہ یہ زنِ فرتوت نونو ہی تھی، جو اسے اندر باہر سے خوب جانتی تھی اور اس کے تمام خیالات کو پڑھ سکتی تھی، ان خیالات کو بھی جنھیں سوچنے کی وہ ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نونو ہمیشہ انصاف سے کام لیتی تھی۔ اس نے اپنے معمول کے مطابق جواب دیا، نرمی سے اور بنا بات کا بتنگڑ بنائے۔

''پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تو بڑی ذلیل حرکت ہوئی۔ لیوش اتنا چالباز تو نہیں تھا۔ اس نے کبھی کوئی مجرمانہ فعل نہیں کیا۔ پھر وہ تمھارا دلدادہ بھی تھا۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ تمھارے نام پر بٹا لگانے کے لیے انگوٹھی استعمال کرتا۔ بس یہ اسے اس لیے بیچنی پڑ گئی ہوگی کہ پیسوں کی ضرورت ہو گی، لیکن اعتراف کی ہمت نہیں ہوئی ہوگی کہ بیچ دی ہے۔ سو اس نے اس کی نقل بنوا لی۔ اور وہ دو کوڑی کی نقل تمھارے حوالے کر دی۔ کیوں؟ کیا یہ جانی بوجھی حرکت تھی؟ کیا یہ دھوکے بازی تھی؟ ہو سکتا ہے کہ وہ بس فیاضی دکھانا چاہتا ہو۔ وہ اتنا عجیب لمحہ تھا، سب وِلما کی تجہیز و تکفین سے ابھی ابھی لوٹے تھے، اور اس کا پہلا فیاضانہ عمل یہ تھا کہ خاندان کا تنہا قیمتی ورثہ تمھارے سپرد کر دے۔ تمھارے اس شاندار لمحے کا ذکر کرتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ بعد میں میں نے اسی لیے اسے دکھوالیا تھا۔ یہ جعلی ہے۔''

''جعلی،'' اس نے میکانکی انداز میں دہرایا، اتنے زیادہ سپاٹ لہجے میں جو ہو سکتا ہو۔

''تو بتانے میں اتنے انتظار کی کیا ضرورت تھی؟'' میں نے پوچھا۔

نونو نے بالوں کی چند سفید لٹیں اپنی پیشانی سے جھٹک کر ہٹائیں۔

''تم سے ہر بات فوراً کہہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی،'' اس نے تقریباً نرمی سے کہا۔ ''لیوش کی بابت تمھیں پہلی ہی کافی بری خبریں مل چکی تھیں۔''

میں بستر سے نکل آئی، سائیڈ بورڈ کی طرف گئی، اور خفیہ دراز میں سے انگوٹھی ڈھونڈ کر نکالی، دریں اثنا نونو موم بتی کی لہراتی لو کی روشنی سے مدد پہنچاتی رہی۔ انگوٹھی پا کر میں نے اسے جوت کے سامنے کیا اور اس کا بڑی باریکی سے معائنہ کیا — میں جواہرات کے بارے میں بالکل نابلد ہوں۔

''آئینہ کھرچ کر دیکھو،'' نونو نے مشورہ دیا۔

لیکن ہیرا شیشے پر کوئی خراش نہ ڈال سکا۔ میں نے انگوٹھی پہن لی اور اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ہیرا ایک سرد سی خالی روشنی کے ساتھ جگمگاتا رہا۔ یہ ایک بے مثال نقل تھی، کسی ماہرِ فن کی بنائی

Scanned with CamScanner

ہوئی۔

ہم دونوں پلنگ کے کنارے پر بیٹھی انگوٹھی کو تکتی رہیں۔ پھر نونو نے مجھے بوسہ دیا، آہ بھری، اور مزید کچھ کہے بغیر رخصت ہوئی۔ میں وہیں بیٹھی دیر تک اس نقلی ہیرے کو دیکھتی رہی۔ ابھی تو لیوش یہاں پہنچا بھی نہیں ہے، مجھے خیال آیا، لیکن اس نے پہلے ہی ایک چیز مجھ سے چھین لی ہے۔۔ لگتا ہے وہ بس یہی کر سکتا ہے۔ یوں ہی ہے، اس کی تعمیر میں ہی یہ داخل ہے۔ لیکن کیسی بھیانک تعمیر ہے، میں نے سوچا اور مجھ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سو اس طرح میں نیند سے ہم آغوش ہو گئی، ایسے کہ سارے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے، نقلی انگوٹھی انگلی میں پہنے ہوئے تھی، ہوش وحواس ماؤف تھے۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جس نے کمرے کی گھٹی گھٹی فضا میں بڑا وقت گزارا ہو، پھر صداقت کی بے رحم کاٹ دار ہوا کے جھکڑ کو اپنے چاروں طرف چنگھاڑتے پا کر اسے چکر آنے لگیں۔

5

لیوش جس روز ہمارے پاس آیا وہ اتفاق سے ستمبر کے آخر کا اتوار تھا۔ یہ ایک شاندار معتدل دن تھا جس کے رنگ شیشے کی طرح شفاف اور واضح تھے۔ ایک جالا درختوں کے درمیان اڑتا پھر رہا تھا، فضا جگمگاتی ہوئی شفاف تھی اور کہیں دھند کا نام ونشان تک نہ تھا، ہر چیز پر ایک پتلے شفاف محلول نے مینا کی مہین ترین تہہ چڑھا دی تھی، یوں جیسے تمام مرئی چیزوں پر، جن میں خود آسمان بھی شامل تھا، نازک ترین موقلم پھیرا گیا ہو۔ میں سویرے سویرے باغ میں گئی اور گلدان کے لیے ڈالیا کے تین پھول چنے۔ ہمارا باغ بہت زیادہ بڑا تو نہیں ہے، تاہم یہ ہمارے مکان کے گرد پوری طرح سے احاطہ کیے ہوئے ہے۔ شاید ابھی آٹھ نہیں بجے تھے۔ میں اوس میں کھڑی ہوئی تھی، عمیق خاموشی میں، کہ مجھے برآمدے میں گفتگو کی آواز سنائی دی۔ میں اپنے بھائی اور عمبور کی آوازیں پہچان گئی۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے، اور صبح کے سناٹے میں ہر لفظ اتنی وضاحت سے گونج رہا تھا جیسے کسی غیر مرئی لاؤڈ اسپیکر سے نکل رہا ہو۔

شروع کے چند لمحوں میں میں نے مداخلت کر کے انھیں متنبہ کر دینا چاہا ہوتا کہ مجھے سب کچھ

Scanned with CamScanner

سنائی دے رہا ہے، کہ وہ وہاں تنہا نہیں ہیں۔ لیکن ان کے پہلے جملے نے ہی، جو بڑی دھیمی آواز میں ادا ہوا تھا، مجھے خاموش کر دیا۔ لاتسی، میرا بھائی، پوچھ رہا تھا:

''تم نے ایسھر سے کیوں شادی نہیں کی؟''

''کیونکہ میں اسے قبول نہ تھا،'' اس نے جواب دیا۔

میں تیمور کی آواز پہچانتی تھی، اور میرا دل میرے سینے میں زور زور سے دھڑ دھڑانے لگا۔ ہاں، یہ تیمور ہی تھا، اس کی دھیمی، پرسکون آواز، اور اس کا لطف و کرم اور ہلکی سی اداسی کا حامل ہر لفظ سچ تھا اور صبر اور غیر جذباتی انداز میں ادا ہو رہا تھا۔

لاتسی ایسی باتیں کیوں پوچھتا ہے؟ میں نے جھنک اور اضطراب کے ساتھ سوچا۔ میرے بھائی کے سوالوں میں ہمیشہ الزام دہی کا رنگ ہوتا ہے، یہ سوال جارحانہ اور ضرورت سے زیادہ نجی لگتے ہیں۔ لاتسی کو ہر قسم کے رازوں سے نفرت ہے۔ لیکن لوگ اپنے رازوں کے دلدادہ ہوتے ہیں۔ کیا تیمور کی جگہ کوئی اور آدمی ہوتا تو اس نے گول مول جواب دیا ہوتا یا اپنے نجی معاملات میں مداخلت کرنے پر احتجاج کیا ہوتا؟ اس نے نرمی سے جواب دیا، جو اتنا ہی ایماندارانہ اور درست تھا جیسے کسی نے اس سے ریل گاڑی کی آمدورفت کی بابت سوال پوچھا ہو۔

''اس نے تمھیں کیوں قبول نہیں کیا؟'' میرے بھائی نے اسے دق کیا۔

''کیونکہ اسے کسی اور سے محبت تھی۔''

''کس سے؟'' سپاٹ، سفاک سوال وارد ہوا۔

''لیوش سے۔''

پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ مجھے تیلی کے رگڑنے کی آواز سنائی دی، ان میں سے ایک سگریٹ روشن کر رہا تھا۔ اتنی شدید خاموشی تھی کہ میں تیمور کے پھونک مار کر تیلی بجھانے کی آواز بھی سن سکتی تھی۔ وہ سوال جس کی میں پیش بینی کر رہی تھی عین صحیح موقعے پر پہنچا، جس طرح بجلی چمکنے کے بعد گرج۔ سوال لاتسی کر رہا تھا۔

''تمھیں معلوم ہے وہ آج یہاں آ رہا ہے؟''

''مجھے معلوم ہے۔''

Scanned with CamScanner

''وہ کیا چاہتا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا تمھارے اس پر کچھ پیسے نکلتے ہیں؟''

''جا۔ نے دو،'' ایک ہچکچاتی آواز نے جواب دیا۔ ''اس بات کو ایک زمانہ ہو گیا ہے۔ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔''

''وہ میرا مقروض ہے،'' لاتسی نے بچکانہ فخر مندی سے اعلان کیا، جیسے یہ کوئی شیخی مارنے کا قابل بات ہو۔ ''اس نے والد کی طلائی گھڑی بھی عاریتاً لی تھی۔ مجھ سے ہفتے بھر کے لیے مانگی تھی۔ اس کو دس سال ہو گئے۔ نہیں، ٹھہرو، بارہ سال۔ اس نے ابھی تک نہیں لوٹائی۔ ایک اور موقعے پر وہ انسائیکلوپیڈیا کا پورا سیٹ لے گیا تھا۔ عاریتاً۔ پھر وہ مجھے دوبارہ کبھی نظر نہ آئی۔ اس نے مجھ سے تین سو کرونا بھی مانگے تھے۔ لیکن یہ میں نے اسے نہیں دیے،'' آواز نے کہا، اسی بچکانہ خود اطمینانی سے۔

اور دوسری زیادہ گہری، زیادہ خاموش، زیادہ ہموار آواز نے قدرے بے ادعا انداز میں جواب دیا، ''اگر دے دیتے تو تباہی نہ آ جاتی۔''

''اچھا؟'' لاتسی نے اچانک نادم ہو کر پوچھا۔

میں پھولوں کے تختوں کے درمیان کھڑی تھی اور جب وہ چکرا کر مسکرایا تو میں اس کے غم زدہ بچکانہ چہرے پر سرخی دوڑتے ہوئے تقریباً دیکھ سکتی تھی۔ ''تمھارا کیا خیال ہے؟ وہ اب بھی ایسٹھر کو چاہتا ہے؟''

اس کا جواب پانے کے لیے اسے کافی دیر انتظار کرنا پڑا۔ میں نے واقعی خود کچھ کہنا چاہا ہوتا، لیکن اب وقت نکل چکا تھا۔ یہ ایک مضحکہ خیز صورت حال تھی۔ یہ میں تھی، یہاں، تنہا، ڈھلتی عمر والی، کسی پرانے طرز کی نظم کی ہیروئن کی طرح اپنے باغ میں پھولوں سے گھری ہوئی، ٹھیک اس صبح جب میں اُس کی آمد کی منتظر تھی، اسی آدمی کی جس نے مجھے فریب دیا اور لوٹ لیا تھا، یہیں، اسی گھر میں جہاں یہ سب ہوا تھا اور جہاں میں نے اپنی ساری زندگی گزاری تھی، جہاں سائیڈ بورڈ میں مَیں نے ولما اور لیوش کے خطوط اس انگوٹھی کے ساتھ رکھے تھے جس کی بابت میں یقین سے جانتی تھی، کم از کم گذشتہ رات سے — گو اس سے پہلے میں نے شک ضرور کیا تھا — کہ یہ نقلی ہے، ڈرامائی انداز میں

Scanned with CamScanner

ایک ڈرامائی گفتگو اتفاقاً سن رہی تھی، ایک سوال کے جواب کا انتظار کر رہی تھی، وہ واحد سوال جس سے مجھے دلچسپی ہو سکتی تھی، اور ہوتا کیا ہے؟ جواب کے آنے میں دیر لگ رہی ہے۔ متہور، صورت حال کا باضمیر منصف، اپنے الفاظ تول رہا ہے۔

''مجھے نہیں معلوم،'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم،'' اس نے اور بھی دھیمی آواز میں دہرایا، یوں جیسے کسی سے حجت کر رہا ہو۔ بالآخر اس نے اضافہ کیا، ''بدقسمت محبت مر نہیں سکتی۔''

بعد میں انھوں نے دھیمی آواز میں کچھ اور باتیں کیں اور گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ میں انھیں اب بھی سن سکتی تھی۔ وہ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میں نے پھولوں کو نیچے کنکریٹ کی بنچ پر ڈال دیا اور چل کر باغ کی انتہا پر کنویں کے پاس پہنچی اور وہاں اس بنچ پر جا بیٹھی جہاں بائیس سال پہلے لیوش نے مجھ سے شادی کے لیے خود کو پیش کیا تھا۔ پھر میں نے دل کے اوپر بانہوں سے صلیب کا نشان بنایا، کروشیے کے کام کے اسکارف سے پستانوں کو ڈھانپا کیونکہ مجھے سردی لگ رہی تھی، باہر ہائی وے پر نظر ڈالی، اور اچانک لاتسی کے سوال کو نہ سمجھ سکی۔

6

جب لیوش پہلے پہل ہم لوگوں کے درمیان ظاہر ہوا، اور لگتا ہے جیسے یہ زمانوں پہلے ہوا ہو، تو لاتسی نے اسے خوش آمدید کہنے میں حد سے زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔ دونوں ایسے مردوں کا خاندانی کردار ادا کرنے کی مشق کر رہے تھے جن سے 'بڑی توقعات' وابستہ کی گئی ہوں۔ یہ کوئی نہیں بتا پاتا کہ سچ مچ یہ کیا توقعات تھیں جو لیوش اور لاتسی سے وابستہ کی جا رہی تھیں، گو اگر آپ ان دونوں میں سے کسی کی بات بھی ذرا دیر دھیان لگا کر سنتے تو دونوں ہی بڑی بڑی امیدیں دلا دیتے۔ ان کے کرداروں کی مشابہتیں — مثلاً حقیقت کے کسی بھی احساس کا کلّی فقدان، بے مصرف خواب دیکھنے کا رجحان، لاشعوری طور پر جھوٹ بولنے کی لہر — دونوں کو ایسے ناگزیر طور پر ایک دوسرے کے قریب لے آئی تھیں جیسے دونوں عاشقوں کا جوڑا ہوں۔ لیوش کا گھر والوں سے تعارف کراتے وقت لاتسی کتنا فخر محسوس کر رہا تھا! اور تو اور، دونوں کی شکلیں بھی ملتی جلتی تھیں: دونوں کے چہروں پر گذشتہ صدی کی

Scanned with CamScanner

رومان پرور روشنی کی تھوڑی بہت چھوٹ پڑ رہی تھی، یہ ایک وصف مجھے لاتسی میں بھاتا تھا اور یہی وصف تھا جس نے مجھے لیوش سے بے تکلف کر دیا۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب دونوں ایک دوسرے جیسا لباس بھی پہنتے تھے، اور شہر ان کی اوچھی اور سننے میں بڑی عالیشان حرکتوں کی کہانیوں سے اَٹا پڑا تھا۔ لیکن سب ہی ان سے درگزر کرتے تھے کیونکہ دونوں جوان تھے، دلکش تھے، اور انھوں نے واقعی کبھی کوئی فضیحتہ انگیز حرکت نہیں کی تھی۔ روح اور جسم دونوں کے اعتبار وہ ایک دوسرے سے مشابہ تھے۔

یہ دوستی، جوان کے یونیورسٹی کے دنوں میں بھی قربت کی ایک پریشان کن کیفیت کی حامل رہی تھی، اس وقت بھی ختم نہیں ہوئی جب لیوش نے مجھ میں اپنی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیا: یہ ختم تو نہیں ہوئی بلکہ ایک عجیب سے انداز میں بدل گئی۔ کوئی آنکھ کا اندھا بھی صاف دیکھ سکتا تھا کہ لاتسی بڑے مضحکہ خیز انداز میں لیوش پر اپنا حق جماتا تھا اور حتیٰ المقدور کوشاں تھا کہ اپنے دوست کو خاندان ہی کا حصہ بنا ڈالے، اور ساتھ ہی ساتھ اس دوست کے معاشقے پر نارضامند بھی ہے، ہماری لشٹم پشٹم یکجائی کے لمحات میں بار بار مداخلتیں کرتا ہے، اور ہماری روز افزوں باہمی کشش کی غیر یقینی علامتوں کا تمسخر اڑاتا ہے۔ لاتسی ملکیت جتاتا تھا، لیکن بڑے غیر معمولی انداز میں —— یا شاید اتنے غیر معمولی انداز میں نہیں —— اس کی رقابت کا ہدف صرف میں ہی تھی اور جب لیوش نے ولما سے شادی کی تو وہ اس پر خوش نظر آیا، اور تمام وقت ان دونوں کے ساتھ انتہائی نرمی سے پیش آیا، ان کی ہر مسرت کے واسطے خود کو قربان کر دینے کے لیے تیار۔ گھر بھر جانتا تھا کہ میں لاتسی کی محبوبِ نظر ہوں، اس کی گرویدہ ہوں۔ بعد میں مجھے یہ گمان بھی گزرا کہ لاتسی کی مخالفت اور عداوت نے ہو سکتا ہے کہ لیوش کی بے وفائی میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا ہو۔ لیکن یہ ایک ایسا مفروضہ نہیں تھا جسے میں کبھی سچ ثابت کر سکتی، خود اپنے لیے بھی نہیں۔

یہ دونوں ایک دوسرے جیسے آدمی، یہ دو تقریباً ہو بہو کردار، دوستی کے معاملے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ جیسے ہی لیوش کو اپنا ورثہ ملا دونوں دارالسلطنت میں چھتروں والے بڑے طمطراق کے اپارٹمنٹ میں رہنے لگے جہاں میرا کبھی جانا نہیں ہوا لیکن جو لاتسی کے قول کے مطابق اس دور کے اہم ترین دانشورانہ اور معاشرتی مقامات میں سے ایک تھا۔ اس کی معاشرتی اہمیت پر مجھے تو پورا شک ہے۔ بہر کیف، وہ ساتھ رہ رہے تھے اور پاس روپیہ پیسہ تھا —— اس وقت لیوش امیر آدمی

Scanned with CamScanner

ہونے کے قریب قریب تھا، اور یہ صرف لاتسی کی بچکانہ خفگی ہی تھی جس کی وجہ سے اس نے اس طلائی گھڑی اور چند سو کی رقم کا ذکر کر دیا جسے لیوش نے مستعار لینا چاہا تھا، کیونکہ اپنی ثروت کے اُن دنوں میں لیوش ہر ایک کے ساتھ فیاضی کر رہا تھا، جن میں، ظاہر ہے، اس کا جگری دوست بھی شامل تھا۔ انھوں نے خوش باش جوانوں میں سے چند بے فکروں اور بیکاروں کا انتخاب کر لیا اور خوب گلچھرے اڑانے لگے۔ عیاشی اور اوباشی تو خیر نہیں ہو رہی تھی۔ مثال کے طور پر لیوش کو پینے پلانے سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی، اور لاتسی بھی کوئی ایسا شب گرد نہیں تھا۔ نہیں، ان کی زندگی پیچیدہ، گراں قیمت، اور بڑی محنت طلب قسم کی بیکاری کے حوالے ہو گئی تھی، اس قسم کی بیکاری جس پر کوئی بے سمجھ باہر والا بڑی آسانی سے بڑی ٹھوس، اور سوچی سمجھی سرگرمی کا گمان کر سکتا ہے جس کا مطلب ایک نفیس طرزِ حیات نکل سکتا ہے جسے فیشن پرستانہ طور پر 'لائف اسٹائل' کہا جاتا ہے — لاتسی کا محبوب لفظ۔ انوکھی استعداد کے یہ دو جوان ساتھ مل کر اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کی جدوجہد میں لگ گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے اور خواب دیکھ رہے تھے۔ لیکن یہ مجھے بہت بعد میں کہیں جا کر معلوم ہوا۔

نئے دوست لیوش کے ساتھ نئی نئی کشاکشیں ہمارے گھر میں داخل ہوئیں۔ وہ ہماری دیہاتی زندگی اور تفریحات کو ایک مخصوص قسم کے مربیانہ تحیر سے دیکھتا۔ ہم اس کی برتری کو محسوس کرتے اور، قدرے ندامت کے ساتھ، اپنی کوتاہیوں کے ازالے کی جستجو کرتے۔ ہم سب کے سب اچانک 'مطالعہ' کرنے میں لگ گئے، خاص طور پر ان مصنفوں کا جن کی اہمیت کی طرف لیوش نے سب سے پہلے ہمیں متوجہ کیا تھا — 'مطالعہ'، اتنی جاں فشانی سے، خفت کے اتنے شدید احساس کے ساتھ گویا ہم اس اہم ترین امتحان کی تیاری کر رہے ہوں جو زندگی ہم سے لے سکتی ہو۔ بعد میں ہم پر کھلا کہ لیوش نے خود بھی ان مصنفوں اور مفکروں کو نہیں پڑھا تھا، یا بس ان سے سرسری سا گزر لیا تھا، ان کے فکری و ادبی آثار اور تصورات سے جن کی وہ، سر ہلا ہلا کر اور خوش دلانہ درشتی سے ہماری سرزنش کرتے ہوئے، اتنی پرزور سفارش کیا کرتا تھا۔ اس کی دلکشی کسی گھٹیا سے شر انگیز فسوں کی طرح ہمیں سحرزدہ کر دیتی تھی۔ بے چاری ہماری والدہ باقی سب سے پہلے مکمل طور پر چندھیا گئی تھیں۔ لیوش کے اثر سے اور اس کا پاس کرتے ہوئے، ہم ہمہ وقت 'مطالعہ' کرتے رہتے، پہلے سے کافی مختلف انداز میں، اور ایک 'سوشل لائف' گزارنے کی کوشش کرتے، لیکن پہلے سے کافی مختلف۔ ہم نے گھر کو بھی چمکا دیا تھا۔ اس پر بڑی

لاگت آئی، اور ہم ایسے مالدار بھی نہیں تھے۔ اماں ہمہ وقت لیوش کا انتظار کرتی رہتیں، اس کی زیارتوں کی تیاری کرتی رہتیں جیسے یہ کسی قسم کا امتحان ہوں۔ ایک مرتبہ وہ تازہ ترین جرمن فلسفیوں کو بڑی محنت اور توجہ سے پڑھ رہی تھیں، کیونکہ لیوش نے اپنے برتری والے انداز میں پوچھا تھا کہ آیا ہم لوگ 'ب' کے کام سے واقف ہیں، جو ہائیڈل برگ کا رہنے والا مفکر تھا۔ نہیں، ظاہر ہے، ہم واقف نہیں تھے۔ سو ہم نے جھٹ پٹ زندگی اور موت کے بارے میں اس کے قدرے گڈمڈ تفکرات کا مطالعہ شروع کر دیا۔ والد بھی خود پر قابو پانے میں لگے ہوئے تھے۔ وہ کم پینے لگے تھے اور جب مہمان آئے ہوئے ہوتے تو اپنی سوگوار، پارہ پارہ زندگی کو لیوش کی چشم نگراں سے چھپانے کا خاص خیال رکھتے۔ ہر ہفتے اتوار کو میرا بھائی اور لیوش مہمانوں کو لیے پہنچ جاتے۔

تب گھر لوگوں اور ان کی کلکلاہٹ سے بھر جاتا۔ پرانی بیٹھک ایک نوع کے 'سالون' میں بدل گئی تھی جس میں لیوش انتہائی دلکش مقامی لوگوں کی خاطر مدارات کرتا جو اس وقت تک دلکش سے زیادہ مشتبہ ہوا کرتے تھے، لوگ جنھیں ہم سرے سے کبھی گھر نہ بلاتے۔ اچانک انھیں کھلی دعوت مل گئی تھی۔ اپنا گھسا پٹا فراک کوٹ پہنے اور دقیانوسی تپاک کے ساتھ میرے والد ویک اینڈ کے مہمانوں کے درمیان عجیب بے ڈھب انداز میں نقل وحرکت کرتے —— ان موقعوں پر ان کی کیا مجال کہ اپنا پائپ بھی روشن کرلیں۔ اور لیوش مجھے اپنی ایک نگاہ سے قبول کرتا، اطمینان بخش پاتا یا ٹوکتا، میری تعریف میں مجھے آسمان تک پہنچا دیتا اور اجر دیتا یا اٹھا کر قعر جہنم میں پٹک دیتا۔ یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔

میرا بھائی اور اس کا عجیب وغریب دوست عام معنی میں بازاری، لچے لفنگے جوان نہیں تھے۔ ایک سال بعد ہر فرد و بشر جان گیا کہ لاتسی بھی لیوش کا اتنا ہی دست نگر بن گیا تھا جتنے ہم سب تھے، میری والدہ، ولما اور، آگے چل کر، خود میں۔ اب میں جتا سکتی ہوں کہ صرف میں ہی ہوشمند تھی، تنہا وہ ہستی جو اس شرانگیز واہمے سے محفوظ تھی، لیکن اس قسم کے نادار امتیاز سے خود کو تسلی دینے کی آخر مجھے کیا ضرورت ہے؟ ٹھیک ہے، میں نے فی الفور لیوش کے بالکل 'آر پار' دیکھ لیا تھا، لیکن کیا میں بے دیکھے بھالے اور بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس کی خدمت کو نہیں دوڑ پڑی تھی؟ وہ اتنا متین اور اتنا حساس تھا۔ ہم جلد ہی اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ اس نے اور لاتسی نے اپنی کالج کی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ ایک دن جھٹ پٹے کے وقت جب وہ میز کے پاس کھڑا تھا اور بالوں کی ایک لٹ اس کے

ماتھے پر پھڑ پھڑا رہی تھی، وہ بولا — اور مجھے اس کے لفظ بالکل ٹھیک یاد ہیں، لفظ جو اس نے راضی برضا انداز میں ادا کیے تھے، جیسے یہ کوئی ایثارِ نفس کا عمل ہو — ''مطالعے کی خاموش اور اکیلی زندگی گزارنے کے بجائے مجھے زندگی کی پرشور اور خطرناک رزم گاہ اختیار کرنی پڑے گی۔'' وہ ہمیشہ اس طرح بولتا جیسے کتاب پڑھ رہا ہو۔ اس اعلان نے مجھے ہلا کر رکھ دیا اور میں پریشان ہو گئی۔ مجھے لگا جیسے لیوش کسی عظیم لیکن قدرے مبہم منصوبے کی خاطر اپنے مقصدِ حیات سے دستبردار ہو رہا ہے تاکہ کسی یا بہت سارے کیسوں کی حمایت کے لیے کسی جدوجہد میں شامل ہو سکے؛ اور یہ جدوجہد ایسی ہے جس میں وہ علم نہیں بلکہ مکر اور افادیت پرستی کے ہتھیاروں سے مسلح ہے۔ اس قربانی کے اعلان نے مجھے مضطرب کر دیا، کیونکہ ہم اپنے گھرانے میں لڑکوں کے 'زندگی کی رزم گاہ' میں قدم رکھنے سے پہلے اپنی پڑھائی ختم کر لینے کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن جب لیوش نے کہا کہ اس کی روش مختلف ہے اور اس کے ہتھیار عام قسم کے نہیں، تو میں نے یہ بات تسلیم کر لی تھی۔ قدرتی بات ہے، لاتسی بھی فوراً منتخبہ راستے پر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا؛ انھوں نے اپنے یونیورسٹی کے نصاب کے تیسرے سال کی پروا نہیں کی۔ اس وقت میں ابھی ایک کمسن لڑکی ہی تھی۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد لاتسی 'ذہن کی دنیا' میں لوٹ آیا؛ ہمارے کنبے کی باقی ماندہ پونجی سے شہر میں کتابوں کی ایک دکان کھول لی اور منصوبہ بندی کے اوائلی دور کے سارے جوش وخروش کے بعد اپنی زندگی کتابوں اور اسٹیشنری فروخت کرنے سے آباد کر لی۔ لاتسی کے کیریئر کے اس موڑ پر لیوش نے بڑی سخت نکتہ چینی کی لیکن بعد میں، جب سیاست ہمارا منہ زور جذبہ بن گئی، تو اس نے جھگڑا لپیٹ دیا۔

میں لیوش کے سیاسی خیالات سے کبھی واقف نہ ہو سکی۔ عمبور نے، جس سے اس قسم کے معاملے میں مَیں اکثر مشورہ لیا کرتی تھی، کندھے اچکائے اور بولا کہ لیوش کے سرے سے کوئی راسخ سیاسی عقائد نہیں ہیں۔ جدھر کی ہوا دیکھتا ہے اُدھر ہی چل پڑتا ہے، اور بس جہاں طاقت و اختیار بٹ رہا ہو، حصہ لینے پہنچ جاتا ہے۔ یہ تنقید صحیح ہو سکتی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ پوری طرح درست نہیں تھی۔ مجھے گمان تھا کہ لیوش انسانیت اور انسانی آدرشوں کے لیے قربانیاں دینے کا بھی اتنا ہی اہل تھا — خاص طور پر موخر الذکر کے لیے، کیونکہ وہ ہمیشہ حقیقت پر آدرشوں کو فوقیت دیتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ آدرشوں کا میدان ممکنہ طور پر کم پرخطر ہے اور ان سے مفاہمت کرنا زیادہ آسان۔ رہا سیاست میں

'شمولیت' کی جستجو کا معاملہ، تو وہ یہاں اپنی جان کی بازی لگانے کے لیے بھی تیار تھا، اتنا ان فائدوں کے لیے نہیں جو اسے مل سکتے ہوں جتنا خالص اس ہیجان اور انگیخت کی خاطر جو شمولیت کے ساتھ آتی ہے؛ شمولیت کی اثر انگیزی ایک ایسی شے تھی جس وہ پوری طرح محسوس کرتا اور بھوگتا تھا۔ لیوش کی بابت میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ وہ اس قسم کا آدمی ہے جو شروعات دروغ گوئی سے کرتا ہے لیکن پھر اس کے دوران سخت جذباتی ہو جاتا ہے اور رونے لگتا ہے، اور مزید جھوٹ بولنے لگتا ہے، اور اس بار واقعی آنکھوں میں آنسو لاکر، یہاں تک کہ بالآخر اتنی ہی فصاحت اور بلاغت سے سچ بول کر جس سے پہلے جھوٹ بولا تھا سب کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس کی اس صلاحیت نے اسے خود کو پوری ایک دہائی تک انتہا پسندانہ اور باہم متصادم تصورات کے علمبردار کے طور پر پیش کرنے سے باز نہیں رکھا، اور کبھی جماعتوں نے جلد ہی اسے نکال باہر کیا۔ خوش قسمتی سے لاتسی نے اس راہ میں اس کی پیروی نہیں کی۔ وہ 'تعقل پسندی کے منطقے' میں ہی رہا، ڈرائنگ کی چیزیں اور استعمال شدہ مڑے تڑے صفحوں کی کتابیں فروخت کرتا رہا، اسی اُبسی ہوئی فضا کا ایک حصہ بنے رہنے پر قانع۔ لیکن لیوش خطرات کی تلاش میں نکل پڑا، 'خطرات' جن کی وہ کبھی قرینے سے وضاحت نہ کر سکا، ہمیں ایک فاصلے سے اپنا جائزہ لینے کے لیے چھوڑ کر، ایک تنہا ہستی کے طور پر جو آندھیوں اور طوفانوں سے زندہ بچ رہی ہو، اور ان جگہوں سے کبھی زیادہ دور نہ ہو جہاں بجلی گرنے کا امکان ہو۔

ولما کے انتقال اور خاندان کے ٹوٹنے پر لیوش ہمارے افق سے معدوم ہو گیا۔ اسی وقت میں یہاں لوٹ آئی تھی، امن و امان کی اس واجبی سی پناہ گاہ میں۔ یہاں کوئی چیز میری منتظر نہیں تھی، بس یہاں مجھے سر چھپانے کی جگہ اور روکھی سوکھی کا آسرا مل سکتا تھا۔ لیکن اس شخص کے لیے جو طوفان سے گزر آیا ہو، ہر پناہ گاہ خوش آئند ہی ہوتی ہے۔

7

یہ پناہ گاہ — کم از کم شروع میں یہ پناہ گاہ ہی معلوم ہوئی تھی — کچھ ایسی کم مخدوش نہ تھی۔ جب والد کا انتقال ہوا، اس وقت مختاروں، تمبو را اور اینڈرے، نے جائیداد کی بڑی سخت چھان بین

Scanned with CamScanner

کی۔ ایندرے اپنے نوٹری پبلک کے عہدے کے باعث ایسا کرنے پر مجبور تھا۔ شروع شروع میں ہماری مالی حالت خاصی خستہ معلوم ہوئی۔ میرے والد کی کشیدہ خاطر غفلت اور بدمزاج لین دین، والدہ کی علالت، ولما کی بے دخلی اور موت، اپنا کاروبار قائم کرنے کے لیے لاتسی کی مطلوبہ رقم — ان تازہ ترین انقلابی تبدیلیوں کے بعد جو تھوڑا سا بچ رہا تھا وہ تنگ، غیر مرئی راستوں سے ہوتا ہوا لیوش کو پہنچ گیا۔ جب روپے پیسے پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہ رہا تو اس نے پرانے گھر کی چیزیں 'یادگاریں' کہہ کر کسی بچے کے تجسس اور کسی نوادرات جمع کرنے والے کی حرص وطمع کے ساتھ غائب کرنا شروع کر دیں۔ بعد میں میں بعض اوقات ایندرے اور تیبور کی نکتہ چینی کے خلاف اس کی مدافعت کرتی۔ جب انھوں نے اس پر لوٹ مار کا الزام لگایا تو میں نے کہا، ''وہ صرف کھیل رہا ہے۔ اس کی فطرت میں کوئی شے بچوں جیسی ہے۔ اسے کھیل تماشا پسند ہے۔'' ایندرے نے شدت سے اس کی مخالفت کی۔ بچے نقلی کشتیوں یا رنگین گولیوں سے کھیلتے ہیں، اس نے نہایت برہمی سے استدلال کیا؛ لیوش اس قسم کا 'ازلی بچہ' ہے جو بینک کی ہنڈیوں سے کھیلنے کو ترجیح دیتا ہے۔ گو اس نے کہا نہیں، لیکن اس کا کنایہ صاف سمجھ میں آتا تھا کہ ان ہنڈیوں، لیوش کی ہنڈیوں کو کوئی پاک پوتر چیز یا بے ضرر کھلونے نہیں سمجھنا چاہیے۔ اور واقعی والد کی وفات کے بعد چند ہنڈیاں برآمد ہوئیں۔ دیکھنے میں تو یہ لگتا تھا جیسے انھوں نے ان پر دستخط کر کے لیوش کو ان کا مالک بنا دیا ہو، گو میں نے بذاتِ خود کبھی ان کے استناد پر شک نہیں کیا۔ اور پھر اس عام انہدام میں یہ ہنڈیاں بھی رفتہ رفتہ گرفت سے نکل گئیں۔

جب میں نے دیکھا کہ میرا دنیا میں کوئی نہیں رہ گیا ہے — نونو کو چھوڑ کر، جس کے ساتھ میں ایک نوع کی باہمی وابستگی کی زندگی گزار رہی تھی، درخت پر لگی کسی طفیلی بیل کی طرح، اگرچہ ہم دونوں میں سے کوئی یہ نہیں جانتی تھی کہ درخت کون ہے اور طفیلی کون — تو ایندرے اور تیبور نے اس ملبے سے میرے لیے کچھ بچانے کی جدوجہد کی۔ یہ وہ وقت تھا جب تیبور چاہتا تھا کہ میں اس سے شادی کرلوں۔ میں نے ابہام اور ہچکچاہٹ سے کام لیا لیکن اپنی نامنظوری کی اصلی وجہ نہیں بتائی۔ میں اس سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ دل کی گہرائیوں میں میں ابھی تک لیوش کی منتظر تھی؛ کسی قسم کی خبر، کسی پیغام، ممکن ہے کسی معجزے کی توقع کر رہی تھی۔ ہر وہ چیز جس کا سروکار لیوش سے ہو، معجزاتی فضا سے بھری ہوتی

ہے، سو مجھے یہ بالکل ناممکن نہیں معلوم ہوا کہ وہ ایک دن نمودار ہو، شاید کسی قدر ڈرامائی انداز میں، لوہنگرِ ن (Lohengrin) کی طرح، ایک رفیع الشان آریا (aria) گاتے ہوے۔ لیکن یہ بھی تھا کہ ہمارے جدا ہونے کے بعد وہ اتنے ہی معجزاتی طور پر روپوش بھی ہو گیا تھا جیسے غیر مرئیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہو۔ مجھے برسوں اس کی جانب سے کوئی خیر خبر نہ ملی۔

اب صرف مکان اور باغ بچ رہا تھا۔ چھوٹے موٹے قرضوں کا معاملہ بھی تھا۔ میں نے ہمیشہ خود کو ایک اَن تھک، ضدی اور عملی ہستی سمجھا ہے۔ لیکن تن تنہا رہ جانے کی دیر تھی اور مجھے نظر آنے لگا کہ میں اب تک بادلوں سے پرے آباد تھی —— اور، یہ اضافہ اور کر دوں، بادل بھی سخت گھن گرج والے —— اور مجھے ذرا اندازہ نہیں تھا کہ کیا شے حقیقی اور قابلِ بھروسا ہے اور کیا نہیں۔ نونو نے بتایا تھا کہ مکان اور باغ ہم دونوں کے لیے کافی ہوں گے۔ آج بھی یہ میری سمجھ سے بالا ہے کہ یہ کیسے 'کافی' ہو سکتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ باغ بڑا اور پھل دار درختوں سے بھرا ہے، اور نونو نے ان ہرے بھرے آرائشی پھولوں کی کیاریوں کو، سرخ مٹی سے ڈھکی، بل کھاتی ہوئی روشوں کو، کائی زدہ پتھروں والے رومانی آبشار کو بن باس دے کر باغ کے ہر ہر انچ پر کاشت کر ڈالی تھی، بالکل ان جنوبی کوہستانی باسیوں کی طرح جو اپنے کھیتوں اور باغوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اپنے قطعات کو طوفانوں اور بن بلائے چلے آنے والوں سے بچانے کے لیے ان کے ہر مربع میٹر پر ایک روک کھڑی کر دیتے ہیں۔ بس اب باغ ہی بچ رہا تھا۔ اور اینڈرے نے مشورہ دیا کہ ہمیں مکان کے چند کمرے کرائے پر اٹھا دینے چاہییں۔ لیکن نونو کی مخالفت نے اس تجویز کو ناکام بنا دیا۔ اس نے مخالفت کی وجہ نہیں بتائی، کوئی وضاحت بھی نہیں پیش کی، بس آپ اس کے لہجے سے، اور اس سے بھی زیادہ اس کی خاموشیوں سے، یہ نتیجہ نکال سکتے تھے کہ وہ گھر میں اجنبیوں کو رکھنے پر راضی نہیں۔ وہ ہمیشہ چیزوں کا انتظام اور 'مسائل کا حل' اس طرح کرتی ہے کہ آپ اس کی اس سے توقع بھی نہیں کر سکتے۔ دو اکیلی عورتیں جن کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہ تھا، یا کم از کم دنیا تو ایسا ہی سمجھتی تھی، کپڑے سینے کا کام یا باورچی گیری تو کر ہی سکتی تھیں، یا نفیس کشیدہ کاری کی اشتہار بازی، لیکن نونو ان میں سے کسی پر بھی غور

---

[1] لوہنگرِ ن (Lohengrin) رچرڈ واگنر (Richard Wagner) کے اسی نام کے رومانی اوپیرا کا مرکزی کردار۔ اسے پہلی بار 1850 میں اسٹیج پر پیش کیا گیا تھا۔

Scanned with CamScanner

کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔ اور مجھے محلے کے بچوں کو پیانو سکھانے کی اجازت دینے میں بھی اسے اچھا خاصا وقت لگا۔

ہم نے کسی نہ کسی طرح گزر اوقات کر ہی لی.... اب میں جانتی ہوں کہ مکان ہی ہمارا آسرا تھا، مکان اور باغ، یہی کل متاع تھی جو پر خطر کاموں میں ہاتھ ڈالنے والے ہمارے بیچارے والد ہمارے لیے چھوڑ گئے تھے۔ صرف یہی وسائل باقی بچ رہے تھے جن سے ہماری کفالت ہوتی رہی۔ مکان نے سر چھپانے کے لیے چھت مہیا کر دی تھی؛ اگرچہ یہ پرانے ساز و سامان سے محروم ہو چکا تھا، کم از کم ہمارے لیے ایک ٹھکانا تو تھا۔ کھانے پینے کا انتظام باغ سے ہو گیا، بس اتنا ہی، اور اس سے زیادہ نہیں جو ایک بھگوڑے کو درکار ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہ ہمارے ارد گرد خوب پھلا پھولا کیونکہ ہم نے اپنا سب کچھ اسی پر نثار کر دیا تھا، اسے اپنی محنت اور امیدوں سے پالا پوسا تھا، چنانچہ اب یہ بعض اوقات ایک اچھی خاصی جائیداد دکھائی دیتا جہاں ہر وہ شخص جو اس سے وابستہ ہونا چاہتا ہو، بغیر کسی فکر و تردد کے رہ سکتا تھا۔ ایک دن نونو نے باغ کے سرے پر واقع ریتیلے حصے کی پورے دو ایکڑ زمین پر بادام کے درخت لگانے کا فیصلہ کر ڈالا۔ بادام کے یہ درخت ان پراسرار ہاتھوں کی طرح تھے جو ہماری محافظت کے لیے ہمارے سروں پر سایہ فگن تھے، اور اس سے قبل کہ فاقوں کی نوبت آ جائے، ان میں بادام آنے لگے۔ ہر سال ان پر خوب پھل آتا اور نونو اپنے مخصوص رازدارانہ انداز میں، بڑے تقریباتی طور پر، ان کی قیمت مقرر کرتی، اور اس فروخت سے ہم اپنا گزارہ کرتے، اور نہ صرف گزارہ بلکہ اپنا قرض بھی ادا کرتے، اور بعض اوقات تو لاتسی کی امداد کی گنجائش بھی نکال لیتے۔ یہ کیسے ہوتا تھا، اس کا پتا مجھے ایک عرصے تک نہ چل سکا۔ نونو بس مسکرا دیتی اور اپنا بھید اپنے اندر ہی رکھتی۔ میں گاہے ماہے ہمارے باداموں کے چھوٹے موٹے سے جنگل کے سامنے کھڑے ہو کر اسے تو ہم پرستی سے گھورنے لگتی۔ یہ ریگزار ہماری زندگی میں ایک معجزے کی طرح تھا۔ کوئی غیبی ہستی ہماری نگرانی کر رہی ہے، مجھے محسوس ہوتا۔

بادام کے باغ کا خیال حقیقت میں والد کا تھا، لیکن زندگی کے آخری دور میں وہ اتنے تھک گئے تھے کہ اس کو عمل میں نہ لا سکے۔ کوئی دس سال پہلے ایک بار انھوں نے نونو سے کہا تھا کہ باغ کے آخری حصے کی ریتیلی زمین باداموں کے لیے سازگار رہے گی۔ زندگی جو کچھ پیش کرتی ہے اس سے والد نے

بہت زیادہ سروکار نہ رکھا؛ دوسروں کی نگاہ میں تو ہمارے واجبی خاندانی وسائل کو برباد کرنے کے وہی ذمے دار تھے۔ خیر، کچھ بھی سہی، ان کی وفات کے بعد ہم پر کھلا کہ والد اپنے مخصوص دھیمے اور خفا خفا سے انداز میں ہر وہ چیز جو ہمارا حصہ تھی، بڑی منظم اور باضابطہ حالت میں چھوڑ گئے تھے؛ یہ ماما تھیں جو گھرانے پر سب سے زیادہ بوجھ بنی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ والد تھے جنھوں نے، لیوش کی درخواست پر، باغ ہم لوگوں کے تصرف کے لیے بچا رکھا تھا اور انھیں نے آخر آخر تک کہیں اور منتقل ہونے کی مخالفت کی تھی۔ جب صرف نونو اور میں ہی باقی رہ گئے تو ہمیں صرف اتنا کرنا پڑا کہ والد کے لگائے ہوے ان باغوں میں اپنی جگہ سنبھال لیں۔ ہم نے مکان کی مرمت کروائی۔ اینڈرے کی بدولت ترکے کی ضمانت پر ایک کم شرحِ سود کے قرضے کا انتظام ہو گیا۔ یہ سب کچھ بغیر منصوبہ بندی کے عمل میں آ گیا، بنا کسی مخصوص ارادے یا غرض و غایت کے ہو گیا۔ ایک دن آیا کہ ہم نے دیکھا، ہمارے سروں پر چھت قائم ہے۔ گاہے بہ گاہے کپڑا خرید کر اپنے لباس تیار کرنے کی گنجائش بھی نکل آتی تھی، لاتسی بھی ضرورت کی کتابوں کے لیے قرض لے سکتا تھا، اور انہدام کے بعد تنہائی کی جس کیفیت میں ہم اتنے ڈرے سہمے داخل ہوے تھے، جیسے زخمی جانور کسی غار میں داخل ہوتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ ہمارے اردگرد زائل ہونے لگی۔ نتیجتاً جلد ہی ہمارے دوست بھی بن گئے اور اتوار کے دن گھر مردوں کی پرجوش گفتگو سے گونجنے لگا۔ لوگ خود ہی ہمارا خیال رکھنے لگے، دنیا میں نونو کو اور مجھے بھی ایک مقام دے دیا، اپنے تخیلات کے کونوں میں ایک گوشہ ہمارے لیے بھی وقف کر دیا جہاں ہم خاموشی کے ساتھ اپنے کاروبارِ حیات میں مشغول ہو سکتے تھے۔ زندگی اتنی ناقابلِ برداشت یا مایوس کن نہیں تھی جتنا میں تصور کیے بیٹھی تھی۔ رفتہ رفتہ ہماری زندگی تازہ سرگرمیوں سے بھر گئی: ہمارے دوست تھے، حتیٰ کہ چند دشمن بھی، جیسے تیمور کی والدہ اور اینڈرے کی بیوی جو مضحکہ خیز طور پر اور بالکل کسی سبب کے بغیر اس پر ناخوش تھیں کہ ان کے مرد ہمارے گھر آتے جاتے تھے۔ ایسے وقت بھی آتے جب گھر اور باغ کی زندگی حقیقی زندگی لگتی، جس کا کوئی باقاعدہ مقصد، منصوبہ، اور باطنی معنی ہوں؛ ہم برسوں اسی روش پر بغیر کسی تعطل کے زندگی گزار سکتے تھے، لیکن اگر کسی نے ہمیں اگلے ہی دن کوچ کرنے کا حکم دیا ہوتا تو میں نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی ہوتی۔ زندگی پُرامان اور سادہ تھی۔ لیوش نیتشے کا شاگرد تھا، جس کا مطالبہ تھا کہ آدمی پرخطر زندگی گزارے، لیکن وہ خود خطروں سے ڈرتا تھا، اور جب وہ کوئی سیاسی 'وابستگی' اختیار کرتا

Scanned with CamScanner

تو اس طرح جیسے وہ کوئی شدید لگن اختیار کر رہا ہو، بہ بانگِ دہل اور کسی 'خفیہ ہتھیار' سے مسلح، یوں جیسے بڑی ہوشیاری سے سوچے سمجھے دروغوں، گرم زیر جاموں، چند بناؤ سنگھار کے لوازمات اور جیب میں اپنے مخالفین کے بڑی حفاظت سے سنبھال کر رکھے ہوئے اور بڑے فضیحتہ انگیز خطوط کے ساتھ، اپنا بچاؤ کر رہا ہو۔ لیکن ایک وقت میں، جب میری زندگی بھی اتنی ہی 'پر خطر' تھی جتنی اس کی، میں اس سے قریب تھی۔ اب جبکہ یہ خطرہ دور ہو چکا ہے تو میں دیکھ سکتی ہوں کہ کچھ بھی تو ویسا نہیں ہے جیسا ہوا کرتا تھا، اور کہ اس قسم کا خطرہ ہی دراصل زندگی کا واحد حقیقی مفہوم تھا۔

8

میں گھر کے اندر چلی آئی، ڈالیا کے پھولوں کو گلدانوں میں سجایا اور اپنے مہمانوں کے ساتھ برآمدے میں آ بیٹھی۔ ہر اتوار کی صبح لاتسی فرار ہو کر ہمارے یہاں ناشتہ کرنے آ جاتا ہے۔ اس وقت ہم اس کے لیے میز خاص طور پر برآمدے میں یا، اگر موسم خراب ہو تو، پرانی نرسری میں لگا دیتے ہیں، جو اب بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ اپنی پرانی پیالیاں اور انگلش کٹلری نکال لیتے ہیں، اور وہ نقرئی جگ سے کریم ڈالتا ہے جو اسے باون سال پہلے بپتسمے اور نام رکھنے کی رسم کے موقعے پر ایک واجبی ذوق والے مخیّر رشتے دار نے تحفتاً دیا تھا۔ اس پر میرے بھائی کا نام آئی ٹیلکس حروف میں کندہ کیا ہوا ہے۔ وہ سب برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ تیمور سگار پھونک رہا تھا اور باغ کی طرف فکر مندی سے دیکھ رہا تھا، لاتسی منہ ٹھسا ٹھس بھرے کھا رہا تھا جیسا کہ اٹھتی جوانی میں کھاتا تھا۔ اسے ان اتواری ناشتوں کا ناغہ کرنا سخت ناپسند تھا۔ یہ اس کے بچپن کو اپنی تمام تفصیلوں کے ساتھ اس کے سامنے زندہ کر دیتے تھے۔

''اس نے اینڈرے کو بھی لکھا ہے،'' لاتسی بھرے منہ کے ساتھ بولا۔

''کیا لکھا ہے؟'' میں نے پوچھا، اور زرد پڑ گئی۔

''یہی کہ وہ حاضر رہے، اس دن سفر نہ کرے کیونکہ اس کی ضرورت پڑے گی۔''

''اینڈرے کی ضرورت؟'' میں نے ٹھٹھا مار کے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

’’کیوں تھیو ر، ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟‘‘ لاتسی نے استفسار کیا۔ اسے ہمیشہ ہی کسی قابلِ بھروسا آدمی کی شہادت درکار ہوتی۔ وہ اپنے بیانات پر اعتماد کرنے کی ہمت بھی نہیں کرسکتا تھا۔

’’ہاں، یہ درست ہے،‘‘ تھیو ر نے اتاؤلے پن سے جواب دیا۔ ’’اسے کوئی کام ہے، شاید،‘‘ اور یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ چمک اٹھا، یوں جیسے کسی مشکل کا واحد مناسب اور باعزت حل ہاتھ آ گیا ہو،’’شاید اپنے قرضے اتارنا چاہتا ہے۔‘‘

ہم نے اس پر غور کیا۔ میں لیوش پر اعتماد کرنے کی خواہش مند تھی، اور اب تھیو ر نے جو یہ قیاس آرائی کی تو یہ بات مجھے ناممکن نہیں معلوم ہوئی۔ ایک بے محابا مسرت اور بے لوث یقین کامل سیلاب کی طرح میرے آر پار گزر گیا۔ ہاں، بالکل! بیس سال بعد وہ گھر لوٹنا چاہتا ہے۔ وہ یہاں آرہا ہے، جہاں — ہمیں بات گول مول انداز میں کہنے کی کیا ضرورت ہے؟— وہ ہر کس کا کسی نہ کسی اعتبار سے مقروض ہے، پیسوں کا، وعدوں کا، عہد و پیمان کا! وہ ایسی جگہ واپس آرہا تھا جہاں اس کی ہر ملاقات اسے لامحالہ اضطراب اور دکھ ہی پہنچائے گی؛ وہ ماضی کا سامنا کرنے کے لیے لوٹ رہا ہے، آخرکار، اپنا قول نبھانے کے لیے۔ اس لمحے کیسی طاقت، کیسی امید میرے پورے وجود میں سما گئی! اب مجھے اس سے دوبارہ ملنے کا دھڑکا نہیں محسوس ہو رہا تھا۔ لوگ اپنی شکست گاہوں کی طرف لوٹ آنے پر مائل نہیں ہوتے، پوری ایک دہائی کی غیر حاضری کے بعد تو بالکل نہیں۔ اس مشکل سفر کو اختیار کرنے کے لیے اسے ایک طویل عرصے تک خود کو تیار کرنا پڑا ہوگا، میں نے ہمدردی سے سوچا۔ یقیناً اس نے ایک مدت خود کو تیار کرنے میں لگائی ہوگی اور اس فیصلے تک پہنچنے کے لیے خدا جانے کیسی کیسی غلط راہوں کو چھاننا پڑا ہوگا، کیسی کیسی پھسلنی چٹانوں سے دامن بچایا ہوگا! ایسا لگ رہا تھا جیسے میں دفعتاً جاگ پڑی ہوں۔ لیوش کی آمد کے انتظار میں اس باؤلی امید نے، جو ہر باہوش جھجک اور تامل کو دور بہا لے گئی تھی، اور چڑھتے سورج کی طرح چمکدار اس صاف بینی نے اب مجھے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، میرے تمام شک و شبہات کو زائل کر دیا تھا۔ لیوش بچوں سمیت آرہا ہے، وہ اب راستے میں ہے، ٹھیک اس لمحے وہ مجھ سے بہت قریب ہے۔ اور ہم، جو اسے جانتے پہچانتے ہیں، اس کی کمزوریوں سے واقف ہیں، ہمیں چاہیے کہ اس عظیم حساب کتاب کے لیے تیار ہو جائیں جب لیوش ہر متنفس کا حساب بے باق کر رہا ہوگا: وہ اپنے عہد و پیمان پورے کرے گا، اپنے قرضے اتارے گا! نونو، جو اس

درمیان میں دبے پاؤں دروازے میں آ کھڑی ہوئی تھی، ہماری گفتگو سنتی رہی اور پھر اس نے آہستہ سے مداخلت کی، ''اینڈرے نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ جلد ہی یہاں پہنچ رہا ہے۔ کہا ہے کہ لیوش نے اسے سرکاری حیثیت سے شامل ہونے کی ہدایت کی ہے۔''

اس پیغام نے میری امیدوں کو کچھ اور بھی شہ دی۔ لیوش کو ایک قانون داں کی ضرورت تھی! ہم بے تحاشا باتیں کر رہے تھے۔ لاتسی نے اعلان کیا کہ شہر بھر نے لیوش کی قریب الوقوع آمد کا سن رکھا ہے۔ گذشتہ شب کیفے میں ایک درزی لاتسی کے پاس آیا اور لیوش کے پرانے حساب کتاب کا ذکر کرنے لگا جو اس نے ابھی تک نہیں چکایا تھا۔ ایک ناظم شہر نے کنکریٹ کی ان بنچوں کا رونا رویا جو اس نے لیوش کے کہنے پر پندرہ سال پہلے منگوائی تھیں، جن کی ضمانتی رقم بھی جمع کرادی گئی تھی اور جو کبھی آ کر نہ دیں۔ اب اس چہ چانے میری یادوں کو پراگندہ نہیں کیا۔ لیوش کا ماضی اسی قسم کے جلد ہاتھ آنے والے اور جلد ہاتھ سے جانے والے وعدوں اور منصوبوں سے اٹا ہوا تھا۔ اب یہ صرف بچکانہ غیر ذمے داری کی حرکتیں نظر آتے تھے۔ ہم تب تک چند بڑے آزمائشی ادوار سے گزر چکے تھے۔ لیوش پچاس سے تجاوز کر چکا ہے اور بے پر کی اڑانا بھی چھوڑ چکا ہوگا۔ وہ اپنے سارے اعمال کی ذمے داری لے گا، اور ہمارے پاس آنے کے لیے روانہ ہو چکا ہوگا۔ میں جمگھٹے سے اٹھی تا کہ ایسے تقریباتی موقعے کی مناسبت سے ڈھنگ کا لباس پہن لوں۔ لاتسی بیٹھا پرانی یادوں کی بازخوانی کر رہا تھا۔

''وہ ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ مانگتا رہتا تھا۔ یاد ہے، تیمور، جب تم اس سے آخری بار اس تکرار کے بعد ملے جس میں تم نے اس کے منھ پر اسے بدمعاش کہا تھا، اس کی ساری کوتاہیاں گنائی تھیں، وہ تمام نقصان جو اس نے اپنے خاندان اور دوستوں کو پہنچایا تھا، اور کہا تھا کہ وہ رذیلوں میں رذیل ترین آدمی ہے، تو وہ کس طرح پہلے رویا دھویا تھا اور پھر سب کو گلے سے لگا لیا تھا اور الوداعی ادا کے طور پر کچھ اور رقم مانگ بیٹھا تھا؟ ایک یا دو سو؟ یاد ہے؟''

''نہیں تو،'' تیمور ندامت اور بے اطمینانی سے بولا۔

''لیکن تمھیں ضرور یاد ہونا چاہیے!'' لاتسی چلّایا۔ ''اور جب تم نے رقم دینے سے انکار کر دیا تو وہ کس جھپا کے ساتھ وہاں سے سٹک لیا تھا، کسی ایسے آدمی کی طرح جو گویا اپنی موت سے عنقریب ہمکنار ہونے والا ہو۔ اس وقت ہم لوگ یہیں تھے، ٹھیک اسی باغ میں، بس عمر میں دس سال کم، اور

Scanned with CamScanner

لیوش کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ لیکن وہ گیٹ کے پاس آ کر رک گیا، پھر واپس آیا اور نہایت آہستگی اور سکون سے تم سے بیس کا نوٹ مانگا تھا، یا کم از کم کچھ ریزگاری ہی سہی، اس کے بقول —— کیونکہ اس کے پاس ریل کا کرایہ نہیں تھا! اور پھر تم نے اسے رقم دے ہی دی تھی۔ کیا کبھی کوئی ایسا آدمی بھی ہوگا!'' لاتسی نے بڑے جوش وخروش سے اعلان کیا اور کھانا جاری رکھا۔

''ہاں، دی تھی،'' سمبور نے خجالت کے ساتھ اعتراف کیا۔ ''آخر کیوں نہ دیتا؟ میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ اگر پاس پیسے ہوں تو آدمی دوسروں کو کیوں نہ دے۔ اور لیوش کے نزدیک یہ طرز عمل کوئی اہم بات نہیں تھی،'' اس نے متفکرانہ انداز میں اپنی کوتاہ بیں آنکھوں سے چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

''لیوش کے لیے پیسہ اہم نہیں تھا؟'' لاتسی نے سچ مچ حیرانی سے سوال کیا۔ ''یہ تو وہی بات ہوئی کہ آپ کہیں بھیڑیوں کو خون سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔''

''تم نہیں سمجھتے،'' سمبور سرخ پڑتے ہوئے بولا۔ وہ ہمیشہ ایسے موقعوں پر سرخ پڑ جاتا تھا جب اس کے منصف کے کردار کو گزند پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہ کردار جو احتیاط اور فیصلے کا متقاضی ہوتا ہے، جہاں اسے یہ جانتے ہوئے بھی درست قولِ فیصل دینا ہوتا ہے کہ یہ قول انصاف کے اس عام مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا جس پر زیادہ تر لوگ اعتبار رکھتے ہیں، اور جس کی حمایت کا اس نے حلف اٹھایا ہے۔ ''تم نہیں سمجھتے،'' اس نے ہٹ دھرمی سے دہرایا۔ ''میں نے لیوش کی بابت بہت سوچ بچار کیا ہے۔ یہ سارا معاملہ غرض کا ہے۔ لیوش کی اغراض سو فیصد مستحسن تھیں۔ مجھے ایک موقع یاد آتا ہے... ایک دعوت میں جب اس نے پیسے مانگے تھے، بہت بڑی رقم، اور اگلے دن مجھے پتا چلا کہ اس نے یہ سارے کا سارا میرے ایک کلرک کے حوالے کر دیا جو کسی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ ذرا رکو، میں نے ابھی بات ختم نہیں کی ہے۔ ظاہر ہے یہ ایثار کا کوئی سورمائی عمل نہیں ہے کہ آدمی دوسرے کے پیسے پر فیاضی بگھارے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود لیوش کو بھی پیسے کی سخت ضرورت تھی، اس پر وا جب ہنڈیوں کی معیاد ختم ہو گئی تھی، اب کیا کہوں... یہ خاصی ناگوار ہنڈیاں تھیں۔ اور یہ رقم، جو اس نے نشے کی حالت میں ادھار لی تھی، اگلی صبح مکمل ہوش کے عالم میں ایک اجنبی کے سپرد کر دی، حالانکہ یہ خود اس کے کام بھی آ سکتی تھی۔ سمجھے؟''

''نہیں،'' لاتسی نے پوری سادہ دلی سے کہا۔

''میرا خیال ہے میں سمجھ گیا،'' تیمور بولا، اور پھر حسبِ معمول اپنے کہے پر پچھتاتے ہوئے بڑی اکھڑ خاموشی اختیار کر لی۔

نوتو نے صرف اتنا اضافہ کیا، ''ذرا ہوشیار رہنا، بہر حال وہ پیسے ہی کے چکر میں تو ہے۔ لیکن خیر، ہوشیار رہنے سے ہوگا بھی کیا! تیمور لامحالہ اسے اور رقم دے ہی دے گا۔''

''نہیں، اب میں نہیں دینے والا،'' تیمور نے ہنستے اور سر ہلاتے ہوئے کہا۔

نوتو نے کندھے اچکائے۔ ''ہاں ظاہر ہے، تم کیوں دو گے! پچھلی مرتبہ کی طرح۔ تم اسے کچھ نہ کچھ ضرور پکڑا دو گے۔ ایک اور بیس کا نوٹ۔ وہ ایسا آدمی ہے جسے ضرور دینا چاہیے۔''

''لیکن نوتو، ایسا کیوں کہتی ہو؟'' لاتسی نے پوچھا، اچنبھے اور صاف طور پر رقابت کے ساتھ۔

''اس لیے کہ وہ تم سے زیادہ طاقتور ہے،'' نوتو نے لاپروائی سے کہا۔ پھر وہ واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔

میں آئینے کے سامنے کھڑی کپڑے پہن رہی تھی کہ چکر سا آنے لگا اور مجھے سہارے کے لیے ہاتھ سے ٹٹولنا پڑا۔ ایک خیالی منظر سامنے آیا۔ مجھے ماضی اتنا صاف نظر آیا گویا حال ہو۔ میں نے باغ کو دیکھا، وہی باغ جہاں ٹھیک اس وقت ہم لوگ لیوش کا انتظار کر رہے تھے، دیودار کے تناور درخت کے نیچے، لیکن تب ہم عمر میں بیس سال چھوٹے تھے، ہمارے دل یاس اور برہمی سے لبریز تھے۔ ناملائم، جوش بھرے الفاظ یوں بھنبھنا رہے تھے جیسے خزاں کی ہوا میں مکھیاں۔ اُس وقت بھی خزاں کا موسم تھا، ستمبر کا آخر۔ ہوا میں مہک اور نمی تھی۔ تب ہم بیس سال چھوٹے تھے، کنبے والے، اور دور دراز کے واقف کار، اور لیوش ہمارے درمیان کسی رنگے ہاتھوں پکڑے گئے چور کی طرح کھڑا تھا۔ میں اسے وہاں کھڑا دیکھ رہی ہوں، بناہٹ بڑبڑائے، ذرا ذرا آنکھیں جھپکاتا، گاہے گاہے عینک اتار کر اسے بڑی احتیاط سے صاف کرتا ہوا۔ وہ ہیجان میں آئے ہوئے مجمعے کے بیچ کھڑا ہے، اس متنفس کی طرح بالکل پرسکون جسے معلوم ہو کہ کھیل ختم شد، کہ سب کچھ طشت از بام ہو چکا ہے اور اب کچھ کرنے کے لیے باقی نہیں رہا، اِلّا یہ کہ صبر کے ساتھ کھڑے ہو کر فیصلہ سنا جائے۔ پھر اچانک وہ جا چکا ہے، اور ہم اپنے میکانکی انداز پر پھر سے زندگی گزار رہے ہیں، موم کی پتلیوں کی طرح۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے ہم

صرف دیکھنے ہی میں زندگی گزار رہے ہیں؛ ہماری اصلی زندگیاں تو لیوش کے ساتھ ہماری جنگیں تھیں؛ اور ہمارا منہ زور جذبہ تو اس کے ہاتھوں بے کیف ہوتا تھا۔

اور اب وہ عنقریب دوبارہ اسی پرانے حلقے میں شامل ہونے والا تھا۔ میں نے اپنا ہلکے بنفشئی رنگ کا لباس پہنا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی قدیم تھیٹری لباس پہنا جا رہا ہو، زندگی کا پیراہن۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہر وہ عنصر جو آدمی کی نمائندگی کرتا ہو — اس کا کس بل، اس کا اپنا مخصوص طرزِ حیات — وہ اس کے مخالفین میں زندہ رہنے کے ایک مخصوص پیکر کو ابھارتا ہے۔ ہم سب اُسی کے تھے، اور اس کے خلاف متحد بھی تھے، اور اب جبکہ وہ ہماری طرف آنے والے راستے پر تھا، ہم اپنی اپنی مختلف زندگیاں گزار رہے تھے جو زیادہ ولولہ انگیز بھی تھیں اور زیادہ خطرناک بھی۔ میں اپنے کمرے میں آئینے کے سامنے، اپنے گزرے وقتوں کے لباس میں کھڑی یہ سب محسوس کر رہی تھی۔ لیوش اپنے ہمراہ ماضی اور زندہ ہونے کا لازماں احساس دونوں ہی واپس لا رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ نہیں بدلا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ نونو کی بات حرف بہ حرف صحیح نکلے گی۔ مجھے معلوم تھا ہم اپنی مدافعت کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی جانتی تھی کہ میرے پاس زندگی کے اور چھور کو سمجھنے کا ہنوز کوئی سراغ موجود نہیں، نہ خود اپنی زندگی کو سمجھنے کا، نہ دوسروں کی زندگیوں کو، اور اگر میں صداقت تک پہنچ سکتی تھی تو صرف لیوش کی اعانت سے ہی — ہاں، دروغ گو لیوش کے ذریعے ہی۔ باغ جان پہچان کے لوگوں سے بھرنے لگا تھا۔ کہیں کوئی کار اپنا ہارن بجا رہی تھی۔ اچانک ایک بے پایاں سکون مجھ پر چھا گیا: مجھے معلوم تھا کہ لیوش آ گیا ہے کیونکہ نہ آنا اس کے بس میں نہ تھا، اور کہ ہم اسے خوش آمدید کہہ رہے ہیں، کیونکہ اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہ تھا، اور یہ سب کا سب سخت مہیب تھا، اس کے لیے بھی اتنا ہی ناخوشگوار اور ناگزیر جتنا ہمارے لیے۔

9

لیکن حقیقت نے، اس معجزاتی برفانی پھوار نے، مجھے میرے خواب سے بیدار کر دیا۔ لیوش آ پہنچا تھا اور دن شروع ہو چکا تھا، لیوش سے ملاقات کا دن، وہ دن جس کا ذکر صبور، لاتسی اور اینڈرے

Scanned with CamScanner

مرتے دن تک کرنے والے تھے، اس کے الفاظ کو توڑ مروڑ کر، ایک دوسرے کی تصحیح کرتے ہوئے، حقیقت کی گوناگوں صورتوں کو حاضر کرتے اور ان کو جھٹلاتے ہوئے۔ میں اُس دن کے واقعات کا بے کم و کاست بیان کرنا چاہتی ہوں۔ اس کی آمد کی حقیقی اہمیت کو سمجھنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ اس کی شروعات کسی گشتی سرکس کی اشتہار بازی کی طرح ہوئی، اور اس کا اختتام... لیکن نہیں، میں اختتام کا، اس کی رخصت کا مقابلہ کسی چیز سے نہیں کر سکتی۔ لیوش رخصت ہوا، دن اپنی انتہا کو پہنچا، اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری زندگیوں کی ایک واردات بھی۔ اور ہم پھر سے زندگی کرنے لگے۔

لیوش پورے جانور خانے سمیت وارد ہوا۔ گھر کے باہر رکنے والی کار نے پہلے ہی سے لوگوں کی دلچسپی کو ابھار دیا تھا۔ یہ سرخ رنگ کی اور نمایاں طور پر گرانڈیل تھی، جیسے کوئی عوامی ٹرانسپورٹ کی گاڑی۔ مجھ سے ٹھیک وہ لمحہ خطا ہو گیا، اس کی آمد کا لمحہ جس کا دیر سے انتظار تھا، اور صرف لاتسی کے بے مصرف بیان سے، جسے تھیمور ہوشیاری کے ساتھ بیچ بیچ میں درست کرتا گیا، میں یہ مرتب کر پائی کہ گاڑی سے سب سے پہلے اترنے والا ایک نوجوان تھا جس نے بڑے عجیب کپڑے پہنے ہوئے تھے اور بانہوں میں شیر جیسے سر والا کتا اٹھائے تھا۔ کتا کسی بیش قیمت تبتی نسل کا تھا، غصیلا اور کاٹ کھانے کو تیار۔ نوجوان کے پیچھے پیچھے ایک بڑھتی عمر کی عورت نکلی جس نے چہرے پر خوب رنگ روغن تھوپ رکھا تھا۔ اس نے اپنی پوشاک پر، جو کسی قدر کم عمر عورت کے لیے زیادہ موزوں ہوتی، ایک چرمی کوٹ چڑھا رکھا تھا۔ پھر ایوا اتری، پھر گابور، سب سے آخر میں، وہ ہستی جو ڈرائیور کی بغل میں براجمان تھی، لیوش۔ ان لوگوں کی آمد نے خیر مقدمی دستے کو گڑبڑا دیا۔ کوئی بھی پذیرائی کے لیے آگے نہ بڑھ سکا۔ وہ باغ میں کھڑے سرخ کار کو گھور رہے تھے، اور ان کے ایک عضلے کو بھی جنبش نہ ہوئی۔ لیوش ڈرائیور سے محوِ کلام تھا، پھر وہ باغ میں داخل ہوا، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، تھیمور کو پہچانا، اور بغیر سلام علیک کے کہا: "تھیمور، تمھارے پاس بیس کا نوٹ ہوگا؟ ڈرائیور کو کار کے لیے تیل خریدنا ہے اور میرے پاس کھلے نہیں ہیں۔"

اور چونکہ اس نے ٹھیک وہی کہا جس کے کہنے کے سب متوقع تھے، لہٰذا نہ کسی نے احتجاج کیا، نہ کوئی جھنجھلایا: وہ سب اس کے سحر میں آئے ہوئے تھے، باغ میں جہاں انھوں نے بیس سال قبل

اسے آخری بار دیکھا تھا، ٹھیک اسی پیڑ کے نیچے، اسی روشنی میں، اور چونکہ وہ ان سے عین انھیں الفاظ میں مخاطب ہوا تھا جو اس نے ان سے جدا ہوتے وقت کہے تھے، انھوں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک نا قابلِ تغییر قانون ہی کا حصہ ہے، اور چپ ہو رہے۔ تیمور نے بے حسی کے ساتھ مطلوبہ نوٹ اس کے سامنے بڑھا دیا۔ وہ وہاں کچھ اور دیر چپ سوانگ کے تماشے کے اداکاروں کی طرح کھڑے رہے۔ بعد میں لیوش نے ڈرائیور کو اس کی اجرت ادا کی، باغ میں واپس آیا، اور نو واردوں کا حاضرین سے تعارف کرایا۔ سو یہ اس طرح شروع ہوا۔

بعد میں میں نے بارہا حیرت سے سوچا کہ یہ سب لیوش کا جمایا ہوا تو نہیں تھا، یہ سب کچھ جس میں ناٹک کا اشارہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی تھا، بس اتنا تھا کہ ناٹک پن شعوری نہیں تھا۔ اگر عمداً ہوتا تو اس سے لیوش وہ تاثر نہ پیدا کر پاتا جو کر سکا۔ یہ اس لیے کہ عام شیخی باز اور اخلاقی امتیازات سے بے نیاز مسخرے، جو اپنے سماجی حلقے میں تفریحِ طبع بہم پہنچاتے ہیں یا تند و تیز بحث و تکرار کو ہوا دیتے ہیں، آخرکار لوگوں کو اکتاہٹ میں مبتلا کر دیتے ہیں اور لوگ ان سے مجتنب ہونے لگتے ہیں، ٹھیک اسی لیے کہ ان کی ہر حرکت دانستہ اور قابلِ پیش گوئی ہوتی ہے۔ لیکن لوگ لیوش سے دامن نہیں بچاتے، کیونکہ اس کے ننھے منے تماشے اچنبھوں سے بھرے ہوتے ہیں جن سے وہ خود لطف اٹھاتا ہے لیکن جنھیں پہلے سے تیار نہیں کرتا، اور جب کوئی ظریفانہ نکتہ ادا کرتا ہے تو اس وقت نیم خوابی انداز میں ہنسنے اور خود ہی واہ واہ کرنے سے زیادہ اسے کچھ اور مرغوب نہیں ہوتا۔ لیوش اکثر شیکسپیئر کی تقریر دہراتا جو اس طرح شروع ہوتی ہے، ''ساری دنیا ایک اسٹیج ہے...'' وہ اس اسٹیج پر اپنی اداکاری کرتا اور ہمیشہ تاریخی حال کے صیغے میں کھیل کے نمایاں کردار کی نمائندگی کرتا، اور اپنے پارٹ کی مشق کبھی نہ کرتا۔ آج بھی، عین اپنی آمد کے لمحے میں، وہ ہدایت کاری کر رہا تھا، تعارف کرا رہا تھا، اور بڑی بدیہی لذت و سرور کے ساتھ تقریر جھاڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے بچوں کا تعارف ہاتھ کی ایسی حرکت کے ساتھ کرایا کہ جس کی نوع کا تعین مشکل ہے تاہم یہ بلاشبہ تھی میلوڈرامائی ہی، گویا یہ بچے یتیم ہوں۔

اس کے اولین الفاظ تہمت آمیز تھے، تہمت آمیز بھی اور عذر خواہانہ بھی۔ ''یتیموں کو ملاحظہ کیجیے!'' اس نے تیمور اور لاتسی سے دونوں بچوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اعلان کیا جو اس مدت میں بلوغت کو پہنچ چکے تھے: گابور، متلون، کاہل، آنکھیں جھپکاتا اور لدھڑ نوجوان، جو اب ایک

سند یافتہ انجینئر بن چکا تھا؛ اور ایوا، ایک ننھی سی بیگم صاحب، اپنے فیشن ایبل کھیل کود کے کپڑوں میں شہر بھر میں اڑتی پھرتی کسی خاتون سے بہت کچھ ملتی جلتی، گردن کے گرد دو عدد لومڑی کے سمور ڈالے ہوئے، اور لبوں پر خفیف سے تمسخرانہ، آرزومندی کے برہم برہم تبسم سے لیس۔ یتیموں کو ملاحظہ کیجیے! ولما کے بچوں کا تعارف کراتے وقت لیوش کی جنبش کا یہ مدعا تھا، بچے جو واقعی یتیم یا نیم یتیم تھے، جو اب ان تمام رکاوٹوں پر غالب آ چکے تھے جو قسمت نے ان کی راہ میں کھڑی کی تھیں۔ وہ بڑے ہو کر ہمارے ماضی سے ہماری طرف لوٹ کر آ رہے تھے، ایسی بھرپور صحت کے عالم میں جو اعتماد کی دین ہوتی ہے۔ میرے لیے اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے۔ ہم وہاں مبہوت کھڑے ہوئے تھے، جیسا کہ بعد میں بھی اسی عالم میں کھڑے ہونے والے تھے، ہمارے چہرے یتیموں کے مقابل تھے، لیکن نظریں ان سے گریزاں۔ لیوش مسلسل ان کی نمائش کیے گیا، کبھی انھیں سامنے سے دکھاتا، کبھی پہلو سے، یوں جیسے یہ اسے راہ میں پڑے مل گئے ہوں جہاں خدا اور آدمی دونوں ہی انھیں چیتھڑوں میں ملبوس بے آسرا چھوڑ گئے ہوں، جیسے گھر ہی کا کوئی باسی —— تبھور، نونو یا خود میں —— ان یتیموں کی زبوں حالی کا ذمے دار ہو۔ اس نے لفظوں میں ہمیں موردِ الزام تو نہیں ٹھہرایا، لیکن شروع ہی سے جس انداز میں اس نے ایوا اور گابور کو ہمارے روبرو پیش کیا تھا وہ اس کا غماز تھا کہ وہ ہمیں قابلِ الزام ہی سمجھتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ اچنبھے کی بات یہ ہے کہ ہم جو باغ میں مجتمع ہوئے تھے، ان اچھی طرح کھلائے پلائے، بظاہر خوش لباس، اور مزید یہ کہ مشکوک طور پر بالغ اور باوقار، نوعمروں کو دیکھتے ہوئے، جو آسمان سے ہماری گود میں آ ٹپکے تھے، خود کو واقعی ہر بات کا ذمے دار محسوس کر رہے تھے، ذمے دار لفظ کے عام معنی میں، گویا ہم اپنی روٹی کا ایک ٹکڑا یا اپنی شفقتیں کسی ایسے شخص کو دینے کے انکاری ہوں جو ان کی توقع کرنے کا مستحق اور ضرورت مند بھی ہو۔ دونوں یتیم، آرام سے کھڑے بڑے صبر کے ساتھ انتظار کرتے رہے، اِدھر اُدھر یوں نظریں گھماتے رہے جیسے لیوش کے ڈرامائی کرتبوں کے عادی ہوں، یہ جانتے ہوں کہ ڈراما ختم ہونے اور ناظرین کے واہ واہ شروع کرنے تک سوائے انتظار کے کچھ اور نہیں کیا جا سکتا۔ خاموشی کے ایک لمحے کے بعد، جسے ہوشیاری سے متعین کیا گیا ہو، جب تک ہمارا ضمیر 'یتیموں' کے ضمن میں ہمارے جرم سے واقعتاً تربتر ہو چکا تھا، لیوش حسب معمول دو بار کھانسا اور پھر اپنا شعبدہ بازی کا عمل شروع کر دیا۔

Scanned with CamScanner

یہ جادوئی تماشا ساری دو پہر چلتا رہا۔ وہ بڑی گرم خیزی سے اس میں لگا رہا۔ بالکل عیاں تھا کہ یہ گذشتہ تمام تماشوں سے کہیں زیادہ زبردست اور بہتر ثابت ہوگا، اس کے فن کی معراج؛ اس کا پورا دل اس میں لگا ہوا تھا، آنسو بالکل حقیقی تھے، بوسے گرم، اور مختلف کرتبوں کو مرتب کرنے میں حافظے کی بازیگری حیرت انگیز تھی: اس کی خداداد صلاحیت نے سب کو دنگ کر دیا۔ حتیٰ کہ نونو کو بھی۔ اولین گھنٹے میں ہم ایک لفظ بھی منھ سے نہ نکال سکے۔ اس کی اداکاری نے ہمیں دم بخود کر دیا تھا۔ اس نے دو بار نونو کو بوسہ دیا، ایک مرتبہ دائیں، دوسری مرتبہ بائیں رخسار پر، پھر اپنے بٹوے سے ریاست کے سیکرٹری کا خط نکالا۔ اس میں اُس بلند مرتبت افسر نے لکھا تھا کہ اسے لیوش کا پیغام وصول ہوا ہے جس میں نونو کی بحیثیت پوسٹ مسٹرس فوری تقرری کی درخواست ہے، اور یہ کہ وہ اس مسئلے کی بابت ہنوز سرگرم عمل ہے۔ میں نے خط کو بچشم خود دیکھا؛ وہ سرکاری کاغذ پر لکھا گیا تھا، باقاعدہ مہر اور آبی نشان لگا ہوا تھا، اور بالکل اوپر بائیں کونے میں مضبوط مدور تحریر میں ''سیکرٹری ریاست'' کے لفظ نظر آرہے تھے۔ خط مستند تھا، بالکل اصلی۔ حقیقت میں لیوش نے نونو کے حق میں یہ قدم اٹھایا تھا۔ بس اتنا ہے کہ کسی نے بھولے سے بھی یہ ذکر نہیں کیا کہ ایسا کرنے کا وعدہ اس نے نونو سے پندرہ سال پہلے کیا تھا، اور سب اس باب میں بھی بالکل مہر بہ لب رہے کہ اب نونو کی عمر کم و بیش ستر کو پہنچ رہی تھی، کہ زمانہ ہوا وہ پوسٹ مسٹرس بننے کا جو کچھ عزم بھی کبھی رہا ہو چھوڑ چھاڑ چکی تھی، کہ اب وہ اس قابل کہاں رہی تھی اور اس عمر میں اتنی ذمے داری کے کام پر کہاں رکھی جا سکتی تھی، اور مختصراً یہ کہ لیوش کے اس کریمانہ فعل کو پورے پندرہ سال کی تاخیر ہوگئی تھی۔ کسی نے بھی اس پر ذرا غور نہیں کیا۔ ہم سب اُن دونوں، لیوش اور نونو، کے گرد کھڑے تھے، ہماری آنکھیں طمانیت اور فرط انبساط سے چمک رہی تھیں۔ میبور نے فخر سے چاروں طرف نظر ڈالی، اس کی عینک آسودگی سے جگمگا رہی تھی۔ ''تو دیکھا؟ ہم غلطی پر تھے! بالآخر لیوش نے اپنا وعدہ پورا کر ہی دیا،'' وہ نگاہ یہ کہہ رہی تھی۔ لاتسی ہڑبڑاہٹ سے مسکرایا، تاہم اس لمحے صاف طور پر وہ بھی لیوش پر فخر محسوس کر رہا تھا۔ نونو کے آنسو نکل آئے۔ شمالی ہنگری میں واقعے اپنے قصبے میں وہ تیس برس نائب پوسٹ مسٹرس رہی تھی، اس امید خام میں کہ ایک روز اسے بھی ترقی مل جائے گی، لیکن جب وقت کے ساتھ ساتھ اس امید پر اوس پڑ گئی تو اس نے اس عہدے کو کبھی حاصل کرنے کے خواب تج دیے اور یہاں ہمارے یہاں رہنے چلی آئی۔ اس نے اب اشکبار

Scanned with CamScanner

آنکھوں سے خط پڑھا، ان سطروں سے بے حد متاثر ہوئی جن میں اس کا نام مذکور تھا۔ سیکرٹری ریاست کسی چیز کا وعدہ نہیں کر رہا تھا، لیکن نونو کو امید دلانے کے لیے اس کا یہی کہنا کافی تھا کہ وہ اس کے معاملے میں موافقت کرنے پر مائل ہوگا اور وہ اس ''امکان کی بابت پوچھ تاچھ'' کرے گا۔ ان سب باتوں کی کوئی عملی حیثیت نہیں تھی، لیکن نونو نے پھر بھی آنسو بہائے اور آہستگی سے بولی، ''شکریہ، پیارے لیوش۔ اب غالباً اس کا وقت نکل چکا ہے، تاہم میں بہت خوش ہوں۔''

''ارے کہاں نکل چکا ہے،'' لیوش بولا۔ ''تم دیکھو گی کہ کوئی دیر ویر نہیں ہوئی ہے۔''

اس نے اتنے اعتماد سے یہ اعلان کیا کہ لگا کہ اس کے نہ صرف سیکرٹری ریاست بلکہ خود خدا سے رازدارانہ مراسم ہیں، کہ اگر چاہے تو عمر اور موت کے معاملات بھی طے کروا سکتا ہے۔

ہم نے اس کی بات سنی اور اور متاثر ہوے۔

پھر بھی بڑے جوش و خروش سے باتیں کرنے میں لگ گئے، ''مسٹر'' اینڈرے آ پہنچے اور کنکریٹ کی بنچ کے برابر کچھ لیے دیے اور بدحواس سے کھڑے ہو گئے، کسی ایسے شخص کی طرح جو وہاں بہ رضا و رغبت نہ آیا ہو بلکہ جسے لیوش نے ''سرکاری حیثیت'' میں طلب کیا ہو۔ لیوش انتظام میں لگ گیا۔ اس نے لوگوں کا تعارف کرایا، انھیں دلکش ٹولیوں میں تقسیم کیا، اور چھوٹے موٹے ناٹک دکھانے لگا —— الوداعی منظر، دلشادی کے اور آبدیدہ مصالحتوں کے منظر —— اور یہ سب برائے نام لفظوں یا کنایوں میں۔ ملاقاتوں کی غرض و غایت کو اس نے ناٹکی، پر تصنع، اور اجتماعی سرگرمیوں کے عقب میں صیغۂ راز میں رکھا جو کسی بھی مظروف سے یکسر خالی تھیں۔ اور لوگ دکھاوے کی خاطر اس سے تعاون کرتے رہے۔ ہم بھی بوکھلائے بوکھلائے مسکرا رہے تھے، حتیٰ کہ اینڈرے بھی، بریف کیس بغل میں دبائے، جس کے مشمولات کا ہمیں کبھی پتا نہیں چل سکا، جس کی بس خالص علامتی حیثیت ہی تھی، محض ایک دفاعی کارروائی کی، یعنی یہ کہ خود تو کبھی نہ آیا ہوتا، سرکاری کام سے آنا پڑا۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ سب لیوش کی یہاں موجودگی پر خوش تھے، اور اس دوبارہ ملاپ میں اپنی موجودگی پر۔ اگر ایک چھوٹا سا گروہ باغ کی باڑ کے پیچھے جمع ہو کر نغمہ زن ہو جاتا تو مجھے اس پر ذرا تعجب نہ ہوتا۔ لیکن ابتری کے ہمہ گیر طوفان میں انفرادی تفصیلات عام خوش وقتی کے سیلاب میں بہہ کے رہ گئی تھیں۔ بعد میں، جھٹ پٹے کے قریب، جب ہمارے ہوش و حواس بحال ہوے تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف

حیرت سے دیکھا، یوں جیسے کسی ہندوستانی فقیر کے سحر زدہ ہوں جو مستعدی سے اپنا کرتب دکھا رہا ہو؛ فقیر نے رسی ہوا میں اچھال دی تھی، اور اس پر چڑھتا ہوا ٹھیک ہماری آنکھوں کے سامنے بادلوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ ہم آسمان کی طرف تک رہے تھے، اسے وہاں تلاش کر رہے تھے، اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے کہ وہ تو ہمارے درمیان ہی جھکا آ رہا تھا، یہیں اسی زمین پر، اپنا کاسۂ گدائی سامنے کیے۔

10

نونو نے تازہ تازہ ناشتہ بنا کر لگا دیا۔ مہمان برآمدے میں جم کر بیٹھ چکے تھے اور بے چینی سے کھانے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرنے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لیوش کی موجودگی کا سحر ہے جس نے انھیں برہم ہونے سے باز رکھا ہے۔ یہ سو فیصدی ناٹک تھا، اس کا ایک ایک لفظ۔ ساعتوں کو بڑی فنکاری سے کھچا کھچ بھرا گیا تھا: پہلا منظر: 'طعام'، دوسرا منظر: 'باغ کی سیر'۔ ہدایت کار کی نگاہ سے لیوش کبھی کبھار جب دیکھتا کہ یہ یا وہ ٹولی پیچھے رہ گئی ہے تو تالی بجا کر اسے پھر سے قطار میں لے آتا۔ بالآخر وہ باغ میں میرے ساتھ تنہا رہ گیا۔ لاتسی برآمدے میں بڑے کروفر سے بولے جا رہا تھا، پورے انہماک اور غیر محتاط انداز سے، منہ ٹھسا ٹھس بھرا ہوا۔ وہی سب سے پہلے لیوش کے جادو کے آگے سپر انداز ہوا تھا، اپنے شبہات بھلا دیے تھے، اور ایک مانوس موجودگی کی شعاعوں میں خوشی خوشی اور کھلم کھلا نہا رہا تھا۔ لیوش نے جو پہلے الفاظ مجھ سے کہے یہ تھے:

''اب ہم نے سب کچھ ٹھیک کر دیا ہے۔''

یہ سن کر میرا دل مارے گھبراہٹ کے زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ میں اس کے بالمقابل کنکریٹ کی بنچ کے برابر درخت کے نیچے کھڑی تھی جہاں اس نے مجھ سے کتنی ہی بار جھوٹ بولا تھا۔ بالآخر میں نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔

اس کے سبھاؤ میں عجیب سی غم انگیزی تھی، کوئی ایسی چیز جس سے مجھے کسی ڈھلتی عمر کے فوٹو گرافر یا سیاست داں کا خیال آیا جس کے آداب و اطوار اور آرا زمانے کے دوش بدوش نہ ہوں لیکن پھر بھی وہ نہایت ہٹ دھرمی اور کسی قدر ناگواری سے خوشامد کے وہی القاب بولے جا رہا ہو جنھیں برسہا برس تک

Scanned with CamScanner

استعمال کرتا رہا ہو۔ وہ ایک جانور سدھانے والا تھا جس کا بہترین وقت گزر چکا تھا، جس سے جانوروں نے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا لباس بھی عجیب دقیانوسی وضع کا تھا: یوں جیسے کہ وہ ہر قیمت پر نئے ڈھب کا ساتھ دینا چاہتا ہو لیکن کوئی اندرونی بھوت اسے اس طور پر سجنے یا فیشن ایبل ہونے سے باز رکھ رہا ہو جسے وہ ضروری خیال کرتا ہو اور جس کا شیدا بھی ہو۔ مثال کے طور پر اس کی ٹائی کا رنگ، اس کے باقی کپڑوں، عمر اور کردار کے لحاظ سے، کچھ زیادہ ہی شوخ تھا، اور اس میں وہ کچھ اس مرد کی طرح نظر آتا تھا جو کسی عورت کا رکھیل ہو۔ اس کا سوٹ ہلکے رنگ کا تھا، اس اعتبار سے فیشن ایبل کہ ڈھیلا ڈھالا اور سفر کے لیے بنایا گیا لگتا تھا، اس قسم کا سوٹ جو رسالوں میں ذی حیثیت لوگوں کے بدن پر ان کی جہاں گردی کے دوران دکھایا جاتا ہے۔ ہر چیز ضرورت سے کچھ زیادہ ہی نئی نویلی تھی، موقعے کے لحاظ سے خاص طور پر منتخب کردہ، حتیٰ کہ اس کا ہیٹ اور جوتے بھی۔ اور ان سب سے ایک مخصوص بے کسی مترشح تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ اگر وہ چیتھڑوں میں آیا ہوتا، ایک شکستہ آدمی، جس کے پاس امید کی ایک دھجی بھی باقی نہ رہی ہو، تو شاید میں نے ہمدردی کے اس سستے سے جذبے کو برداشت نہ کیا ہوتا۔ اسے اپنے کیے کا پھل مل رہا ہے، میں نے خیال کیا ہوتا۔ لیکن اس لاچار طرحداری نے، جو ندامت سے اس درجہ قریب تھی، مجھے ترحم سے بھر دیا۔ میں غور سے دیکھتی رہی اور اچانک اس پر افسوس کرنے لگی۔

''بیتھولیوش،'' میں نے کہا۔ ''مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

میں آسودہ خاطر اور مخلص تھی۔ اب اس سے ہراساں نہیں تھی۔ یہ شخص شکست خوردگی کے تجربے سے گزر چکا ہے، مجھے خیال آیا، اور اس خیال سے مجھے کوئی طمانیت نہیں ہوئی۔ سچ پوچھیں تو مجھے سوائے ترحم کے کچھ اور محسوس نہیں ہو رہا تھا، ایک شدید اور خفت میں مبتلا کر دینے والا ترحم؛ یوں جیسے کہ میں نے اسے اپنے بال رنگتے یا ایسی ہی کوئی نازیبا حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ مثالی صورت میں میں نے اسے ماضی کے حوالے سے صلواتیں سنائی ہوتیں، اور حال کے حوالے سے بھی، اور جی بھر کے سنائی ہوتیں، لیکن کسی خاص درشتی کے بغیر۔ اچانک میں نے عمر اور بلوغت دونوں میں خود کو اس سے کہیں زیادہ بڑا محسوس کیا۔ کسی نقطے پر آ کر لیوش کا ارتقا رک گیا تھا اور وہ ایک گستاخ، قابلیت جھاڑنے والے دھوکے بازکی جون میں پختہ عمر کو پہنچا تھا، جو، ظاہر ہے، کوئی ایسی خاص خطرناک بات نہیں تھی لیکن سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ایک، قدرے بے مقصد

Scanned with CamScanner

بات ضرور تھی۔ اس کی آنکھیں شفاف، بے کیف، قوتِ ارادی سے عاری تھیں، جیسی کہ اس وقت تھیں جب زمانوں پہلے میں نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ وہ اپنی سگریٹ کو سگریٹ ہولڈر میں لگائے پی رہا تھا — اس کے ابھری ہوئی نسوں والے ہاتھ خاص طور پر بوڑھے ہو گئے تھے اور مسلسل ہل رہے تھے — اس پر مستزاد یہ کہ وہ مجھے بڑی توجہ سے دیکھے جا رہا تھا، اتنے سکون اور اتنے معروضی طور پر گویا اسے بالآخر بڑے واضح طور پر معلوم ہو گیا ہو کہ مجھے مزید فریب دینا بالکل بیکار اور بے فائدہ ہے؛ یہ کہ میں اس کی چالیں خوب جانتی ہوں، مجھے اس کے فن کے راز معلوم ہیں، اور چاہے وہ کچھ بھی کہے، آخر میں اسے جواب لفظوں میں یا بلا لفظ دینا ہی ہوگا، لیکن اس بار اسے سچ ہی بولنا پڑے گا... قدرتی طور پر، اس نے جھوٹ سے ابتدا کی۔

''میں سب کچھ ٹھیک کر دینا چاہتا ہوں،'' اس نے مشینی طور پر اپنے الفاظ دہرائے۔

''تم کیا ٹھیک کرنا چاہتے ہو؟''

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ کچھ بھی ہو، یہ سنجیدہ بات نہیں ہو سکتی، میں نے سوچا۔ جب لوگوں کے درمیان اچھا خاصا وقت گزر چکا ہو تو پھر کچھ بھی 'ٹھیک کرنا' ممکن نہیں رہتا۔ جس لمحے ہم دونوں کنکریٹ کی بنچ پر بیٹھ رہے تھے، ٹھیک اسی لمحے میں اس ناگزیر صداقت کو جان گئی تھی۔ زندگی گزارتے ہوئے آدمی اسے رفو کرتا ہے، بہتر بناتا ہے، تعمیر کرتا ہے، یا، بسا اوقات، اسے برباد کر کے رکھ دیتا ہے، لیکن ایک عرصہ گزر جانے کے بعد اس کی توجہ میں آتا ہے کہ وہ شے، جو غلطیوں اور حادثوں سے یوں مرکب رہی ہے، بڑی منفرد ہے۔ لیوش اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب کوئی ماضی سے نمودار ہو کر بڑے دل سے اعلان کرے کہ وہ ''ہر چیز'' کو ٹھیک کر دینا چاہتا ہے تو اس کے عزم پر آدمی صرف افسوس کر سکتا ہے اور ہنس سکتا ہے: وقت نے اپنے عجیب انداز میں سب چیزوں کو ٹھیک کر دیا ہوتا ہے، اس واحد انداز میں جس میں کسی چیز کو ٹھیک کیا جا سکتا ہو۔ سو میں نے جواب دیا:

''اسے بھول جاؤ، لیوش۔ تمھیں... بچوں کو اور خود تمھیں دیکھ کر ہم سب خوش ہیں... ہاں، بالکل۔ ہمیں معلوم نہیں کہ تم کیا چاہتے ہو، پھر بھی تمھیں دوبارہ دیکھنے پر ہم خوش ہیں۔ ماضی کا ذکر رہنے دو۔ تم کسی چیز کے لیے بھی کسی کے مقروض نہیں۔''

Scanned with CamScanner

یہ سب کہتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خود میں بھی اس لمحے کی کیفیت کی گرفت میں تھی، میں بھی وہی باتیں کہہ رہی تھی جو ذہن میں بے ساختہ در آئی تھیں، جو اگر صاف صاف کہا جائے تو خود بے اصل تھیں۔ جذبے کا وفور اور اس کے ساتھ آنے والی گڑبڑاہٹ ہی اس مبالغے اور اعلان کا موجب ہو سکتے تھے کہ ماضی کا وجود نہیں رہا ہے، کہ لیوش ''کسی چیز کے لیے بھی کسی کا'' مقروض نہیں۔ ہم دونوں ہی اس سُر کے کھوکھلے پن سے آگاہ تھے اور نظریں جھکا کر کنکریوں کو تکنے لگے۔ ہم نے جو لہجہ ایک دوسرے کے لیے اختیار کیا تھا کچھ زیادہ ہی بلند آہنگ تھا: زیادہ بلند آہنگ اور اتنا ہی زیادہ ڈرامائی، بے حقیقت۔ یکبارگی مجھے احساس ہوا کہ میں بھٹکنے لگی ہوں، بہت زیادہ منطقی اعتبار سے تو نہیں لیکن کم از کم تصنع سے عاری انداز میں ضرور، کیونکہ اب خود کو روکے رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔

''مجھے اس میں شک ہے کہ تم صرف اسی وجہ سے واپس آئے ہو،'' میں نے آہستگی سے کہا کیونکہ میں خائف تھی کہ وہاں برآمدے میں ہونے والی گفتگو میں کبھی کبھار جو خاموشی کا وقفہ آجاتا تھا اس میں لوگ ہماری آواز سن نہ لیں، وہ نہ سن لیں جو میں کہہ رہی تھی۔

''نہیں،'' اس نے کہا اور کھانسا۔ ''نہیں، صرف یہی وجہ نہیں ہے۔ نہیں ایستھر، میرے لیے تم سے ایک آخری بار بات کرنا ضروری تھا۔''

''میرے پاس اب کچھ باقی نہیں رہا،'' میں نے اضطراراً کہا، کسی قدر جسارت سے۔

''مجھے اب اور کچھ نہیں چاہیے،'' وہ بولا، ظاہراً برا نہ مانتے ہوئے۔ ''اب تو میں تمھیں کچھ دینا چاہتا ہوں۔ دیکھو، بیس سال گزر گئے ہیں... بیس سال! اب اس جیسے مزید کئی اور بیس سال نہیں ہوں گے، ہوسکتا ہے کہ یہ آخری ہوں۔ بیس سال میں چیزیں واضح ہو جاتی ہیں، زیادہ شفاف، زیادہ قابل فہم۔ اب مجھے معلوم ہے کہ کیا ہوا تھا، اور یہ بھی کہ کیوں ہوا تھا۔''

''کتنی کراہت انگیز بات ہے،'' میں نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کتنی کراہت انگیز اور مضحکہ خیز۔ ہم یہاں اس بنچ پر بیٹھے ہیں، ہم جو کبھی ایک دوسرے کے لیے اہم تھے، اور مستقبل کی بات کر رہے ہیں۔ نہیں، لیوش، اب کسی قسم کا مستقبل نہیں رہا، میرا مطلب ہے ہمارے لیے۔ چلو حقیقت کی طرف لوٹ چلیں۔ ایک چیز ہے، ایک صفت، جس سے تم واقف نہیں ہو: ایک طرح کا واجبی وقار، وجودِ محض کا وقار۔ میں کافی توہین اٹھا چکی ہوں۔ ماضی پر گفتگو کرنا ہی باعثِ ذلت ہے۔ تم کیا چاہتے

ہو؟ کیا ارادہ ہے؟ یہ اجنبی لوگ کون ہیں؟ ایک دن تم سامان باندھتے ہو، گھیر گھار کر چند لوگوں اور جانوروں کو جمع کرتے ہو، اور سابقہ آن بان سے وارد ہوتے ہو، انھی پرانے لفظوں کے ساتھ، یوں جیسے تم خدا کے کسی حکم کی تعمیل کر رہے ہو... لیکن یہاں لوگ تمھیں جانتے ہیں، ہم تمھیں جانتے ہیں، میرے دوست۔''

میں نے یہ سب بڑے سکون کے ساتھ کہا، ایک مخصوص مضحکہ خیز تفاخر سے، ایک ایک لفظ کو صاف صاف اور پختگی سے ادا کرتے ہوئے، یوں جیسے بڑی مدت تک اس تقریر کو تیار کرتی رہی ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ گمان نہیں تھا کہ اب یہاں کسی چیز کو بھی 'درست' کیا جا سکتا ہو، مجھے اس کی آغوش میں سما جانے کی کوئی خواہش نہیں تھی، میں تو اس سے بحث بھی نہیں چاہتی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی؟ بس لاتعلقی۔ یہ رہا وہ، یہاں وارد ہو چکا ہے، زندگی کے ناٹک میں یہ ایک اور واقعہ ہے، وہ کچھ چاہتا ہے، کسی چکر میں ہے، لیکن اس کے بعد وہ چلتا بنے گا اور ہم اپنے پرانے روزمرہ کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اب اس کا مجھ پر بس نہیں چلتا! میں نے یہ سب محسوس کیا اور ماموئیت، برتری کے انداز میں اسے دیکھتی رہی۔ فرسودہ جذباتی مفہوم میں اب اس کا مجھ پر بس نہیں چلتا۔ لیکن پھر میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس اولین گفتگو کا جوش لاتعلقی سے بہت دور تھا؛ میں جس جذبے کے ساتھ بول رہی تھی اس بات کی علامت تھی کہ ایک تعلق ہنوز باقی تھا جو واہمہ، بناوٹی یا خیالی ہونے سے کوسوں دور تھا، ایک تعلق جو محض ہوائی قلعہ، یادیا ناسٹلجیا نہیں تھا۔ ہم کسی حقیقی چیز کی بات کر رہے تھے۔ اور چونکہ یہ چیز اتنی ضروری تھی، اتنی بہت سی دھند اور کہر کے بعد بھی، میں حقیقت میں کسی پاؤں ٹکانے کی جگہ کی متلاشی تھی۔ سو میں نے بے سوچے سمجھے جلدی سے کہہ دیا۔

''مجھے دینے کے لیے تمھارے پاس کچھ نہیں۔ تم سب کچھ لے چکے ہو، سب کچھ برباد کر چکے ہو۔''

اس نے جواب میں وہی کہا جس کی میں متوقع تھی۔

''سچ کہا۔''

اس نے شفاف سرمئی آنکھوں سے مجھے دیکھا، پھر اپنے سامنے دیکھنے لگا۔ اس نے اپنے لفظ بچکانہ طور پر ادا کیے، جیسے کسی نے امتحان پاس کر لینے پر اسے شاباش کہا ہو۔ میں جھرجھری لے کر رہ

Scanned with CamScanner

گئی۔ یہ کس قسم کی مخلوق ہے؟ اتنا پرسکون۔ اب وہ باغ پر نظر ڈالتا ہوا کسی ماہر تعمیر کی طرح مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے کہا:

''تمھاری ماں کا وہاں انتقال ہوا تھا، بند کھڑکیوں کے پیچھے۔''

''نہیں،'' میں نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کا انتقال زیریں منزل پر بیٹھک میں ہوا تھا جہاں اب تو نور ہتی ہے۔''

''عجیب بات ہے،'' وہ بولا۔ ''میں بھول گیا تھا۔''

پھر وہ اپنی سگریٹ پھینک کر کھڑا ہو گیا، چند مستحکم قدم دیوار کی طرف بڑھائے، اور سر ہلاتے ہوئے اینٹوں کو کھٹکھٹایا۔

''تھوڑی سی سیلی ہوئی ہیں،'' اس نے ناپسندیدگی اور خالی الذہنی سے کہا۔

''ہم نے پچھلے سال ہی اس کی مرمت کرائی تھی،'' میں نے کہا، ہنوز اپنی یادوں میں گم۔

وہ میرے پاس لوٹ آیا اور غور سے میری آنکھوں میں دیکھا اور بڑی دیر تک خاموش رہا۔ ہم نیم بستہ پپوٹوں کے پیچھے سے ایک دوسرے کو تکتے رہے، احتیاط اور تجسس سے۔ اب اس کے چہرے کا تاثر گمبھیر اور ارادت مندانہ تھا۔

''ایک سوال ہے ایستھر،'' اس نے آہستگی اور متانت سے کہا۔ ''صرف ایک سوال۔''

میں نے گرمی اور دورانِ سر محسوس کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بھینچ لیں۔ یہ کیفیت چند لمحے قائم رہی۔ میں نے ہاتھ آگے اٹھایا جیسے اپنی مدافعت کر رہی ہوں۔ لو، ابتدا ہو رہی ہے، میں نے سوچا۔ خدایا، یہ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔ مگر کیا؟ شاید یہ کہ یہ سب کیسے ہوا؟ کیا مجھ میں ہمت کی کمی تھی؟ نہیں، اب مجھے جواب دینا ہی ہوگا۔ میں نے ایک گہری سانس لی، اس کا جواب دینے کے لیے تیار۔

''بتاؤ ایستھر،'' اس نے ہولے سے کہا، اور گہرے جذبے کے ساتھ۔ ''کیا مکان پر قرضے کی ادائیگی ابھی باقی ہے؟''

11

صبح کے واقعات، کم از کم وہ جو اس کے آخری جملے کے بعد پیش آئے، میرے ذہن میں کچھ گڈمڈ سے ہو چلے ہیں۔ ''مسٹر'' ایندرے نے آ پہنچنے کے لیے اسی لمحے کا انتخاب کیا۔ لیوش ہڑبڑا گیا تھا اور جھوٹ بولنے لگا، بڑے زور زور سے۔ کسی ایسے شخص کی طرح جو اپنے خوف پر قابو پانے کے لیے چیخنے چلانے لگے۔ اس نے سلسلۂ کلام کی ابتدا بڑی بلند بانگ بناوٹی خوش اخلاقی اور کھوکھلے تفاخر سے کی جس کا ایندرے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے 'پیارے ہمدمِ دیرینہ' کے انداز میں ایندرے کا بازو تھام لیا اور چند فرحت بخش چٹکلوں سے اس کی تواضع کی، بالکل ایسا رویہ اختیار کیا گویا وہ کوئی بلند مرتبت مہمان ہو جس کا سماجی اعتبار سے کم رتبہ لوگوں کے یہاں بڑی گرمجوشی سے انتظار کیا جا رہا ہو۔ ایندرے نے بڑے سکون سے اس کی بات سنی۔ دنیا میں ایندرے وہ واحد شخص ہے جس سے لیوش کو خوف آتا ہے، جس پر اس کے طلسم قطعی بے اثر ثابت ہوتے ہیں، جو اس قسم کی جادوئی شعاعوں کے معاملے میں، جن کا اس کی دانست میں لیوش سے انعکاس ہوتا ہے اور جو ہر چیز پر، حتیٰ کہ حیوانات اور بے جان اشیا پر بھی، اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتے، ایک اندرونی لاتعلقی کا مالک ہے۔

ایندرے نے لیوش کی بات بڑی توجہ سے سنی، اُس کے پیشہ ورانہ رازوں سے کماحقہ آگاہ، یہ جانتے ہوئے کہ وہ اپنے شعبدے کیسے دکھاتا ہے، اس کے لیے بالکل تیار کہ لیوش کب اپنے ہیٹ سے ترنگا قومی جھنڈا برآمد کرتا ہے اور میز کے بیچوں بیچ سے پھلوں کے طشت کو اُڑن چھو کر دیتا ہے۔ وہ متواضع توجہ سے اس کی بات سنتا رہا، کسی بغض و عناد کے بغیر، جو کچھ لیوش کہنا چاہتا تھا اس میں واضح دلچسپی لیتے ہوئے۔ گویا وہ خود ہی کہہ رہا ہو: مجھے ایک اور شعبدہ دکھاؤ۔ رہا لیوش، تو وہ شعبدوں کے درمیان ذرا ذرا سستا لیتا، گاہے گاہے ایندرے پر محتاط سی نگاہ ڈال لیتا۔

میرا خیال تھا کہ لیوش کے خوف و ہراس کو بھانپنے والی اکیلی میں تھی؛ تیبور اور لاتسی نانک کے حسنِ محض میں بری طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ بعد میں، دوپہر کو، مجھے پتا چلا کہ لیوش کی ہڑبڑاہٹ ننھی ایوا کی توجہ میں بھی آئی تھی۔ لگتا تھا کہ ایندرے کسی سادہ سی ناقابلِ تردید بات سے واقف ہے اور

جب چاہے لیوش کو چت کرسکتا ہے۔ لیکن وہ تمسخر نہیں اڑا رہا تھا، نہ ہی اس کا انداز شمہ برابر بھی غیر دوستانہ تھا۔

''اچھا تو لیوش، تم آ گئے،'' اس نے کہا اور دونوں نے ہاتھ ملایا۔

اور بس۔ لیوش ایک گھبرائی سی ہنسی ہنسا۔ ہوسکتا تھا کہ اگر اس کی رخصت کے موقعے پر کم گواہ موجود ہوتے تو وہ ذرا آزادی سے کھل کھیلتا۔ خیر، کچھ بھی سہی، ہم سب جانتے تھے کہ خود اسی نے اینڈرے کو 'سرکاری حیثیت' میں بلوایا تھا۔ اس نے تاکید کے ساتھ تحریری طور پر درخواست کی تھی کہ اُس روز اینڈرے کو غیر حاضر نہیں ہونا چاہیے کیونکہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے۔ اینڈرے جیب میں لیوش کا دعوت نامہ لیے آیا تھا اور باغ میں کھڑا ہو گیا، فربہ اور پرسکون، ذرا ذرا آنکھیں جھپکاتے ہوئے، برتری کے کسی احساس سے عاری وہ لیوش کو صبر و تحمل سے سنتا رہا، ان لوگوں کے غیر متزلزل اعتماد کے ساتھ جو اپنی پوری طاقت کا استعمال ناپسند کرتے ہیں، اس سے آگاہ کہ بس ایک نگاہ غلط انداز، ایک انتباہی انگلی کے اٹھنے کی دیر ہے اور لیوش کی بولتی فوراً بند ہو جائے گی، وہ دم دبا کر کھسک لے گا، اور کھیل ختم۔ اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا تھا کہ لیوش کے لیے اس ناگوار گواہ کی موجودگی ناگزیر تھی۔ یہ ایسا تھا جیسے ایک طویل اندرونی کشمکش کے بعد لیوش نے صداقت کا سامنا کرنے کا فیصلہ کر ڈالا ہو — وہ اینڈرے کو ہمیشہ صداقت کا نمائندہ سمجھتا رہا تھا، ایک قاضی اور گواہ دونوں کی طرح بے درد، ایک سفاک معاندانہ شے جس کے اوپر لیوش کے طلسم بطخ کی پیٹھ پر پانی کے قطروں کی طرح تھے — اور یہ کہنے کا فیصلہ کہ چلو اب اسے رفع دفع کریں۔ اس طرح لیوش نے عمر رسیدہ اینڈرے پر نظر ڈالی۔

اینڈرے کو عمر رسیدہ ہوئے بھی کوئی تین یا چار سال ہوئے تھے۔ ہر وہ چیز جو اس کی ہیئت کذائی اور فطرت میں گمبھیر اور بوجھل تھی — دنیا کے خلاف وہ پراسرار مزاحمت جو کسی کو اس کے پاس نہیں پھٹکنے دیتی تھی، وہ راہبانہ فضا اور خاموش بیداری جو اوائل جوانی سے اس کی خصوصیت رہی تھی — اس سے رابطہ قائم کرنے میں دشواری پیدا کر دیتی، حتیٰ کہ ایک اجنبی کے لیے بھی۔ اس کے باوجود وہ بے مروت نہیں تھا، بس اتنا تھا کہ آدمی جانتا تھا کہ اسے دنیا کی بابت کسی چیز کا علم ہے جو اس کے سارے قوانین کی خلاف ورزی کرتی ہے اور وہ اس راز کو صرف اپنے تک ہی رکھنا چاہتا ہے۔ اس

Scanned with CamScanner

کی بھلائی بوجھل، محتاط، اور ان گھڑ تھی۔

اس وقت بھی وہ لیوش کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے سب جانتا ہو لیکن اس کا فیصلہ دینے یا اس سے درگزر کرنے کی کوئی ترغیب محسوس نہ کر رہا ہو۔ ''اچھا تو لیوش،'' کا فقرہ، جس سے بیس سال بعد اس نے سلام علیک کی تھی، اگرچہ مربیانہ، گھمنڈی یا درشت نہیں کہا جا سکتا، پھر بھی میں نے دیکھا کہ ان لفظوں نے لیوش کے سکون کو کس درجہ درہم برہم کر دیا تھا، کس طرح وہ گھبراہٹ کے مارے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تھا، کس قدر سہم گیا تھا، کیسے رومال سے پیشانی پونچھ رہا تھا۔ دونوں نے سیاست اور تجہیز و تکفین کے بارے میں گفتگو کی۔ پھر اینڈرے نے، جیسے کہ کافی دیکھ اور سن لیا ہو، شانے اچکائے، بنچ پر بیٹھ گیا اور کسی باعزت آدمی کی طرح اپنے ہاتھ پیٹ پر باندھ لیے۔ دن بڑھ کر عصر کے قریب پہنچ چکا تھا، اور ایک مرتبہ جب اس نے منتقلی کے کاغذات کی جانچ پڑتال کر لی، جن میں میں نے لیوش کو مکان بیچ دینے کا اختیار سونپ دیا تھا، اس کے پاس کسی سے مزید کچھ کہنے کے لیے باقی نہیں بچا۔

ظاہر ہے، ہم سب اس بات سے آگاہ تھے کہ لیوش میری زندگی کا، یا بلکہ یہ زیادہ درست ہوگا کہ نونو کی زندگی کا، طلبگار تھا: کہ وہ میرے سکون کے پیچھے پڑا تھا۔ ایک مکان تھا جو ابھی تک سر پر چھت مہیا کرنے کا آسرا تھا، ٹھیک ہے اس وقت تک تھوڑا سا ٹوٹ پھوٹ گیا تھا، لیکن اس کے باوجود ہمارے لیے ہنوز ایک حصار بند قلعے کی طرح تھا: قدر و قیمت کی وہ واحد شے جس کے ہم مالک تھے، جو لیوش کے ہاتھوں سے بچ رہی تھی، اور اب وہ اسے بھی ہتھیانے پہنچ گیا تھا۔ تار ملتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ وہ مکان کی تاک میں ہے — آدمی ایسی باتیں لفظوں میں نہیں سوچتا، بس اسے معلوم ہوتا ہے۔ میں آخر آخر تک خود کو فریب دیتی رہی۔ مگر اینڈرے کو معلوم تھا، اور مبیور کو بھی۔ بعد میں ہم پر آشکارا ہوا کہ ہم کتنی ارزانی اور آسانی سے لیوش کے سامنے دستبردار ہو گئے تھے اور اس حقیقت کو قبول کر لیا تھا کہ زندگی میں ادھورے حل نہیں ہوتے، اور جو کارروائی پندرہ سال قبل شروع ہوئی تھی اسے بہر حال انتہا سے ہمکنار کرنا ہی تھا۔ لیوش کو بھی یہ پتا تھا۔ اس نے تبصرہ کیا کہ مکان تھوڑا سا سیلن زدہ ہے اور یہ کہتے ہی فوراً ہی کسی اور چیز کی بات کرنے لگا تھا، گویا اس کے سروکار کا سب سے اہم حصہ طے ہو گیا تھا اور جزئیات پر وقت برباد کرنا بے سود تھا۔ مبیور اور لاتسی تجسس سے کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد، شام کے کھانے سے پہلے، ایک درزی وارد ہوا، لیوش کا پرانا درزی، اور شرمسارانہ عاجزی

سے ایک پچیس سال پرانا بل لیوش کو تھما دیا۔ لیوش نے اسے خوب خفیف کر کے وہاں سے چلتا کیا۔ مردوں نے ورموتھ پی، زور زور سے باتیں کیں، اور لیوش کے چٹکلوں پر خوب ہنسے۔ ہم بڑے نفیس موڈ میں کھانا کھانے بیٹھ گئے۔

12

صرف ایک بات جو میری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ تھی کہ وہ اجنبی عورت یہاں کیا کر رہی ہے۔ وہ اتنی سن رسیدہ اور معمولی لباس میں تھی کہ لیوش کی معشوقہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ جاننے میں مجھے کچھ وقت لگا کہ چرمی کوٹ میں ملبوس نوجوان، جو سب سے پہلے سرخ رنگ کار سے باہر نکلا تھا، جس نے تہنیت کے چند تواضعی کلمات ادا کیے تھے اور پھر بقیہ وقت زبان نہ کھولی تھی، صرف اپنے شیر کے سر والے کتے سے باتیں کرتا رہا تھا، اس عورت کا بیٹا تھا۔ یہاں کوئی بات ہمارے معاہدے کے برخلاف تھی۔ نوجوان بلانڈ تھا، ہلکا بلانڈ، ایک طرح کا نقرئی بلانڈ؛ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ کورا ہو اور پھیکے سے رنگ کی جلد کے برابر اس کی بھنویں تقریباً معدوم ہوں۔ وہ مسلسل پلکیں جھپکا رہا تھا۔ بال کسی بوڑھے افریقی جیسے لچھے دار اور اونی تھے۔ بعد میں اس نے گہرے نیلے رنگ کا چشمہ چڑھا لیا اور تاریک عدسوں کے پیچھے تقریباً گم ہو کر رہ گیا۔ شام پڑے کہیں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ یہ نوجوان ایوا کا منگیتر ہے اور عورت، کسی قدر باعزت قسم کی عورت جسے اپنی گفتگو کے دوران ناقص تلفظ میں ادا کیے ہوئے فرانسیسی لفظ ٹھونسنے کا خبط تھا، ایک زمانے سے لیوش کے گھر کی منتظمہ۔ اولین چند ساعتوں کی افراتفری میں مجھے ان سب باتوں کا کچھ پتا نہ چلا۔

عورت، جسے بچے اولگا کے نام سے پکارتے، اگر کچھ تھی تو قدرے سوگوار اور شرمسار۔ اس نے اپنی رفاقت کو ہم پر مسلط کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور، تعارف ختم ہونے کے فوراً بعد سے ناشتے کی میز پر خاموشی سے بیٹھی اپنی دھوپ چھتری انگلیوں سے نچاتی اور سامنے اپنی پلیٹ کو گھورتی رہی۔ پہلے پہل میں اسے کوئی مہمات کی رسیا سمجھی۔ لیکن میرا بعد کا تاثر یہ تھا کہ اگر وہ واقعی مہم جو تھی تو یقیناً بڑی تھکی ماندی اور بدمزاج قسم کی، ایسی جس کا مہم جوئی سے اعتقاد اٹھ گیا ہو اور جو اسے بخوشی تج کر کوئی اور

خاموش شغل جیسے کروشیے کا کام یا کڑھائی اختیار کرنے کو تیار ہو۔ گاہے گاہے وہ ایک تلخ سا تبسم کرتی جس سے اس کے پیلے پیلے مردانہ دانت عیاں ہو جاتے۔ میں جب اس کے روبرو آئی تو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ ہم نے پہلے مسکرا کر، بعد میں مسکراہٹ کے بغیر، تنقیدی نظروں اور شک وشبے کے ساتھ ایک دوسرے کا جائزہ لیا۔ ایک قدرے شیریں سی مہک کا بادل بھبک کر اس کے کپڑوں اور رنگے ہوئے زرد بالوں سے اٹھا۔

''ڈیر ایستھر،'' اس نے کہا۔

میں نے اس قربت کی مزاحمت کرتے ہوئے بلند آواز میں جواب دیا:

''مادام۔''

میں ہنس دی۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے کی ساعتوں میں گھر کم وبیش گھل کر غائب ہوتا دکھائی دے رہا تھا، ایک شاندار سراب سے زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔ دروازے پھٹ پھٹ بند ہو رہے تھے۔ لیوش نے ایک ڈبا نکالا جس میں سے ایک کچھوا برآمد کیا اور نمائش کرنے لگا کہ کچھوا کس طرح موسیقی کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اگر وہ سیٹی بجائے تو حرکت کرتا ہے، اپنی شکن آلود گردن خول سے باہر نکالتا ہے اور سسیاتی سی آواز میں گویا تکلم کرتا ہے۔ وہ اس مخلوق کو اپنے ساتھ اس لیے لیتا آیا تھا کہ اس کی ندرت گفتگو کا بہانہ بن جائے، ایک اضافی شے، ایک جانور سدھانے والے نابغے کے طور پر اس کی ظفرمندی کی دلیل۔ کچھوا زبردست کامیابی ثابت ہوا۔ ہم دائرے کی شکل میں کھڑے ہو کر لیوش کی کارگزاری پر بڑے جوش اور ولولے کا اظہار کرنے لگے، حتیٰ کہ ایندرے بھی، اپنی تمام سنگینی کے باوجود، اس کے عجوبے سے مغلوب ہو ہی گیا۔

لیوش نے تحفے تحائف بانٹنے شروع کیے: لاتسی کے واسطے ایک دستی گھڑی، نونو کے لیے چرمی جلد والے فرانسیسی شاعری کے دو نایاب مجموعے، (اس نے تحفے کو خود اپنے کہے ہوئے ایک تہنیتی شعر سے مزین کیا تھا، اس سے بے پروا ہو کر کہ نونو فرانسیسی سے نابلد تھی)، بھیمور اور ایندرے کو گراں قیمت غیر ملکی سگار ملے، اور مجھے ریشمی بنفشئی شال۔ عمومی جوش وخروش کا عالم تھا، گویا پھٹ پڑنے کو تیار۔ باڑ کے پیچھے سے اجنبی لوگ باگ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے، سو ہم اٹھ کر درون خانہ چلے آئے۔ گھر بھر میں تازہ پکے مسالے دار کھانے کی مہک سمائے جا رہی تھی جس میں زندگی کی سادہ سی لطافتوں

کا قدیم احساس ہمیشہ شامل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کی کچھ افراتفری بھی، جو چھری کانٹوں کی جھنکار، رکابیوں کی کھنک، آتے ہوئے مہمانوں کی بے مقصد گفتگو کی دور افتادہ بھنبھناہٹ، دبی دبی سی بچکانہ چیخ و پکار کی یاد دلاتی ہے، اور یہ سب مل جل کر کسی مادّی یا موسیقانہ دھوم دھام سے اعلان کرتے ہیں کہ زندگی ایک معجزہ ہے جس کا جشن منانا چاہیے! میں نے جس طرف بھی مڑ کر دیکھا، ٹھیک یہی نظر آیا۔ وہ اجنبی عورت ایک کونے میں جا بیٹھی اور بڑی سپاٹ آواز میں بولنے لگی۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ لیوش سے پہلی بار آٹھ سال پہلے ملی تھی جب اس نے اپنے شوہر کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کا بیٹا ایک دفتر میں ملازم تھا — کہاں اور کیا کام کرتا تھا، یہ اس نے ٹھیک سے نہیں بتایا۔ میں نے اس عورت اور اس کے بیٹے جیسے لوگ اپنی ساری زندگی اتنے قریب سے نہیں دیکھے تھے۔ میں نے ایسے رسالوں کی ورق گردانی ضرور کی تھی جن میں نوجوانوں، یا مخصوص قسم کے نوجوانوں کی سرگرمیوں کی تصویریں ہوتیں، اس قسم کے لوگ جو گدیاں لگے شانوں والی جیکٹ چڑھائے ہوٹل کی لابیوں میں رقص کرتے یا ہوائی جہاز اڑاتے یا کسی مقام کی طرف اپنی پھٹ پھٹیوں کو زناٹے سے دوڑائے جاتے، پیچھے نوجوان لڑکیوں کو بٹھائے ہوئے جن کے اسکرٹ گھٹنوں سے اوپر ہوا میں پھڑ پھڑا رہے ہوتے۔ ہاں، مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ نوجوانوں کی ایک قسم اور بھی ہے جو بالکل حقیقی لوگ ہوتے ہیں۔ اول الذکر بس ان اوسان خطا کر دینے والے لوگوں کے بارے میں میری خاکہ نگاری ہی ہے جن کے بارے میں مَیں کچھ نہیں جانتی لیکن جو میرے حافظے اور تصور میں متمکن ہیں۔ میں ان کی بابت اگر کچھ جانتی ہوں تو بس اتنا کہ میرا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ پراگندگی اور اپنی لاعلمی سے پرے، میں جب خود کو ان کے درمیان پاتی ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میرے پاس ان تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہیں؛ ان کی نوع موٹر سائیکل چلانے اور ناچنے والی انسانیت کی ہے جو مجھے فلموں کے پردے پر نظر آتی ہے، اور جو اس عہد نامے کا جز نہیں جو میں نے اور میرے والدین نے معاشرے سے کیا ہے۔

لڑکے میں کوئی بات غیر معمولی تھی؛ وہ کسی ناول، خاص طور پر کسی جاسوسی کہانی کا ہیرو ہو سکتا تھا۔ اس نے بہت کم بات کی، لیکن جب بھی کچھ کہا تو چھت کی طرف تکتے ہوئے ہر ہر جزِ لفظ کو بڑی صفائی سے ادا کیا، تقریباً لفظوں کو گاتے ہوئے۔ وہ اپنی ماں جتنا ہی سوگوار تھا، دونوں سے ایک اجاڑ

سی اداسی ٹپک رہی تھی۔ اس سے پہلے میرا سابقہ اتنے توہین آمیز، اتنے ڈھیٹ طور پر اجنبی لوگوں سے کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا، شراب بھی نہیں۔ وہ اپنی بائیں کلائی پر ایک مہین ساطلائی کڑا پہنے ہوئے تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنا ہاتھ اتنے اچانک طور پر اٹھاتا کہ لگتا کسی کو مارنے والا ہو؛ پھر، ایک بے لچک میکانکی حرکت کے ساتھ وہ کڑے کو کلائی پر اوراوپر کھسکا دیتا۔ معلوم ہوا کہ اس کی عمر تیس سے اوپر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور یہ کہ وہ کسی سیاسی جماعت کے ہیڈ کوارٹر میں کسی نوع کا سیکرٹری تھا، لیکن جب اس نے اپنا نیلا چشمہ اتارااور کمرے میں موجود لوگوں اور چیزوں کا جائزہ لیا تو اپنی پرنم آنکھوں کے باعث وہ لیوش سے بھی بڑی عمر کا دکھائی دینے لگا۔

تمھیں ان لوگوں سے آخر کیا لینا دینا ہے! میں نے سوچا۔ لیکن میں یہ دیکھنے سے باز نہ رہ سکی کہ وہ حاضرین کو تاک رہا تھا۔ مجھے تو اس کا نام بھی پسند نہ آیا، وہی فرسودہ سا ''بیلا''۔ میرے لیے اس نام کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ناموں کی نسبت میرا ردعمل خاصا شدید ہوتا ہے — یا پسند کرتی ہوں یا پھر نفرت۔ یہ ایک بڑا ناشائستہ احساس ہے، جس کا کوئی جواز نہیں۔ لیکن پھر اسی قسم کے احساسات ہیں جو دنیا سے ہمارے تعلق کا تعین کرتے ہیں، ہمارے اُنس اور ہماری نفرتوں کا۔ میں اس پر بہت زیادہ توجہ نہ دے سکی، کیونکہ میری ساری توجہ پر تو اس کی ماں قابض تھی۔ میری ادنیٰ سی دعوت کے بغیر ہی اس نے اپنی ساری زندگی میرے سامنے کھول کر رکھ دی۔ یہ رام کہانی شکایتوں کی ایک طولانی فہرست تھی، تہمت کی ایک بے مہار صدا جس کا ہدف زمینی اور آسمانی مقتدر ہستیاں دونوں ہی تھیں، مرد بھی اور عورتیں بھی، رشتے دار اور عشاق بھی، اولادیں اور شوہر بھی۔ یہ تہمتیں سپاٹ اور ہموار آواز میں لگائی گئیں، رواں دواں اور ہم آہنگ جملوں میں، یوں جیسے کوئی متن دہرا رہی ہو جو اسے منھ زبانی یاد ہو۔ ہر کس وناکس نے اسے فریب دیا تھا، ہر شخص اس کا مخالف تھا، اور آخراً سبھی نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی تجزیات سے کم از کم میں نے یہی اندازہ لگایا۔ بیچ بیچ میں مجھے جھرجھری آجاتی: یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی مخبوط الحواس شخص آپ سے کلام کر رہا ہو۔ پھر، کسی توقف کے بغیر، وہ لیوش کے موضوع پر رواں ہو گئی۔ اس کے انداز میں بیزاری اور رازداری کا رنگ تھا۔ یہ انداز مجھے گراں گزرا۔ مجھے اس خیال سے بڑی اہانت محسوس ہوئی کہ میرے پاس آنے کے لیے لیوش کو اس قسم شرکائے جرم کی ضرورت تھی، جیسے یہ فرد کوئی صاحب حیثیت ہو۔ میں لیوش کا بنفشئی ریشمی شال کا تحفہ لے کر اٹھ کھڑی

ہوئی۔

''ہم ایک دوسرے سے ناواقف ہیں،'' میں نے کہا۔ ''شاید ہمیں اس طرح گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔''

''اوہ!'' میری تشویش سے قطعی لاتعلق، اس نے سکون سے کہا۔ ''اس کے بارے میں بات کرنے کو ہمیں بہت وقت ملے گا۔ ہم ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں گے، ڈیر ایستھر۔''

اس نے ایک سگریٹ سلگائی اور دھویں کی اچھی خاصی لکیر چھوڑ دی، اور دھویں کے غبار کے عقب سے مجھے اتنے تیقن سے گھورا کہ لگا جیسے اس نے سب کچھ پہلے ہی سے تیار کر رکھا ہو۔ سب باتوں کا فیصلہ ہو چکا تھا: اسے کچھ معلوم تھا جس سے میں لاعلم تھی، اور ہار مان لینے کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

13

مجھے یہاں تین گفتگوؤں کا ذکر کرنا چاہیے۔ ٹھیک اتنی ہی اس دوپہر ہوئی بھی تھیں۔ سب سے پہلے ایوا میرے دروازے پر وارد ہوئی، اس کے بعد لیوش، اور آخر میں 'سرکاری حیثیت میں مدعو' اینڈرے۔ لنچ کے بعد مہمان تتر بتر ہو گئے۔ لیوش جھپکی لینے کے لیے لیٹ گیا، بالکل ایسے جیسے اپنے ہی گھر میں ہو اور اپنے گھریلو معمولات سے انحراف کا روادار نہ ہو۔ گابور اور اجنبی لوگ کار میں بیٹھ کر گرجا گھر، آس پڑوس، اور مقامی خرابوں کی زیارت کو چل دیے اور شام پڑے ہی لوٹے۔ لیکن ایوا کھانے کے فوراً بعد سیدھی میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں اس کے ساتھ دریچے میں آ کر کھڑی ہو گئی، اپنے ہاتھوں میں اس کا چہرہ بھر لیا، اور بڑی دیر تک اسے دیکھا کی۔ وہ بھی اپنی شفاف نیلی نیلی آنکھوں سے مجھے ٹکٹکی باندھے تکتی رہی۔

''تمھیں ہماری مدد کرنی چاہیے، ایستھر،'' اس نے بالآخر کہا۔ ''صرف تم ہی ہماری مدد کر سکتی ہو۔''

اس کی شیریں غنائی سی آواز تھی، کسی اسکول کی بچی جیسی۔ وہ قد میں میرے شانے تک آتی

تھی۔ میں نے اسے چمٹا لیا، لیکن پھر محسوس کیا کہ یہ منظر کچھ زیادہ ہی جذباتی تھا، سو جب اس نے ملائمت سے ساتھ خود کو مجھ سے علیحدہ کیا تو مجھے اطمینان ہوا۔ وہ سائیڈ بورڈ کے پاس جا کھڑی ہوئی، سگریٹ سلگائی، آہستہ سے کھانسی اور، جیسے ایک انفعالی، قدرے ظاہر دارانہ صورت حال سے نجات پا گئی ہو، سائیڈ بورڈ کی ہموار سطح پر آراستہ فریم شدہ تصویروں اور دیگر اشیا کا جائزہ لینے لگی۔ یہ شیلف، جو سائیڈ بورڈ کا بالائی حصہ تھی، میرے لیے ایک مقدس جگہ تھی، اس قسم کی جگہ جس کا تصور چینی لوگ ایک گھریلو عبادت گاہ کے طور پر کرتے ہیں، جس میں وہ اپنے پرکھوں کے سامنے جھکتے اور تعظیم بجالاتے ہیں۔ ہر وہ ہستی جو مجھے عزیز تھی اور مجھ سے قریب تھی، وہاں ایک لمبی سی قطار میں ایستادہ تھی، ہر ایک مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں ایوا کے پاس آئی اور میں نے اس کی نگاہ کو باری باری ان کی طرف حرکت کرتے دیکھا۔

''یہ ماما ہیں،'' اُس نے آہستہ لیکن صریح مسرت سے کہا۔ ''کتنی خوبصورت ہیں۔ وہ اس تصویر میں اب جو میری عمر ہے اس سے کم رہی ہوں گی۔''

ایک اٹھارہ سالہ وِلما نے جواباً ہمیں گھور کر دیکھا۔ تھوڑی سی گول مٹول، اُس زمانے کے لباس میں، سفید تسموں والے اونچے اونچے بوٹ پہنے، بال کھلے، گھنگھریالے، اور بھنوؤں کے اوپر کنگھی کیے ہوئے، پھول اور ایک پنکھڑی اٹھائے۔ تصویر کسی خاص موقعے پر اتاری گئی ہوگی، کیونکہ اس میں خودنگری اور بن ٹھن کا شائبہ سا تھا۔ صرف اس کی سیاہ، سوال کرتی ہوئی آنکھیں ہی تھیں جو آئندہ کی برہم، پرجوش ولما کی غمازی کر رہی تھیں۔

''تمھیں یاد ہیں؟'' میں نے پوچھا، اور جانتی تھی کہ میری آواز میں اتنا ٹھہراؤ نہیں ہے۔

''دھندلی سی،'' اس نے جواب دیا۔ ''اندھیرے میں کوئی میرے کمرے میں آتا ہے اور ایک گرم گرم مانوس سی مہک کے ساتھ مجھ پر جھک جاتا ہے۔ مجھے بس اتنا ہی یاد ہے۔ جب وہ مریں اس وقت میں تین سال کی تھی۔''

''ساڑھے تین سال،'' میں نے بدحواسی سے کہا۔

''ہاں۔ لیکن مجھے تو صرف تم ہی یاد ہو۔ ہمیشہ مجھے نک سک سے درست کر رہی ہو، میرا لباس یا میرے بال، اور تم ہی ہمیشہ میرے کمرے میں موجود ہوتی ہو، وہاں کرنے کے لیے تمھارے پاس

Scanned with CamScanner

ہمیشہ ہی کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ پھر تم بھی غائب ہو جاتی ہو۔ تم کیوں چلی گئی تھیں، ایستھر؟''

''خاموش،'' میں کہتی ہوں۔ ''خاموش، ایوا۔ تم ابھی تک نہیں سمجھتیں۔''

''ابھی تک؟...'' اس نے پوچھا، اور اسی گیت گاتی ہوئی آواز میں ہنسنے لگی، ہنسی جس میں زبردستی کا اڑتا اڑتا سا رنگ تھا، جو کچھ زیادہ ہی لمبی تھی، زیادہ ہی نا تکی۔ اس نے جو کچھ کہا، لگتا تھا جیسے کبھی غیر معمولی طور پر اہم ہو، جیسے بڑی احتیاط سے مدون کیا گیا ہو۔ ''پیاری ایستھر، کیا اب بھی تم چھوٹی ماما ہونے کا سوانگ رچا رہی ہو؟'' وہ بولی، رحم دلی سے، برتری سے، اور ہمدردی سے۔ اور اب یہ وہ تھی جس نے ایک بالغ کی حرکت کے ساتھ اپنا بازو میرے شانے کے گرد ڈال دیا، مجھے لیے لیے صوفے کے پاس پہنچی اور بٹھا دیا۔

اس بار ہم نے ایک دوسرے کو دو عورتوں کی طرح دیکھا، عورتیں جو ایک دوسرے کے راز جانتی یا بھانپ سکتی ہوں۔ ہیجان کی ایک گرم لہر یکبارگی میرے آر پار دوڑ گئی۔ ولما کی بیٹی! میں نے خیال کیا۔ ولما اور لیوش کی بیٹی۔ مجھے لگا جیسے میں ایک ایسی رقابت سے تمتما رہی ہوں جو میرے اندر کہیں اتنی دور سے اٹھی ہو کہ میں اس کی توانائی اور زور پر ہکا بکا رہ گئی ہوں: یوں جیسے کوئی حاسد آواز مجھ پر چیخ چلا رہی ہو۔ میں اسے سننا نہیں چاہتی تھی۔ یہ تمھاری جائی ہو سکتی تھی! وہ آواز چلا کر یہی کہہ رہی تھی۔ تمھاری بیٹی، تمھاری زندگی کا ماحصل۔ یہ کیوں لوٹ آئی ہے؟ میں نے اضطراب کے عالم میں اپنا سر جھکا لیا، چہرے کو ہاتھوں میں غرق کر دیا۔ اس ندامت کو، جو مجھے جنبش کرتے ہوئے بھی محسوس ہو رہی تھی، اس لمحے کی اہمیت نے متوازن کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں اپنے راز افشا کیے دے رہی ہوں، کہ میں کسی ایسی ہستی کی نظر میں ہوں جو میری شرمساری کا اور بے سکونی کا بے رحمی سے مشاہدہ کر رہی ہے؛ اور یہ کہ یہ نوجوان عورت، جو میری بیٹی ہو سکتی تھی، ہمدردی سے تہی تھی اور اس افسوسناک صورت حال سے مجھے بچانے والی نہیں تھی۔ ایک وقفے کے بعد جو اپنی طوالت میں لامنتہا محسوس ہوا، میں نے دوبارہ اس کی بالغ، نامانوس، خود آگاہ، لاتعلق آواز سنی۔

''ایستھر، تمھیں چلا نہیں جانا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم ہے والد کے ساتھ رہنا اتنا آسان نہیں رہا ہوگا۔ لیکن تمھیں یہ جاننا چاہیے تھا کہ صرف تم ان کی مدد کر سکتی ہو۔ اور پھر گابور اور میں بھی تو تھے۔ تم ہمیں ہماری قسمت کے حوالے کر کے چلی گئیں۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے دو بچوں کو کوئی کسی گھر کے دروازے

پر چھوڑ کر چلا جائے۔ تم نے یہ کیوں کیا؟''

اور جب میں خاموش رہی تو اس نے سکون کے ساتھ اضافہ کیا:

''یہ تم نے انتقاماً کیا تھا۔ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ تم کینہ جو تھیں اور یہ تم نے انتقاماً کیا تھا۔ صرف تم واحد عورت تھیں جس کا والد پر زور چلتا تھا۔ صرف تم وہ عورت تھیں جس سے والد کو محبت تھی۔ نہیں، ایستھر، اتنا میں ضرور جانتی ہوں، کم از کم اتنا جتنا تم اور والد۔ تم دونوں کے درمیان کیا ہوا تھا، میں نے اس کے بارے میں بہت سوچا ہے۔ میرے پاس سوچنے کو بہت وقت پڑا تھا، ایک پورا بچپن۔ یقین کرو، وہ بچپن ایسا کوئی مسرت بخش نہیں تھا۔ کیا تمھیں تفصیلات کا علم ہے؟ میں بتانے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ اور، اپنی کہانی کے ختم پر، تم سے مدد کرنے کی درخواست کے لیے بھی۔ میرے خیال میں ہمارے لیے تم پر کم از کم اتنا تو واجب ہے۔''

''جو چیز بھی چاہو،'' میں نے کہا، ''میں تمھاری مدد کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ دشوار لمحہ گزر چکا تھا۔

''دیکھو ایوا،'' میں نے بات جاری رکھی، اور اب مجھے بھی تسکین محسوس ہوئی۔ ''تمھارے والد واقعی دلچسپ اور بڑے گنوں کے آدمی ہیں۔ لیکن وہ تمام باتیں جن کا تم ابھی ذکر کر رہی تھیں، ان کے حافظے میں کسی قدر گڈمڈ ہو گئی ہیں۔ تمھیں اس سے آگاہ ہونا چاہیے کہ تمھارے والد جلد بھول جاتے ہیں۔ براہ کرم یہ خیال نہ کرنا کہ میں ان کی نکتہ چینی کر رہی ہوں۔ وہ اس معاملے میں مجبور ہیں۔ یہی ان کی فطرت ہے...''

''مجھے معلوم ہے،'' اس نے جواب دیا۔ ''والد کو کبھی حقیقتِ حال یاد نہیں رہتی۔ وہ ایک شاعر ہیں۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ میرا دل کسی قدر ہلکا ہو گیا تھا۔ ''وہ شاعر ہو سکتے ہیں۔ ان کے ذہن میں حقیقت گڑبڑا جاتی ہے۔ اس لیے تمھیں ان کی ہر بات پر یقین نہیں کر لینا چاہیے... ان کا حافظہ کمزور ہے۔ جس زمانے کا تم ذکر کر رہی ہو وہ میری زندگی کا بے حد کٹھن، اتنا زیادہ تکلیف دہ زمانہ تھا کہ برداشت سے باہر، اور نہایت الجھا ہوا حصہ بھی۔ انتقام، تم کہہ رہی ہو! یہ کوئی کہنے کے قابل لفظ ہے؟ اس کا استعمال تمھیں کس نے سکھایا؟ تمھیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس زمانے کے بارے میں ہر وہ بات

جو تمھارے والد بیان کرتے ہیں ایک فسانہ ہے۔ خالص فسانہ۔ لیکن مجھے حقیقت خوب یاد ہے۔ وہ اس سے مختلف تھی۔ کسی کا میرے اوپر کچھ بھی واجب نہیں ہے۔''

''لیکن میں نے خط پڑھے ہیں،'' اس نے سپاٹ انداز میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

میں گم صم ہوگئی۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''کون سے خط؟'' میں نے دنگ ہو کر پوچھا۔

''خط، ایستھر،'' اس نے تیکھا جواب دیا۔ ''والد کے خط، وہی خط جو انھوں نے تمھیں اُس زمانے میں لکھے تھے۔ تب جب وہ گھر ملنے کے لیے آیا کرتے تھے، جب وہ تمھارے دیوانے تھے، کہتے تھے کہ دونوں کہیں بھاگ چلیں، کیونکہ اب وہ مزید اس طرح نہیں رہ سکتے، اور سوانگ نہیں رچا سکتے، کہ وہ ولما سے نہیں نبٹ سکتے، کہ وہ ان سے کہیں زیادہ قوی تھی اور جو تم سے، ایستھر، تم سے، نفرت کرتی تھی... کیونکہ اماں تم سے واقعی نفرت کرتی تھیں... کیوں؟ کیا اس لیے کہ تم ان سے کم عمر تھیں یا زیادہ خوبصورت تھیں یا زیادہ حقیقی؟ صرف تم ہی اس کا جواب دے سکتی ہو۔''

''کیا کہہ رہی ہو، ایوا؟'' میں چلائی اور اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔ ''کیسے خط؟ یہ کیا حماقت ہے؟''

اس نے اپنا بازو چھڑایا، اور اپنے بچوں جیسے نرم ہاتھوں سے ماتھا تھپتھپایا اور بڑی بڑی کھلی آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔

''کیوں جھوٹ بول رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔ اس کی آواز سخت اور سرد تھی۔

''میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا،'' میں نے جواب دیا۔

اس نے شانے جھٹکائے۔

''میں نے خط پڑھے ہیں،'' وہ بولی، اور کسی مجسٹریٹ کی طرح ہاتھ باندھ لیے۔ ''وہ زمانوں سے الماری میں پڑے تھے، جہاں اماں اپنے چھوٹے کپڑے رکھتی تھیں، جہاں تم نے انھیں چھپا دیا تھا — تمھیں پتا ہے، اسی خوشبو والی لکڑی کے ڈبے میں... میری گرفت میں آئے انھیں مشکل سے تین سال ہوئے ہوں گے۔''

مجھے لگا جیسے زرد پڑ گئی ہوں، چہرے سے سارا خون نکلتا جا رہا ہو۔

Scanned with CamScanner

''بتاؤ، ان میں کیا لکھا ہے؟'' میں نے مطالبہ کیا۔ ''تمھارا جو دل چاہے سو چا کرو، مجھے جھوٹی سمجھو، لیکن مجھے ان خطوں کے بارے میں جو کچھ جانتی ہو سب بتادو۔''

''یہ میری سمجھ سے باہر ہے،'' اس نے بڑی کاٹ دار آواز میں کہا، کہ اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ ''میں اُن تین خطوں کا ذکر کر رہی ہوں جو والد نے تمھیں اس وقت لکھے تھے جب اماں سے ان کی منگنی ہو چکی تھی، جن میں تم سے التجا کی تھی کہ انھیں ان کے جذباتی زنداں سے آزاد کردو، کیونکہ وہ صرف تمھی سے محبت کرتے ہیں۔ آخری خط پر شادی سے ذرا پہلے کی تاریخ پڑی تھی۔ میں نے تاریخوں کا مقابلہ کر کے دیکھا۔ یہ وہی خط ہے جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ وہ تم سے براہِ راست بات نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں اس کی سکت نہیں اور اماں کی وجہ سے شرمسار ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ والد نے اس سے زیادہ بے لوث خط اس سے پہلے کبھی لکھا ہو۔ لکھا تھا کہ وہ ایک کچلے ہوئے مجروح آدمی ہیں، کہ وہ صرف تمھی پر بھروسا کرتے ہیں، کہ صرف تم انھیں ان کا کھویا ہوا وقار اور ہوشمندی واپس کر سکتی ہو۔ انھوں نے تم سے منت کی تھی کہ ان کے ساتھ بھاگ چلو، ہر چیز کو چھوڑ دو، ان کے ساتھ دیس کے باہر کسی اور ملک چلو؛ کہ وہ اپنی زندگی تمھارے ہاتھوں میں رکھے دے رہے ہیں۔ یہ مایوسی کا خط ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ تم اسے بھول سکتی ہو، ایستھر۔ یہ ناممکن ہے، ہے نا؟ کسی وجہ سے تم ان خطوں کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتیں... ہوسکتا ہے اماں کے خیال سے یہ تکلیف دہ ہوں، یا صرف اس لیے کہ تم سارا معاملہ مجھ سے چھپائے رکھنا چاہتی ہو۔ اُس وقت کے بعد سے مجھے والد ایک بالکل ہی مختلف روشنی میں نظر آنے لگے۔ یہ کافی ہے کہ انسان اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار طاقتور اور بھلا ہونے کی جدوجہد کرے۔ یہ ان کا قصور نہیں تھا کہ وہ ناکام رہے۔ تم نے کیوں جواب نہیں دیا؟''

''جواب دیتی بھی تو کیا؟'' میں نے پوچھا، اُسی سپاٹ اور لاتعلق آواز میں جو کوئی اس وقت استعمال کرے جب اپنے جھوٹ بولنے کا اعتراف کر رہا ہو، یا جیسے مجھے واقعی ان خطوں کا علم ہو۔

''کیا؟... میرے خدا! کچھ نہ کچھ جواب تو دے ہی سکتی تھیں۔ یہ اس قسم کے خط تھے جو آدمی کو پوری زندگی میں کبھی ایک بار ہی ملتے ہیں۔ انھوں نے لکھا تھا کہ وہ صبح تک تمھارے جواب کا انتظار کریں گے۔ اگر تم نے جواب نہ دیا تو سمجھ لیں گے کہ تم میں ہمت کی کمی ہے... اور اس صورت میں ان

کے پاس سوائے یہیں رہنے اور اماں سے شادی کر لینے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لیکن وہ تم سے یہ سب کچھ خود نہیں کہہ سکتے تھے۔ انھیں ڈر تھا کہ تم ان پر یقین نہیں کروگی کیونکہ وہ تم سے اس سے پہلے اکثر جھوٹ بول چکے تھے۔ تم دونوں کے درمیان کیا کچھ ہوا تھا، یہ میں نہیں جان سکتی... یہ پوچھنے کا مجھے کوئی حق بھی نہیں ہے۔ لیکن تم نے ان کے خط کا جواب نہیں دیا، اور جلد ہی سب کچھ بگڑ کر رہ گیا۔ برہم نہ ہو، ایستھر... اب جبکہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے، میرا خیال ہے کہ اس واردات کی جزوی ذمے دار تم بھی تھیں۔"

"تمھارے والد نے وہ خط کب لکھے تھے؟"

"شادی سے ایک ہفتہ پہلے۔"

"کہاں کا پتا لکھا تھا؟"

"کہاں کا؟ یہیں کا، تمھارے گھر کا۔ تب تم یہاں اماں کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔"

"یہ تمھیں خوشبودار لکڑی کے ڈبے میں ملے؟"

"ہاں، ڈبے میں، اُس خانے میں جہاں زیر جامے رکھے جاتے تھے۔"

"کسی کے پاس اس کی چابی تھی؟"

"صرف تمھارے پاس۔ اور والد کے۔"

میں کیا جواب دے سکتی تھی۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا، کھڑی ہوئی، سائیڈ بورڈ کے پاس گئی اور ولما کی تصویر اٹھا کے کچھ دیر تک اس کو تکتی رہی۔ اسے اپنے ہاتھوں میں لیے ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ میں نے ان مانوس اور اس کے باوجود خوفزدہ کر دینے کی حد تک اجنبی آنکھوں کو گھور کر دیکھا اور یکبارگی میری سمجھ میں آ گیا۔

14

میری بہن ولما مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ ایوا سچ کہہ رہی تھی — ہمارے درمیان ہمیشہ سے عداوت رہی تھی، ایک بے نام اور تاریک سا طیش جس کے محرکات وقت کے ساتھ ساتھ اوجھل ہو گئے

Scanned with CamScanner

تھے۔ کوئی چیز بھی اس باہمی نفرت کی وضاحت نہیں کر سکتی — کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ میں بھی اس سے اتنی ہی نفرت کرتی تھی جتنی وہ مجھ سے — اور نہ ہم دونوں میں سے کسی نے اس کی وضاحت کرنے کی کبھی کوشش کی۔ میں دوٹوک انداز میں یہ تعین کرنے سے قاصر ہوں کہ اُس کا کون سا مخصوص عمل نقصان پہنچانے کا ذمے دار تھا؛ بہر حال، اس بارے میں اس کا خیال بالکل ہی مختلف ہوتا، اور ہم اسی وجہ سے ایک دوسرے کے اتنے زیادہ مخالف تھے۔ ہم دونوں میں وہی ہمیشہ زیادہ زورآور تھی، حتیٰ کہ نفرت کے معاملات میں بھی۔ اگر کسی نے اس سے پوچھا ہوتا کہ وہ اتنی سنگدلی کے ساتھ مجھ سے کیوں نفرت کرتی ہے، تو اس نے اسباب سے مزین تہمتوں کی ایک طویل فہرست اگل دی ہوتی، لیکن ان میں سے کسی سبب سے بھی اس نفرت کی وضاحت نہ ہو پاتی۔ سو ہم نے اسباب وغیرہ کو ایک طرف کر دیا۔ طیش باقی رہا، وہ گرم اور دبیز احساس جو انسانی منظرنامے کے ایک ایک انچ کو اپنے بدبودار کیچڑ سے بھر دیتا ہے، اور جب ولما مری تو اس وقت تک خاندانی قربت کا کوئی بندھن باقی نہ رہا تھا، صرف نفرت کا ایک سیلاب زدہ میدان ہی باقی بچ رہا تھا۔

میں تصویر کو اپنی کمزور نظر کے قریب لائی اور غور سے اس کا جائزہ لیا۔ مرے ہوئے لوگ کتنے زورآور ہوتے ہیں! میں نے بے کسی سے سوچا۔ اس مخصوص لمحے میں ولما وجود کی ایک پراسرار ہیئت میں زندہ تھی جو مُردے اس وقت اختیار کرتے ہیں جب وہ ہماری زندگی میں دخل انداز ہونا چاہتے ہیں، وہ مرنے والے جن کے بارے میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ منوں مٹی کے نیچے مدفون ہیں اور بوسیدگی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن کسی مخصوص دن کے آنے کی دیر ہے کہ وہ نمودار ہو کر اپنی کارگزاری شروع کر دیتے ہیں۔ شاید آج ہی وہ دن ہو، ولما کا دن، میں نے خیال کیا۔ اور مجھے وہ دوپہر یاد آئی جب وہ پڑی مر رہی تھی، جب وُہ اپنے آس پاس کی چیزوں کو ہر بار بس چند ثانیوں کے لیے ہی پہچان پاتی تھی، جب میں اس کے سرہانے رو رہی تھی اور اس کے کچھ بولنے کی منتظر تھی، الوداع کہنے کی یا صلح کے ایک دو بولوں کی، اور اس تمام عرصے میں اس سے بخوبی آگاہ تھی کہ خود میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے، اس وقت بھی نہیں جب وہ موت کی دہلیز پر ہے، اور نہ اس نے، اپنی نزع کی غنودگی کے عالم میں، مجھے۔ میں نے اپنا چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور روتی رہی، اور

Scanned with CamScanner

تب وہ بولی۔ اس کے باوجود بھی تم مجھے یاد کروگی، اس نے کہا، اس حال میں کہ وہ اب اپنے ہوش میں نہیں تھی۔ اس نے مجھے معاف کر دیا ہے! میں نے سوچا، اس امید میں کہ کاش ایسا ہی ہو۔ لیکن جو میں نے خفیہ طور پر سوچا وہ یہ تھا: وہ مجھے دھمکا رہی ہے۔ اور پھر وہ مرگئی۔ تجہیز و تکفین کے بعد میں مہینوں تک اپارٹمنٹ میں ہی رہی۔ بچوں کو تن تنہا اپنے حال پر چھوڑ کر کیسے جایا جاسکتا تھا! لیوش ملک کے باہر سفر پر تھا اور کئی ماہ تک باہر ہی رہا۔ میں خالی اپارٹمنٹ میں کسی چیز کا انتظار کرتی رہی۔

لیکن جہاں تک ولما کی الماری کا تعلق ہے، جس کے خانے میں بعد میں ایوا کو خط ملنے والے تھے، میں نے اسے کبھی ایک بار بھی نہیں کھولا تھا۔ اگر کسی نے مجھ سے پوچھا ہوتا تو میں نے دیانت دارانہ جواب دیا ہوتا، گو نجتے لفظوں میں اس اعلان کے ساتھ کہ جاں بحق لوگوں کے معاملات میں دخل اندازی کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں بزدل تھی۔ مجھے اس کا خوف تھا کہ خدا جانے الماری میں کیا ہو، میں ولما کی یاد سے خائف تھی۔ اور یہ اس لیے کہ مرکر اور اس طرح ہمارے ازلی اور جوشیلے مکالمے کو یکطرفہ ختم کر کے اور ہمارے جھگڑے کو سمیٹ کر گویا کہ اس نے ہر اس یاد پر جس میں ہم سنگی ساتھی رہے ہوں، ہر عزم یا کیفیت پر جس میں ہم نے شرکت کی ہو، عجیب سی بندش لگادی ہو۔ تدفین کے بعد لیوش چلا گیا تھا اور میں بچوں کے ساتھ ایسے اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھی جہاں کوئی چیز میری ملکیت نہیں تھی، تاہم ہر شے جزوی طور پر مجھی سے چرائی گئی تھی، جہاں تمام کارآمد اشیا پر گویا کسی پر اسرار مختار کی مہر لگی ہوئی تھی — ان دنوں اپارٹمنٹ میں ہمیں اس قسم کے مختار ہی ہر طرف نظر آتے تھے؛ حقیقی، روزمرہ کے، سرکاری مختار تو بعد میں آئے تھے، لیوش پر نکلنے والے قرضوں کے بل لے کر — جہاں کسی چیز کو ہاتھ لگانے کی جرأت کیے بغیر میں گھر چلا رہی تھی، اس احساس کے ساتھ کہ یہاں کی کوئی چیز میری نہیں، اور جہاں میں کسی پیشہ ور ملازم استانی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ڈرتے ڈرتے بچوں کو تربیت دے رہی تھی۔ اپارٹمنٹ میں ہر شے میری مخالف تھی، ہر چیز پر بندش لگی تھی، ہر چیز سے اس اجنبی، جارحانہ صفت کی مہک آرہی تھی جو آدمی کے اس عمیق احساس کا تعین کرتی ہے کہ زندگی میں کیا اس کا ہے اور کیا دوسرے کا۔ یہاں کوئی چیز بھی میری نہیں تھی۔ ولما ہر چیز اپنے ساتھ لے گئی تھی، ہر وہ چیز جو میں نے چاہی ہوتی؛ اس نے ہر چیز تباہ کر دی تھی،

Scanned with CamScanner

ہر وہ چیز ممنوع کردی تھی جس کی مجھے خواہش تھی۔ وہ ہمارے اوپر اس آمرانہ طاقت سے حکمراں تھی جسے صرف مرے ہوئے ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ میں یہ سب کچھ مدت تک برداشت کرتی رہی۔ میں لیوش کا انتظار کر رہی تھی، کسی معجزے کا۔

بیرونِ ملک سفر کے دوران وہ شاذ ہی کبھی خط لکھتا؛ بہت ہوا تو پوسٹ کارڈ بھیج دیتا۔ اور اس وقت وہ پھر ایک ناٹک رچا رہا تھا؛ یہ وقت اس کی زندگی کے ''نازک موقعوں میں سے ایک'' تھا۔ ایک فیصلہ کن لمحہ جسے دونوں ہاتھوں سے بڑی پرشکوہ حرکت کے ساتھ اپنی تحویل میں لے لینا ضروری ہے: اسے اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے بالکل نک سک سے درست لباس میں ہونا چاہیے۔ اور صحیح ترین لباس ماتمی تھا، اور فیصلہ کن لمحہ بیرونِ ملک سفر۔ وہ اس طرح روانہ ہوا جیسے دکھ اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہو، اپنی یادوں سے فرار لازم ہو۔

میرے خیال میں حقیقت اس کے برعکس تھی: وہ غیر ملکوں میں بہت اچھا وقت گزار رہا تھا، کاروباری روابط پیدا کر رہا تھا — ''کام میں خود کو غرق کر رہا تھا،'' جیسا کہ اس نے لکھا تھا — دوسرے لفظوں میں گاہے گاہے کسی میوزیم یا لائبریری کی سیر، اور بقیہ وقت کیفے اور ریستورانوں میں بے فکر بیٹھے رہنا، ایسے لوگوں کے ساتھ جن سے اس کے روابط جذباتی ہی رہے ہوں گے۔ مجھے خیال آیا کہ لیوش کی روح کسی لچکدار مادّے سے بنی ہے۔ لیکن ان تمام مہینوں میں جب میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی، مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکتی، کہ اس میں، اس کے تنفس، حتیٰ کہ اس کے وجود میں کسی چیز کی کمی ہے، کسی جوڑنے والے عنصر کی جس کے بغیر آدمی انسانی رشتے نہیں بنا سکتا۔ اس کے آنسو حقیقی آنسو تھے، لیکن ان سے اس کے اندر کوئی چیز پسیجی نہیں تھی، کوئی یاد، نہ کوئی درد: لیوش ہمیشہ ہی بڑے بھرپور طریقے پر خود کو یا تو مسرت یا پھر سوگواری کے سپرد کر دیتا تھا لیکن حقیقت میں کسی کو بھی محسوس کرنے سے عاری تھا۔ اس تمام طرزِ عمل میں کوئی بات غیر انسانی تھی۔

جب چند ماہ کے بعد وہ واپس آیا تو میں اس کی آمد کا انتظار کیے بغیر چند ہفتے پہلے ہی بچوں کو ایک ذمے دار عورت کی نگرانی میں دے کر اپنے گھر چلی آئی تھی۔ میں نے لیوش کے نام ایک خط لکھا تھا کہ مجھے دکھاوے کی ماں کا روپ بھرنا منظور نہیں، میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جاننا چاہتی اور نہ کبھی اسے دوبارہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس خط کا مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ اولین چند ہفتے — یا چلو، اولین

چند سال ــــ مَیں اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی، لیکن پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ وہ جواب نہیں دے سکتا، کہ وہ دنیا جس میں ہم ساتھ رہے تھے ڈھے چکی ہے۔ اس کے بعد میں نے اس سے کسی چیز کی توقع نہ کی۔

اور اب جب ایوا اِن غیر معلوم خطوں کی اتنے جوشیلے اور الزامی لہجے میں بات کر رہی تھی، مجھے یکبارگی وہ خوشبودار لکڑی کا ڈبا یاد آ گیا۔ ڈبا واقعی میرا ہی تھا، جو لیوش نے مجھے میری سولھویں سالگرہ پر دیا تھا، لیکن ولما نے وہ مجھ سے مانگ لیا تھا۔ میں اس سے دست کش ہونے پر خوش نہیں تھی۔ اس زمانے میں مَیں لیوش کو ٹھیک سے نہیں جانتی تھی، نہ اس کے لیے اپنے حقیقی جذبات سے آگاہ تھی۔ ولما نے ڈبے کے لیے میری بڑی منت سماجت کی۔ آخر کار اسے میں نے اس کے حوالے کر ہی دیا، بادل ناخواستہ، تاہم بہت زیادہ مزاحمت کے بغیر۔ میں اس کی التجاؤں سے بیزار ہو گئی ہوں گی۔ ولما ہمیشہ ہی میری چیزیں مانگتی رہتی تھی، کوئی بھی چیز جو مجھے دی گئی ہو: کپڑے، کتابیں، موسیقی کے اسکور، کچھ بھی جو اس کی دانست میں گراں بہا ہو یا جس کی میرے لیے کچھ قدر و قیمت ہو۔ سو اس طرح وہ ڈبا اسے مل گیا۔ چند دن میں نے مزاحمت کی، لیکن آخر کار تھک ہار گئی اور دے ڈالا؛ مجھے یوں دینا پڑا کہ صاف سیدھے طور پر وہ زیادہ زور آور تھی۔ بعد میں، جب مجھے شبہ ہوا کہ لیوش کے اور میرے درمیان شاید کوئی جذباتی تعلق ہو، میں نے بڑی بے جگری سے ڈبا واپس حاصل کر لینے کے لیے التجائیں کی، لیکن ولما نے جھوٹ بول دیا کہ وہ اس سے کھو گیا ہے۔ یہ ڈبا جس پر خوشبودار لکڑی کی پچی کاری تھی، پلائی وُڈ اور وِنیر کا بنا ہوا تھا، جس میں خوشبو کے لیے ایسے مسالے استعمال کیے گئے تھے کہ ان کی مہک سے کچھ کچھ دم گھٹنے لگتا تھا، اور اندر سرخ ریشم کا استر لگا تھا، وہ واحد تحفہ تھا جو لیوش نے کبھی مجھے دیا ہو۔ انگوٹھی کو میں نے کبھی بھی ایک حقیقی تحفہ نہیں گردانا تھا۔ ڈبا میری زندگی سے معدوم ہو گیا۔ اور اب یہ پھر برآمد ہو گیا تھا، کئی دہائیوں بعد، ایوا کی کہانی میں، اپنے عجیب و غریب مشمولات کے ساتھ، شادی سے پہلے لیوش کے لکھے ہوئے تین خطوں کے ساتھ، جن میں مجھ سے التجا کی گئی تھی کہ اس کے ساتھ بھاگ چلوں، اسے بچانے کے لیے۔ میں نے تصویر کو واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا۔

''تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا، اور سائیڈ بورڈ سے ٹیک لگا لی۔

Scanned with CamScanner

15

''دیکھو ایستھر،'' اب اس نے کسی قدر پریشانی سے کہا اور ایک اور سگریٹ جلائی۔ ''والد تمھیں سب کچھ بتا دیں گے۔ میرے خیال میں ان کی بات درست ہے۔ تم چاہو تو سوچ سکتی ہو کہ ہمارے یہاں سے تمھارے چلے جانے کے بعد بہت کچھ ہوا ہے، اور واقعی بہت کچھ ہوا ہے، لیکن ہمیشہ بہتری کی جانب نہیں۔ مجھے شروع کے دن یاد نہیں۔ پھر ہم اسکول جانے لگے اور زندگی میں کچھ گرمی آ گئی۔ ہم ہر سال اپارٹمنٹ تبدیل کر دیتے، صرف اپارٹمنٹ ہی نہیں، اسکول اور آیائیں بھی۔ وہ آیائیں... میرے خدا... تم خود اندازہ کر سکتی ہو، والد ان کے انتخاب کے معاملے میں سختی سے کام نہیں لیتے تھے۔ زیادہ تر بھاگ جاتی تھیں، ساتھ میں ہماری کچھ چیزیں بھی اڑا لے جاتی تھیں، یا پھر ہم خود ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے، گھر اور ساز و سامان سب چھوڑ چھاڑ کے؛ ہم ایک کرائے کے اپارٹمنٹ سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے۔ ایک مرتبہ، جب میری عمر لگ بھگ بارہ سال ہوگی، ہم ہوٹلوں کے کمروں میں رہ رہے تھے۔ یہ بڑی دلچسپ زندگی تھی۔ ہیڈ ویٹر ہمارے کپڑے بدلواتا، ہم لفٹ چلانے والے لڑکے کے ساتھ مل کر سبق پڑھتے، اور جب والد چند دنوں کے لیے غائب ہو جاتے تو چیمبر میڈز ہماری دیکھ بھال کرتیں اور ہماری پڑھائی کا خیال رکھتیں۔ ایسے وقت بھی آتے جب ہم لگاتار کئی دن تک صرف سمندری کیکڑے کھاتے اور ایسے دن بھی آتے جب کھانے کے لیے کچھ بھی نہ ہوتا۔ والد کیکڑے کھانے کے رسیا ہیں۔ سو ہماری پرورش کچھ اس انداز پر ہوئی۔ دوسرے بچوں کی پرورش کھٹے دہی یا وٹامن پر ہوتی ہے... لیکن عام طور پر ہمارا اچھا وقت گزرا تھا۔ صرف بعد میں، جب والد کی قسمت پلٹی، تو ہم دوبارہ درمیانہ طبقے کی باعزت زندگی کی طرف لوٹ سکے۔ تب ہم نے ایک کرائے کا اپارٹمنٹ لیا، اور گھر چلانے کا انتظام کیا، کہ والد نے ایک نئے کام میں ہاتھ ڈال دیا — اور ایک بچی ہوتے ہوئے بھی میں والد کے اوٹ پٹانگ کاموں میں یوں بے دھڑک کود پڑنے پر کانپ جاتی تھی — ہم کبھی کبھی اپنے ہوٹل والے دنوں کو یاد کر کے روتے، کیونکہ اپنی ''باعزت زندگی'' میں بھی ہم صحرائی خانہ بدوشوں کی طرح رہ رہے تھے۔ تم جانو،

Scanned with CamScanner

والد واقعی شہری مخلوق نہیں ہیں۔نہیں، اس پر احتجاج نہ کرو۔میرا خیال ہے میں والد کو تم سے بہتر جانتی ہوں۔ان میں مادّہ پرست آدمی جیسی کوئی بات نہیں ہے، ان کی نظر میں مال و دولت کی کوئی وقعت نہیں، انھیں تو اس تک کی پروا نہیں کہ سر چھپانے کا کوئی آسرا بھی ہے یا نہیں۔ان میں کسی شکار کرنے اور پھل چننے والے کی سی کچھ کچھ خاصیت ہے، جو صبح سویرے اٹھ کر اپنے گھوڑے پر جا سوار ہوتا ہے —خراب سے خراب حالات میں بھی انھوں نے کار ضرور رکھی جسے وہ خود ہی چلاتے— اور اپنے گھاس کے میدان یا جنگل میں جا نکلتا ہے— والد کے لیے یہ حیثیت شہر کو حاصل تھی— ہوا کو سونگھتا سانگھتا ہے، چوکنا رہتا ہے، اور کسی معقول مالیت کے بینک نوٹ کو مار گراتا ہے، اسے بھونتا ہے، اور تھوڑا تھوڑا سب کو پیش کرتا ہے، لیکن پھر، اگر اس میں سے کچھ باقی رہ جاتا ہے تو دنوں یا بلکہ مسلسل کئی ہفتوں تک اسے کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں رہتی... اور، سچ پوچھو تو یہی بات ہمیں والد میں بڑی دل موہ لینے والی لگتی ہے، اور یہ، ایستھر، تمھیں بھی دلکش لگتی ہے۔والد کسی پیانو یا کسی اچھی بھلی ملازمت کو اس طرح ترک کر دینے کے اہل ہیں جس طرح کوئی استعمال شدہ دستانوں کو ایک طرف ڈال دیتا ہے؛ تم جانو ان کے نزدیک چیزیں اور منڈی کے بھاؤ بے حیثیت ہیں۔یہ ایک ایسی چیز ہے جس ہم عورتیں سمجھنے سے قاصر ہیں... میں نے والد سے بہت کچھ سیکھا ہے، لیکن ان کے حقیقی راز— ان کی لاپروائی، ان کی اندرونی لاتعلقی— میں نہیں جان سکتی۔انھیں کسی چیز سے بھی قریبی لگاؤ محسوس نہیں ہوتا، اگر انھیں کسی چیز سے دلچسپی ہے تو خطرے کی جستجو سے، اور خطرہ بھی حد سے زیادہ انوکھا... صرف خدا ہی یہ جانتا ہے، صرف خدا ہی یہ سمجھ سکتا ہے... انھیں اس قسم کے خطرے کی ضرورت رہتی ہے، لوگوں کے درمیان اس طرح کی زندگی لیکن انسانی بندھنوں کے بغیر؛ وہ تجسس کے باعث بندھن کو توڑ دیتے ہیں اور بے دھیانی سے انھیں پھینک پھانک دیتے ہیں۔تمھیں یہ احساس نہیں ہوا تھا جب...؟ میرا مطلب ہے، کیا تم نے یہ محسوس نہیں کیا تھا؟ ایک بچی کی حیثیت سے بھی مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہماری زندگی ایک خیمے میں ہی گزرے گی، ایک خانہ بدوش قبیلے کی طرح جو اپنی بادیہ پیمائی میں کبھی پُرخطر، کبھی خوشگوار زمینوں سے گزرے گا، والد تیر اور ترکش ہاتھ میں لیے آگے آگے جا رہے ہوں

گے، مناسب جگہ کی سن گن لینے، ٹیلی فون کی طرف لپکتے، سنتے، مخصوص نشانوں کو تاڑتے، پھر یکایک توانائی سے بھرپور، پوری طرح چوکنے اور عمل کے لیے بے چین... پیاؤ کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھی، اور والد اپنی کمیں گاہ میں کمان اٹھاتے ہوئے۔ کیا تم مجھ پر ہنس رہی ہو؟''

''نہیں،'' میں نے جواب دیا۔ میرے حلق میں کانٹے سے پڑ گئے تھے۔ ''کہے جاؤ۔ میں ہنسوں گی نہیں۔''

''مرد لوگ، تم جانو،'' اس نے دانشمندی سے پُر، معلمانہ انداز میں خفیف سی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

مجھے ہنسی آ ہی گئی۔ لیکن میں فوراً دوبارہ سنجیدہ ہوگئی۔ یہ بات میری توجہ میں آئے بغیر نہ رہ سکی کہ ایوا، ولما کی بیٹی، یہ بالک جس کے لیے میں نے بڑے لاأبالی طور پر ایک بالغ، سن رسیدہ عورت کا لب ولہجہ اختیار کیا تھا، مرد ذات کے بارے میں کوئی بات جانتی تھی، یقیناً زیادہ سے زیادہ یقینی طور پر کوئی بات، جو میں نہیں جانتی تھی... میں، جو اس کی ماں ہو سکتی تھی۔ میں نے ہنسنے پر اپنی سرزنش کی۔

''ہاں، ہاں،'' اس نے معصومیت سے کہا اور اپنی بڑی بڑی نیلی نیلی آنکھیں یہ بتانے کے لیے پھیلائیں کہ وہ اس معاملے میں بالکل سنجیدہ تھی۔ ''مرد لوگ۔ ایسے مرد ہیں جو کنبہ کٹم، دھن دولت، چیزوں اور علاقے کی بندشوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ماضی میں وہ شکاری یا ماہی گیر رہے ہوں گے۔ بسا اوقات والد مہینوں باہر رہتے۔ اس وقت ہم راہباؤں کے اداروں میں تعلیم پاتے۔ وہ خوش مزاج ہوتی تھیں، اگرچہ قدرے ڈری سہمی سی، لیکن ہمیں قابو میں رکھتیں، یوں جیسے ہم انھیں راہ میں پڑے مل گئے ہوں، جیسے جنگل کا کچھ نہ کچھ اب تک ہمارے بالوں سے چپکا رہ گیا ہو، جیسے ہم نے اپنا وقت روٹی دینے والے پیڑوں کے پاس بندروں کے ساتھ مل کر کھانے پینے میں گزارا ہو۔ دیکھا تم نے، ہم نے اس قسم کا رنگین بچپن گزارا تھا... ایسا نہیں ہے کہ میں شکایت کر رہی ہوں۔ براہ کرم یہ مت سوچو کہ میں والد کی شاکی ہوں۔ مجھے تو ان سے محبت ہے، اور میرا خیال ہے کہ وہ مجھے اس وقت سب سے زیادہ پیارے لگتے تھے جب اپنے کسی لمبے دورے سے کسی قدر مضمحل لوٹتے تھے، بالکل قلاش، دیکھنے میں ایسے کہ جنگلی جانوروں سے برسرِ پیکار رہے ہوں۔ ایسا وقت بہت فرحت بخش ہوتا تھا، کم از

Scanned with CamScanner

کم کچھ دیر کے لیے۔ اتوار کی صبحوں کو وہ ہمیں میوزیم دکھانے لے جاتے اور پھر مٹھائی کی دکان اور سینما۔ وہ ہماری مشق کی کاپیوں کو دیکھنے کی فرمائش کرتے، اپنا ایک آنکھ والا چشمہ چڑھا لیتے، اور ہمیں ڈانٹتے پھٹکارتے اور بڑی سنجیدگی سے تیوری پر بل ڈال کر ہمیں پڑھاتے... یہ سب اس قدر تفریح بخش ہوتا تھا۔ والد ایک اسکول ماسٹر کے روپ میں، کیا تم تصور کر سکتی ہو؟''

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''بیچارے۔''

لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں افسوس کس پر زیادہ کر رہی تھی، بچوں پر یا لیوش پر، نہ ایوا نے ہی پوچھا۔ اب وہ واضح طور پر اپنی یادوں میں محو ہو چکی تھی۔ اس نے دوستانہ، سہل سے انداز میں اپنی بات جاری رکھی۔

''سچ پوچھو تو ہماری زندگی اتنی زیادہ بری نہیں گزری تھی۔ یعنی، اس وقت تک جب تک ایک دن یہ عورت نازل نہ ہو گئی۔''

''کون عورت؟'' میں نے پوچھا، اس بات کی کوشش کرتے ہوئے کہ مدھم سا مکالماتی لہجہ قائم رکھوں۔

اس نے شانے اچکائے۔

''قسمت،'' اس نے منھ بسورا۔ ''تم جانتی ہو، قسمت، وہ خاتون جو عین موقعے پر نازل ہو جاتی ہے، ٹھیک آخری لمحے میں...''

''کون سا لمحہ؟'' میں نے پوچھا، میرا منھ خشک ہو چکا تھا۔

''جس لمحے والد بوڑھے ہونے لگے۔ وہ لمحہ جب شکاری کو پتا چلتا ہے کہ اس کی بینائی پہلے جیسی تیز نہیں رہی، کہ اس کا ہاتھ کانپنے لگا ہے۔ ایک دن والد خوفزدہ ہو گئے۔''

''کس چیز سے؟''

''بڑھاپے سے۔ خود اپنی ذات سے۔ ان جیسے آدمی کے بوڑھے ہونے سے زیادہ دردناک کوئی اور بات نہیں ہے، ایستھر۔ پھر کوئی، کوئی بھی، اس سے بے جا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔''

''اس عورت نے ان کے ساتھ کیا کر دیا آخر؟''

ہم بہت ہی دھیمے لہجے میں بول رہی تھیں، شریک جرم والی کانا پھوسی کے انداز میں۔

''ان کی لگام اسی کے ہاتھوں میں ہے،'' اس نے بتایا۔ پھر، چند لمحوں بعد: ''ہم اس کے قرضدار ہیں۔تم نے نہیں سنا؟ میری اُس کے ساتھ منگنی ہوگئی ہے۔''

''اس کے بیٹے کے ساتھ؟''

''ہاں۔''

''تمھیں اس سے محبت ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر کیوں شادی کر رہی ہو؟''

''ہمیں والد کو بچانا ہی ہوگا۔''

''تم اس کے بارے میں کیا جانتی ہو؟''

''ایک بری بات۔ ہنڈیاں اس کی تحویل میں ہیں۔''

''کیا تمھیں کسی اور سے محبت ہے؟''

اب خاموش رہنے کی باری اس کی تھی۔ وہ اپنے گلابی پالش چڑھے ناخنوں کو تکتی رہی۔ پھر، باعقل اور بالغ، اس نے آہستگی سے اضافہ کیا: ''مجھے والد سے محبت ہے۔ دنیا میں صرف دو ہی لوگ ہیں جو ان سے محبت کرتے ہیں: تم، ایسطر، اور میں۔ گابور تو کسی شمار قطار میں نہیں آتا۔ وہ بہت مختلف ہے۔''

''تم اس عورت کے بیٹے سے شادی نہیں کرنا چاہتیں؟''

''گابور نسبتاً زیادہ پرسکون ہے،'' وہ جواب دینے سے گریز کرتے ہوئے بولی۔ ''گویا کہ اس نے ایک نوع کے بہرے پن کے اُس پار خود کو قید کر رکھا ہے۔ وہ کچھ سننا نہیں چاہتا اور جو کچھ اس کے اردگرد ہو رہا ہے، اسے دیکھنے سے انکاری ہے۔ اپنی مدافعت کا یہی اس کا حربہ ہے۔''

''کوئی اور ہے؟'' میں ہمت کر کے اس کے قریب آئی۔ ''کوئی جس سے تمھیں محبت ہو، اور اگر معاملے کو سنوارا جا سکے... کسی طرح... یہ آسان نہیں ہوگا... اور یہ اچھی طرح جان لو، ایوا، کہ اب میری مالی حالت خستہ ہے، کہ اب ہم غریب ہیں، نونو، لاتسی اور میں... تاہم میں کسی کو جانتی ہوں جو شاید تمھاری مدد کر سکے۔''

Scanned with CamScanner

''ارے نہیں... تم بالکل مدد کرسکتی ہو،'' اس نے پھر اپنی سردمہر آواز میں کہا، ایسے لاأبالی یقین کے ساتھ جیسے کوئی ضمنی سی بات ہو۔ لیکن میری آنکھوں میں دیکھے اسے کچھ وقت ہو گیا تھا۔ وہ دریچے کی طرف پشت کیے کھڑی تھی اور مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لنچ کے بعد سے آسمان پر سرماہٹ چھا گئی تھی اور دریچے کے باہر تمبر کے گھنے سیاہ بادل باغ کے اوپر گھر گر آتے نظر آ رہے تھے۔ مدھم سی روشنی کمرے میں تیر رہی تھی۔ میں دریچے کے قریب آئی اور اس کا ایک پٹ بند کر دیا، اس ڈر سے کہ بارش کی آمد سے پہلے کی دبیز خاموشی میں کوئی ہماری باتیں نہ سن لے۔

''تم مجھے ضرور بتاؤ،'' میں نے کہا۔ میرا دل زمانوں کے بعد اتنی تیزی سے دھڑک رہا تھا، آخری بار شاید اس رات اس طرح دھڑکا تھا جب اماں کا انتقال ہوا تھا۔ ''اگر تم — تم اور تمھارے والد — ان لوگوں سے چھٹکارا پانا چاہتے ہو تو تمھیں بتانا ہوگا کہ کیا کوئی اور ہے جس سے تمھیں محبت ہے... اگر پیسہ کسی کام آسکتا ہو... اچھا تو اب مجھے بتاؤ۔''

''میرے خیال میں، ایستھر،'' اس نے نظریں نیچے فرش کی طرف کرتے ہوئے اپنی اسکول کی بچی والی معصوم آواز میں کہا، ''پیسہ، صرف پیسہ اب کام نہیں آسکتا۔ ہمیں تمھاری بھی ضرورت ہے۔ اگرچہ والد کو اس کا کوئی علم نہیں ہے،'' اس نے تیزی سے، تقریباً ہراساں، اضافہ کیا۔

''کس بات کا؟''

''یہ... جو میں نے تمھیں ابھی بتایا ہے۔''

''تو تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے آواز بلند کرتے ہوئے بے صبری سے پوچھا۔

''میں والد کو بچانا چاہتی ہوں،'' اس نے بے کیفی سے جواب دیا۔

''اِن لوگوں سے؟''

''ہاں۔''

''اور تم خود کو بھی بچانا چاہتی ہو؟''

''اگر ممکن ہو۔''

''تمھیں اُس سے محبت نہیں؟''

''نہیں۔''

''تم دور چلی جانا چاہتی ہو؟''

''ہاں۔''

''کہاں؟''

''ملک کے باہر۔ بہت دور۔''

''کیا کوئی تمھارا انتظار کر رہا ہے؟''

''ہاں۔''

''ہاں،'' میں نے دہرایا، اور دل کو کچھ ہلکا محسوس کر کے بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھ سینے پر رکھ لیے۔ مجھے پھر چکر سے آ رہے تھے، جیسے ہمیشہ اس وقت آنے لگتے ہیں جب میں سایوں کے بے مصرف مشاہدے اور انتظار کی دنیا سے قدم باہر نکال کر حقیقی دنیا کے روبرو آتی ہوں۔ حقیقت نسبتاً کتنی زیادہ سیدھی سادی ہے! ایوا کسی کو چاہتی ہے اور اس کے پاس چلی جانے کی خواہش مند ہے: وہ ایک شائستہ اور دھوکے فریب سے آزاد زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اور مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ہاں، ان تمام ذرائع کو بروے کار لا کر جو میری دسترس میں ہیں۔ میں نے تقریباً ندیدے پن سے پوچھا:

''میں کیا کر سکتی ہوں، ایوا؟''

''والد تمھیں خود بتائیں گے،'' اس نے دشواری کے ساتھ کہا، جیسے لفظوں کو ادا کرنے سے ہچکچا رہی ہو۔ ''ان کے پاس ایک منصوبہ ہے... میرا خیال ہے، ان لوگوں کے پاس کوئی منصوبہ ہے۔ تم سن ہی لوگی، ایستھر۔ یہ ان کا اور تمھارا معاملہ ہے۔ لیکن تم اگر چاہو تو خاص طور پر میری مدد کر سکتی ہو۔ اس گھر میں کوئی چیز میری ہے۔ کم از کم جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہ میری ہے... معاف کرنا، تم دیکھ سکتی ہو کہ مجھے شرم سی آ رہی ہے۔ اس کے بارے میں بات کرنا بڑا مشکل ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا،'' میں نے کہا اور اپنے ہاتھ سرد پڑتے محسوس کیے، ''تمھارا کیا مطلب ہے؟''

''مجھے پیسوں کی ضرورت ہے، ایستھر،'' اب اس نے بتایا۔ اس کی آواز ٹوٹتی ہوئی اور زنگی تھی، جیسے مجھ پر حملہ آور ہو۔ ''مجھے یہاں سے چلے جانے کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔''

''بالکل، ظاہر ہے،'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''پیسہ... مجھے یقین ہے کہ تھوڑا بہت کہیں سے

Scanned with CamScanner

پیدا کر سکتی ہوں۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ نونو بھی... شاید میں تیمور سے بھی بات کروں۔ لیکن ایوا،'' میں نے کہا، جیسے ہوش میں آتے ہوئے، مایوسی اور بے بسی سے، ''میں جو کچھ بھی جوڑ جاڑ کر جمع کروں گی، وہ بہت زیادہ نہیں ہوگا۔''

''مجھے تمھارے پیسے کی ضرورت نہیں،'' وہ سرد مہری اور گھمنڈ کے ساتھ بولی۔ ''میں کسی ایسی چیز کی طالب نہیں ہوں جو میری نہ ہو۔ میں تو صرف وہی چاہتی ہوں جو اماں میرے لیے چھوڑ گئی ہیں۔''

مجھے دیکھتے ہوئے اس کی آنکھیں اچانک سوزش اور تہمت سے جھلنے لگیں۔

''والد نے بتایا تھا کہ تم میرے ورثے کی نگرانی کر رہی ہو۔ اماں کا یہی کچھ میرے لیے باقی بچ رہا ہے۔ میری انگوٹھی لوٹا دو، ایستھر۔ ابھی، فوراً۔ انگوٹھی، تم سن رہی ہو؟''

''ہاں، انگوٹھی،'' میں نے کہا۔

وہ اتنی جارحیت سے مجھے گھور رہی تھی کہ میں پیچھے ہٹ گئی۔ اتفاق سے میں نے خود کو سائیڈ بورڈ کے پاس کھڑے پایا جس میں میں نے نقلی انگوٹھی چھپا رکھی تھی۔ بس مجھے اتنا ہی کرنا تھا کہ پیچھے جھکوں، دراز کھولوں، اور انگوٹھی اس کے حوالے کر دوں، انگوٹھی جس کا مطالبہ ولما کی بیٹی مجھ سے اتنی نفرت بھری آواز میں کر رہی تھی۔ میں وہاں لاچار کھڑی رہی، ہاتھ بندھے ہوئے، مصمم ارادہ کیے کہ لیوش کی فریب کاری کا راز فاش نہ ہونے دوں گی۔

''تمھارے والد نے کب اس انگوٹھی کا ذکر کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''پچھلے ہفتے،'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''جب انھوں نے بتایا کہ ہم یہاں آ رہے ہیں۔''

''کیا انھوں نے انگوٹھی کی قیمت کی بابت بھی کچھ کہا؟''

''ہاں۔ انھوں نے ایک بار اسے دکھوایا تھا۔ بہت زمانے پہلے، اماں کے انتقال کے بعد... تمھیں دینے سے پہلے انھوں نے اس کی قیمت نکلوائی تھی۔''

''اور اس کی کیا قیمت ہے؟'' میں نے سکون سے پوچھا۔

''بہت،'' وہ اپنی اسی مخصوص خرخری آواز میں بولی۔ ''کئی ہزار۔ شاید دس ہزار تک۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔

Scanned with CamScanner

پھر میں نے کہا اور اس پر حیرت کی کہ آخر میں کس طرح اپنے کو قابو میں رکھے ہوئے تھی اور تھوڑا بہت برتر محسوس کر رہی تھی: "میری لڑکی، انگوٹھی تمھیں نہیں ملنے والی۔"

"کیا کوئی انگوٹھی نہیں ہے؟" اس نے میرا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ پھر زیادہ آہستگی سے: "بات کیا ہے؟ کہ تم مجھے دینا نہیں چاہتیں، یا نہیں دوگی؟"

"میں اس کا جواب نہیں دوں گی،" میں نے کہا اور ٹھیک اپنے سامنے دیکھنے لگی۔ اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ لیوش آہستگی سے داخل ہوا ہے، انتہائی آہستہ اور نرم قدم، اتنی آہستگی اور نرمی سے جیسے کسی اسٹیج پر ہو، اور مجھے احساس ہو گیا کہ وہ کہیں آس پاس ہی ہے۔

"ایوا، ہمیں تنہا چھوڑ دو،" میں نے اسے کہتے ہوئے سنا۔ "مجھے ایستھر سے کچھ کام ہے۔"

میں نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔ ایوا بہت دیر کھڑی مجھ پر ایک طویل، گھناؤنی نگاہ ڈالتی رہی جس کا مقصد مجھے جتانا تھا کہ وہ مجھ پر بھروسا نہیں کرتی، پھر آہستگی کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی، لیکن کچھ دیر تک دہلیز پر ٹھہری، شانے اچکائے، اور پھر تیزی سے قدم اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس نے دروازہ آہستگی سے کھینچ کر بند کیا، جیسے اسے پوری طرح یقین نہ ہو۔ ہم ایک دوسرے پر نظر ڈالے بغیر کچھ دیر تک کمرے میں کھڑے رہے۔ پھر میں مڑی اور پندرہ سال میں پہلی بار تنہائی میں لیوش کے روبرو ہوئی۔

16

اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرایا، ایک عجیب، بے ادعا سی مسکراہٹ، جیسے کہنا چاہتا ہو: دیکھا تم نے، اب یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں تھی! اگر اس نے اس موقعے پر کسی مطمئن کاروباری کی طرح خوشی سے اپنے ہاتھ ملے ہوتے تو مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوتا جو ایک خاص اچھا سودا کرنے کے بعد اور لمحے کی سرخوشی میں نت نئے بیوپار اور اور بھی زیادہ ترغیب انگیز پیشکشوں کے منصوبے بناتے ہوئے اپنے گھر والوں سے مل رہا ہو۔ اس کے چہرے پر ندامت اور شک کی ادنیٰ سی جھلک بھی نہیں تھی۔ وہ اچھے موڈ میں تھا، کسی بچے کی طرح خوش۔

Scanned with CamScanner

''ایسھر، مجھے واقعی اچھی نیند آئی،'' اس نے فرحت سے کہا۔ ''ایسا لگا کہ بالآخر گھر لوٹ آیا ہوں۔''

جب میں نے کچھ نہیں کہا تو اس نے میری بانہہ پکڑ لی، مجھے ایک آرام کرسی کے پاس لے آیا اور بڑی شائستگی سے اس پر بٹھا دیا۔

''آخر کار اب میں تمھیں ٹھیک سے دیکھ سکتا ہوں،'' وہ بڑبڑایا۔ ''تم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ وقت اس گھر میں آ کر ٹھہر گیا ہے۔''

میری خاموشی نے اسے بالکل بھی تو مضطرب نہیں کیا۔ وہ آگے پیچھے چلنے لگا، مختلف تصویروں کو تکا، اور گاہے گاہے ہاتھوں کی گھٹیا سی ناٹکی جنبش کے ساتھ اپنے جھڑتے ہوئے لمبے بالوں کو سلجھایا۔ کمرے میں ہر طرف پھرتا پھرا، اتنی ہی بے فکری سے جیسے پچیس سال پہلے ایک دن چل دیا تھا کیونکہ اس کا کہیں اور موجود ہونا ضروری تھا لیکن اب واپس آ گیا ہے، اور محض شائستہ آداب کے تقاضے کے باعث بے دھیانی سے گفتگو کو دوبارہ شروع کر رہا ہے۔ اس نے ایک قدیم، وینس کا بنا ہوا شراب کا پیالہ میز سے اٹھایا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''یہ تمھارے والد کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ تمھاری سالگرہ کے موقعے پر، ہے نا؟ مجھے یاد ہے،'' اس نے ملنساری سے کہا۔

''تم نے انگوٹھی کب بیچی؟'' میں نے پوچھا۔

''انگوٹھی؟''

اس نے بڑے غور و فکر اور حیرانی کے تاثر سے چھت کی طرف دیکھا۔ اس کے لب ہولے سے ہلے، یوں جیسے کچھ گن رہا ہو۔

''مجھے یاد نہیں،'' اس نے غایت درجہ دلکشی سے کہا۔

''ایک متوقع کہانی، لیوش،'' میں نے اس پر دباؤ ڈالا۔ ''ماضی پر نظر ڈال کر دیکھو۔ مجھے یقین ہے کہ یاد آ جائے گا۔''

''انگوٹھی، انگوٹھی،'' اس نے دہرایا، جیسے احسان کر رہا ہو، اور سر کو یوں ہلانے لگا گویا کسی کی للک کو پورا کر کے اسے بڑی زیادہ مسرت ہوگی، ایک مخصوص من موجی تجسس کو جس کی بس واجبی سی اہمیت

ہو سکتی ہے۔

''ہاں تو، میں نے انگوٹھی کب فروخت کی؟ میرا خیال ہے، ولما کی موت سے چند ہفتے پہلے۔ تم جانتی ہو، ان دنوں میں ہمارے پاس بہت کم پیسے تھے... ڈاکٹروں کے خرچے، مجلسی زندگی... ہاں، یقیناً وہی سال رہا ہوگا۔''

اور اس نے اپنی چمکتی ہوئی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں، معصومیت سے دمکتی ہوئی۔

''لیکن ایستھر،'' اس نے بات جاری رکھی، ''تمھیں انگوٹھی میں کیوں دلچسپی ہے؟''

''اور پھر تم نے نقلی انگوٹھی مجھے دی۔ یاد ہے؟'' میں نے پوچھا، اور ایک قدم اس کی طرف بڑھایا۔

''میں نے تمھیں دی؟'' اس نے میکانکی انداز میں دہرایا، اور بلا ارادہ ایک قدم پیچھے ہٹا۔ ''ہو سکتا ہے۔ کیا واقعی دی تھی؟''

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا، لیکن کسی قدر کم تیقن سے۔ میں سائیڈ بورڈ کے پاس آئی، اسے کھولا، اور سیدھی انگوٹھی کے پاس گئی۔

''تمھیں اب بھی یاد نہیں؟'' میں نے پوچھا، اور اسے تھما دی۔

''ہاں،'' وہ آہستگی سے بولا۔ ''اب مجھے یاد آ گیا۔''

''تم نے انگوٹھی بیچ ڈالی،'' میں نے کہا۔ خود میری آواز بھی بلا ارادہ مدھم پڑ گئی تھی، جس طرح ٹھیک اس وقت پڑ جاتی ہے جب انسان کوئی شدید قابلِ شرم بات کہہ رہا ہو جسے راز رکھنا ضروری ہو، حتیٰ کہ شاید خدا سے بھی۔ ''اور جب ہم کفن دفن سے لوٹے تو یہ تم نے مجھے بڑے طمطراق کے ساتھ ولما کے ورثے کے طور پر دی۔ خاندان کی واحد موروثی شے کے طور پر جس کی کوئی قدر و قیمت تھی، کوئی ایسی چیز جو صرف مجھی کو ملنی چاہیے۔ مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا تھا۔ میں نے احتجاج بھی کیا تھا... تمھیں یاد ہے؟ لیکن پھر میں نے اسے قبول کر لیا تھا اور تم سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی نگہبانی کروں گی اور جب ایوا بڑی ہو جائے گی اور جب اسے اس کی ضرورت ہوگی، اسے دے دوں گی۔ تمھیں ابھی تک، یاد نہیں آیا؟''

''تم نے یہ وعدہ کیا تھا، واقعی؟'' اس نے ہلکے پن سے پوچھا۔ ''اچھا، اب اگر وہ مانگے تو اسے

دے دینا،'' اس نے اپنے شانے کے اوپر سے اضافہ کیا۔ اب وہ پھر چکر لگانے لگا تھا اور سگریٹ بھی جلالی تھی۔

''پچھلے ہفتے تم نے ایوا سے کہا کہ میں اس کے لیے انگوٹھی کی رکھوالی کر رہی ہوں۔ ایوا کو پیسوں کی ضرورت ہے: وہ انگوٹھی بیچنا چاہتی ہے۔ جس لمحے وہ اس کی قیمت نکلوانے جائے گی، اسے پتا چل جائے گا کہ یہ نقلی ہے۔ ظاہر ہے، جعلسازی کی ذمے دار میں ہی ٹھہروں گی۔ یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے،'' میں نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیوں؟'' اس نے دنگ ہو کر پوچھا۔ یہ ایک سادہ سا سوال تھا۔ ''تمھیں کیوں؟ کوئی اور بھی ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ولما۔''

ہم خاموش کھڑے رہے۔

''تم کتنا نیچے گرو گے، لیوش؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے آنکھیں جھپکیں اور سگریٹ پر ٹکی راکھ کا جائزہ لینے لگا۔

''یہ کس قسم کا سوال ہے... تم کتنا نیچے گرو گے؟'' اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

''تم کتنا نیچے گرو گے؟'' میں نے دہرایا۔ ''میرے خیال میں ہر فرد کے اندر کسی نہ کسی قسم کا آلہ ہوتا ہے، نفس کی ایسی سطح جو یہ تعین کرتی ہے کہ اس میں کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ یہ ایک آفاقی بات ہے، ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے، ہر چیز جس کا سروکار انسانی تعلقات سے ہے۔ لیکن تم ایسا کوئی آلہ نہیں رکھتے۔''

''صرف لفاظی!'' وہ بولا، اور ہاتھ لہرا کر میری باتوں کو یوں برطرف کر دیا جیسے بیزار ہو گیا ہو۔ ''آلے، سطحیں... اچھا اور برا... صرف لفظ، ایستھر۔''

''کیا تم نے غور کیا ہے،'' اس نے اپنی بات جاری رکھی، ''کہ ہمارے بیشتر افعال بغیر کسی وجہ کے کیے جاتے ہیں اور بلا مقصد ہوتے ہیں؟ لوگ ایسے عمل کرتے ہیں جو نہ انھیں فائدہ پہنچاتے ہیں نہ مسرت۔ اگر تم پیچھے اپنی زندگی پر نظر ڈالو تو اندازہ ہو جائے گا کہ تم نے بہت ساری چیزیں صرف اس لیے کیں کہ ان کا کرنا تمھیں ناممکن لگتا تھا۔''

''میرے حساب سے یہ کچھ زیادہ ہی ہوائی باتیں ہیں،'' میں نے بیٹھے دل سے کہا۔

''ہوائی؟ بکواس! بس تھوڑی سی بے آرام کردینے والی ضرور ہیں، ایستھر۔ زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب آدمی ہر چیز کے ایک مقصد رکھنے سے بیزار ہو جاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ وہی کرنا پسند کیا ہے جس کا کوئی مقصد نہ ہو، جس کی توجیہہ نہ کی جاسکتی ہو۔''

''لیکن انگوٹھی،'' میں مصر رہی۔

''انگوٹھی، انگوٹھی!'' وہ جھنجلاہٹ سے بڑبڑایا۔ ''اب انگوٹھی کا قصہ چھوڑو! کیا میں نے ایوا سے کہا کہ تم انگوٹھی کی دیکھ بھال کر رہی ہو؟ شاید کہا ہو۔ کیوں کہا ہوگا؟ اس لیے کہ اُن دنوں یہ کہنے کے قابل بات لگی ہوگی، یہ حد سے زیادہ سیدھی سادی، حد سے زیادہ معقول بات تھی۔ تم انگوٹھی کا قصہ لے بیٹھتی ہو... لاتسی پرانے بلوں کی بات کرنے لگتا ہے... آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ یہ سب ماضی کی باتیں ہیں، ان کا اب وجود نہیں رہا۔ زندگی ہر شے کو تاراج کر دیتی ہے۔ ساری زندگی احساسِ جرم کو لیے رہنا ناممکن ہے۔ جس طرح تم نے نقشہ کھینچا ہے، آخر کون سی روح اتنی معصوم ہے؟ کون اتنا بلند و بالا ہے کہ اسے ساری عمر دوسرے کا راستہ روکنے کا حق پہنچتا ہو؟ خود قانون بھی فرسودگی اور منسوخی کے تصور کا قائل ہے۔ یہ صرف تمھی لوگ ہو جو اس کے انکار پر مصر ہو۔''

''تمھیں یہ خیال نہیں آرہا کہ تم ذرا زیادتی کر رہے ہو؟'' میں نے اور زیادہ دبی آواز میں پوچھا۔

''شاید،'' وہ بھی نسبتاً زیادہ آہستگی سے بولا۔ ''سطحیں! روح کے آلے! مہربانی سے یہ جان لو کہ زندگی میں کوئی آلے والے نہیں ہوتے۔ ہوسکتا ہے میں نے ایوا سے کچھ کہا ہو، میں گذشتہ کل یا دس سال پہلے کسی غلطی کا مرتکب ہوا ہوں، جس کا تعلق روپے پیسے یا انگوٹھی یا الفاظ سے ہو۔ میں نے ساری زندگی کبھی کسی خاص راستے پر گامزن رہنے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ آخر میں لوگ صرف انھیں چیزوں کے ذمے دار ہیں جو وہ شعوری طور پر کرتے ہیں... افعال؟ وہ کیا ہوتے ہیں؟ جبلتیں، جو آدمی کو بے خبری میں آلیتی ہیں۔ لوگ بس کھڑے انھیں خود کو انجام دیتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اصل چیز ہے نیت، ایستھر، نیت ہی احساسِ جرم ہے۔ میری نیت ہمیشہ نیک رہی ہے۔'' اس نے آسودگی سے اعلان کیا۔

''ٹھیک ہے،'' میں نے بے یقینی سے جواب دیا۔ ''تمھاری نیت نیک رہی ہوگی۔''

Scanned with CamScanner

''مجھے پتا ہے،'' وہ بولا، کچھ اور دبی آواز میں، تھوڑی سی جراءت کے ساتھ، ''مجھے پتا ہے کہ اس دنیا میں مَیں کہیں نہیں کھپ سکتا۔ تو کیا اب میں اپنے کو بدل دوں، اپنے چھپن ویں سال میں؟ میں نے کسی کے حق میں سوائے بھلائی کے کبھی کچھ نہیں چاہا ہے۔ لیکن دنیا میں بھلائی کے امکانات بہت محدود ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ زندگی کو خوشگوار بنائے، ورنہ یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ایوا سے انگوٹھی کے بارے میں کہا جو کچھ کہا۔ اس امکان سے اُس وقت اطمینان محسوس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پندرہ سال پہلے میں نے لاتسی سے کہا کہ میں اس کا قرضہ ادا کردوں گا، حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ میں ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ یہی وجہ ہے کہ لمحے کی ترنگ میں آ کر میں لوگوں سے دنیا جہان کے وعدے کرتا ہوں، اور ٹھیک اسی لمحے یہ بھی جانتا ہوں کہ جو وعدے کر رہا ہوں کبھی پورے نہیں کروں گا۔ اور اس لیے میں نے ولما سے بھی کہا تھا کہ مجھے اس سے محبت ہے۔''

''یہ تم نے اس سے کیوں کہا تھا؟'' میں نے پوچھا، اس پر متحیر کہ میں خود کو کتنا پرسکون اور لاتعلق محسوس کر رہی تھی۔

''اس لیے کہ وہ یہی سننا چاہتی تھی،'' وہ کسی بھی خیال کے بغیر بولا۔ ''اس لیے کہ اس نے اپنی ساری زندگی اس داؤ پر لگا دی تھی کہ میں اس سے یہ کہوں۔ اور اس لیے بھی کہ تم نے مجھے اس سے یہ کہنے سے نہیں روکا۔''

''میں نے؟'' میں نے سرگوشی میں کہا، چکرا کر، اب خاص طور پر چکرا کر کیونکہ میرا دم سچ مچ گھٹنے لگا تھا۔ ''میں کیا کر سکتی تھی؟''

''سب کچھ، ایستھر،'' اس نے کہا، کسی نومولود کی معصومیت کے ساتھ۔ یہ وہی پرانی آواز تھی، اس کی جوانی کی آواز۔ ''سب کچھ! تم نے میرے خطوں کا جواب کیوں نہیں دیا جبکہ تم تب بھی ایسا کر سکتی تھیں؟ تم انھیں کیوں بھول گئیں اور جاتے وقت ہمارے پاس کیوں چھوڑ آئیں؟ یہ خط ایوا کو مل گئے۔

وہ اب میرے پاس آیا، کافی قریب، اور مجھ پر جھکا۔

''تم نے وہ خط دیکھے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے دیکھے ہیں؟... میری سمجھ میں نہیں آ رہا، ایستھر۔ میں نے ہی تو لکھے تھے!''

اور میں اس کی آواز سے پہچان سکتی تھی کہ پہلی مرتبہ، اپنی زندگی میں شاید پہلی بار، وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

17

''اچھا اب میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں،'' اس نے کہا اور تصویروں والے سائیڈ بورڈ پر جھکتے ہوئے ایک سگریٹ سلگائی اور تیلی بے دھیانی سے اس ڈبے میں پھینک دی جس میں لوگوں کے ملاقاتی کارڈز رکھے تھے۔ ''ہم دونوں کے درمیان کچھ ہوا ہے جسے ہم گفتگو کیے بغیر یکسو نہیں کر سکتے۔ آدمی اپنی زندگی کی اہم ترین باتوں کی بابت ساری زندگی خاموش رہ سکتا ہے۔ لوگ بنا منھ کھولے مر جاتے ہیں۔ لیکن ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب آدمی کو خاموش نہیں رہنا چاہیے۔ میرے خیال میں اس قسم کی خاموشی ہی وہ اولین گناہ رہی ہوگی جس کا انجیل میں ذکر آیا ہے۔ ایک قدیم جھوٹ زندگی کے قلب میں پیوست ہے، اور اس کو پہچاننے میں آدمی کو بڑا وقت لگتا ہے۔ تم بیٹھو گی نہیں؟ بیٹھ جاؤ، ایستھر، اور میری پوری بات سنو۔ نہیں، معاف کرنا، اس وقت، صرف اس بار، میں بیک وقت مدعی اور منصف دونوں ہونا چاہتا ہوں۔ اس تمام مدت میں منصف تم ہی رہی ہو۔ مہربانی کرو اور بیٹھ جاؤ۔''

وہ بڑے ادب اور شائستگی سے بولا، لیکن تقریباً تحکمانہ انداز میں۔

''ہاں، تو،'' اس نے کہا اور ایک کرسی میری جانب کھینچی۔ ''دیکھو ایستھر، بیس سال تک ہم ایک دوسرے کے متضاد باتیں کرتے رہے ہیں۔ چیزیں اتنی سادہ نہیں ہیں۔ تم نے میرے خلاف اپنے —اپنے اور دوسروں کے— الزامات کا بہی کھاتا پڑھ کر سنا دیا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ یہ نقائص ہیں، آہ، اور بالکل درست ہیں۔ تم انگوٹھیوں اور دروغوں کی بات کرتی ہو، وعدے جو وفا نہیں کیے گئے، بل جو میں نے نہیں چکائے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اور بھی چیزیں ہیں، ایستھر، اور اس سے بدتر۔ ان کی بازخوانی کی چنداں ضرورت نہیں... میں اپنی برأت میں کوئی عذر پیش نہیں کر رہا... لیکن اس قسم کی جزئیات میرے مستقبل کا فیصلہ نہیں کریں گی۔ میں ہمیشہ سے ایک کمزور آدمی رہا ہوں۔ مجھے حسرت رہی کہ میں نے دنیا میں کوئی کارنامہ انجام دیا ہوتا، اور اتنا احساس مجھے ضرور ہے کہ میں گنوں

سے بالکل ہی خالی نہیں ہوں۔ لیکن لگن اور عزم ہی کافی نہیں۔ اب مجھے بالکل معلوم ہے کہ یہ کافی نہیں ہوتے۔ واقعی مولک ہونے کے لیے آدمی کو کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے... کوئی خاص طاقت یا نظم وضبط، یا ان دونوں کا امتزاج؛ وہ چیز، جو میں سمجھتا ہوں، کردار کہلاتی ہے... اور وہ وصف، وہ لگن ایک ایسی چیز ہے جو مجھ میں مفقود ہے۔ یہ ایک عجیب طرح کے بہرے پن جیسا ہے۔ یوں سمجھ لو جیسے میں موسیقی سے واقف ہوں، جو دھن بجائی جا رہی ہے اسے جانتا ہوں، بالکل حرف بہ حرف، لیکن اس کے سُر سننے سے معذور ہوں۔ جب میں تم سے ملا تھا اس وقت مَیں یہ سب جو تم سے اب کہہ رہا ہوں اتنے یقین سے نہیں جانتا تھا... مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ تم میرے لیے کردار کی نمائندگی کرتی تھیں۔ سمجھیں؟''

''نہیں،'' میں نے دیانت داری سے کہا۔

عجیب بات ہے کہ یہ اس کے لفظ نہیں تھے جن پر میں دنگ رہ گئی تھی، بلکہ اس کی آواز، اس کا بولنے کا انداز۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی اس طرح بات کرتے نہیں سنا تھا۔ وہ ایسے آدمی کی طرح بول رہا تھا جو... لیکن اس آواز کو لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ وہ ایسے آدمی کی طرح بول رہا تھا جس نے کچھ دیکھا یا دریافت کیا ہو، کوئی سچائی، یا اسے دریافت کرنے کی راہ میں ہو، گو وہ ابھی اس کا اعلان نہ کر سکتا ہو، کیونکہ وہ لحہ لحہ اس کے قریب آتا جا رہا ہو اور اپنے مقدور بھر دنیا سے چلّا چلّا کر اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا ہو۔ وہ ایسے آدمی کی طرح بول رہا تھا جس نے کچھ محسوس کر لیا ہو۔ میں کچھ کہے بغیر سنتی رہی۔

''یہ بہت آسان بات ہے،'' اس نے کہا۔ ''تم اسے فوراً سمجھ لوگی۔ وہ چیز جو مجھ میں مفقود تھی تم تھیں... تم میرا کردار تھیں، میرا وجود۔ آدمی اس قسم کی چیز کو پہچانتا ہے۔ بے کردار، یا ناقص کردار کا آدمی، اخلاقی اعتبار سے ایک طرح کا اپاہج ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہیں، جو ہر دوسرے اعتبار سے بالکل معمول کے مطابق ہوتے ہیں، بس ایک بازو نہیں ہوتا یا ایک ٹانگ، اور اچانک دوبارہ کام کرنے کے اہل ہو جاتے ہیں، کارآمد بن جاتے ہیں۔ مہربانی سے میرے اس موازنے پر ناراض نہ ہونا، لیکن تم میرے واسطے ایک نوع کے مصنوعی عضو کی طرح رہی ہوگی... ایک اخلاقی مصنوعی عضو۔ میری باتوں سے دل آزاری تو نہیں ہو رہی؟'' اس نے نرمی سے پوچھا، اور میری طرف جھکا۔

Scanned with CamScanner

''نہیں،'' میں نے کہا۔ ''بس اتنا ہے کہ مجھے اس پر یقین نہیں، لیوش۔ ایسی کسی چیز کا وجود نہیں جسے مصنوعی وجود کہا جا سکے۔ آدمی ایک ہستی کا اخلاقی کردار کسی دوسری ہستی پر چسپاں نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کرنا، مگر یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔''

''نہیں، یہ محض باتیں نہیں ہیں۔ اخلاقی کردار ایسی شے نہیں جو ورثے میں ملتی ہو بلکہ وہ خاصیت ہے جو آدمی خود حاصل کرتا ہے۔ لوگ اخلاق لے کر پیدا نہیں ہوتے۔ جنگلی جانوروں کے اخلاق، بچوں کے اخلاق، وہ اخلاق نہیں ہوتے جو ویانا یا ایمسٹرڈم کے کسی ساٹھ سالہ سرکٹ جج کے ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے اخلاق اسی طرح حاصل کرتے ہیں جیسے اپنے عادات واطوار اور اپنی تہذیب وشائستگی۔'' وہ کسی کاہن کی طرح ترنم سے بات کر رہا تھا۔ ''کچھ لوگ اخلاقی کردار کے معاملے میں زیادہ باصلاحیت ہوتے ہیں، بالکل ظاہری بات ہے۔ اخلاقی اعتبار سے نابغے ہوتے ہیں، جس طرح موسیقی اور ادب کے نابغے۔ ایستھر، نہیں، براہ کرم اس کی تردید نہ کرو۔ یہ مجھے تم میں محسوس ہوتا ہے۔ اخلاقی معاملات میں میں نرا بہرا ہوں، تقریباً ناخواندہ۔ اس لیے مجھے تمھاری رفاقت کی ضرورت تھی، یا میرے خیال میں کم از کم یہی اہم ترین وجہ ہے۔''

میں بھی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ''مجھے اس پر یقین نہیں آتا،'' میں نے کہا، ''لیکن اگر مان لیں کہ یہ ایسا ہی ہے، تو بھی لیوش، تم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ کوئی ہر قسم کے اخلاقی اعتبار سے ناقص لوگوں کی اخلاقی آیا کا کام انجام دے۔ کوئی عورت ساری زندگی ایک اخلاقی انّا کا کردار انجام نہیں دے سکتی۔''

''کوئی عورت! کوئی عورت!'' اس نے تیزی سے کہا، میرے جواب کو شائستگی سے ہاتھ لہرا کر دور کرتے ہوئے۔ ''میں تمھاری بات کر رہا ہوں، ایستھر۔ میری مراد تم سے ہے۔''

''کوئی عورت،'' میں نے کہا، اور خون کو اپنے چہرے کی طرف دوڑتے ہوئے محسوس کیا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تمھاری مراد مجھ ہی سے ہے۔ میں ساری زندگی دنیا کے ایک جھوٹے تصور کا پیمانہ بنے رہنے سے تنگ آ گئی ہوں۔ اب، آخرکار، اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ اسے دوبارہ کہنے کا کوئی مقصد نہیں نکلتا... اگرچہ شاید تم نے یہ بات صحیح کہی: ہم اس کی بابت ساری عمر خاموش نہیں رہ سکتے۔ مجھے تمھارے خیالات پر یقین نہیں، لیوش، مجھے حقیقت پر یقین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے میرے

Scanned with CamScanner

ساتھ دھوکا کیا؛ کسی گزرے بیتے زمانے میں لوگوں نے اسے زیادہ آراستہ و پیراستہ، زیادہ رومانی انداز میں ادا کیا ہوتا، جیسے: 'میں تمھارا بازیچہ تھی، تمھارا کھلونا۔' تم عجیب جواری ہو؛ تم شدید جذبوں اور لوگوں سے کھیلتے ہو، پتوں سے نہیں۔ میں تمھارے ہاتھ میں ایک ملکہ والا پتا تھی۔ تم اٹھے اور کہیں چل دیے۔ کیوں؟ اس لیے کہ دل اُوب گیا تھا۔ طبیعت بھر گئی تھی اور بس، چلتے بنے۔ سچ یہ ہے۔ یہی ہولناک غیر اخلاقی سچ ہے۔ آدمی کسی عورت کو اس طرح اٹھا کر نہیں پھینک سکتا جیسے ماچس کی ڈبیا کو، صرف اس لیے کہ اس کی دلچسپیاں اور ہیں، کہ یہ اس کی فطرت کا حصہ ہے، کہ وہ کسی ایک عورت سے بندھے رہنا ناممکن پاتا ہے، یا یہ کہ وہ بڑے عزائم رکھتا ہے، یا یہ کہ ہر شے اور ہر شخص محض کار آمد ہے۔ میں تو یہ بھی سمجھ سکتی ہوں کہ... یہ ایک بڑا پست فعل ہونے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک انسانی بھی ہے۔ لیکن کسی کو محض لاپروائی کے باعث مسترد کر دینا، یہ تو پست سے بھی زیادہ پست ہے۔ اس سے کسی طرح بھی درگزر نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ قطعی غیر انسانی ہے۔ اب آیا سمجھ میں؟''

''لیکن، ایستھر، میں نے تو تمھیں بلایا تھا،'' اس نے بے حد آہستگی سے کہا۔ ''تمھیں یاد نہیں؟ ہاں، میں کمزور تھا۔ لیکن پھر، آخری لمحے میں، میں ہوش میں آ گیا اور جان گیا کہ صرف تمھی میری مدد کر سکتی ہو۔ میں نے تمھیں بلایا، تم سے التجا کی۔ تمھیں میرے خط یاد نہیں؟''

''مجھے تمھارے خطوں کا کوئی علم نہیں،'' میں نے کہا، اور اپنی آواز کی شدید تندی کو محسوس کر کے خوفزدہ ہو گئی۔ یہ ہمیشہ سے زیادہ تند تھی، تقریباً چیختی ہوئی۔ ''یہ سب جھوٹ ہیں۔ خط جھوٹ ہیں، انگوٹھی کی طرح، ہر اس چیز کی طرح جو تم نے کبھی مجھ سے کہی یا جس کا وعدہ کیا۔ مجھے خطوں کا کوئی علم نہیں۔ مجھے ان پر یقین نہیں۔ ایوا نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے کہ اسے اس قسم کے خط ملے ہیں... خوشبودار لکڑی کے ڈبے میں رکھے ہوئے... مجھے کیسے معلوم ہو کہ اس میں سچ کیا ہے؟ میں تم پر اعتماد نہیں کرتی۔ اور مجھے ایوا پر بھی بھروسا نہیں۔ مجھے ماضی پر یقین نہیں۔ یہ سب جھوٹ ہیں اور سازشیں، ناٹک کا ایک حصہ جو اسٹیج کی ساری خصوصیتوں سے لبریز ہے... پرانے خطوط اور عہد و پیمان، جو کبھی نہیں کیے گئے۔ لیوش، میں ان دنوں تھیٹر دیکھنے نہیں جاتی۔ پندرہ سال سے میں نے کسی تھیٹر میں قدم بھی نہیں رکھا۔ میں باہر نہیں نکلتی۔ مجھے صداقت کا علم ہے، آیا تمھاری سمجھ میں؟ صداقت۔ میری طرف دیکھو۔ یہ صداقت ہے! میری آنکھوں میں جھانکو! میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ ہم زندگی کے

اختتام پر ہیں، جیسا کہ خود تم نے بڑے طمطراق سے اعلان کیا ہے۔ ہاں، یہ خاتمہ ہے، اور جس طرح زندگی گزری ہے اس کی وجہ تم ہو، اتنی سونی، اتنی جھوٹی؛ اسی وجہ سے میں یہاں رہی ہوں، تن تنہا زندگی گزارتی ہوئی، اس بن بیاہی بڑھیا کی طرح جو اپنے جذبات سے کفایت برتتی ہو لیکن آخرِ کار کتا بلی پال لیتی ہو... میرے پالتو، لوگ ہیں۔"

"ہاں،" اس نے اعتراف کیا، اور احساسِ جرم سے سر جھکا لیا۔ "ایسا کرنا بڑا خطرناک ہے۔"

"ہاں، خطرناک،" میں نے دہرایا، بلا ارادہ اور مقابلتاً زیادہ آہستگی سے، پھر بالکل خاموش ہوگئی۔ اس سے پہلے میں ایک ہی جھپٹے میں اتنے جذباتی خروش سے اور اتنی دیر تک پہلے کبھی نہیں بولی تھی۔

"سو نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیں اس معاملے کو یہیں لپیٹ دینا چاہیے،" میں نے کہا۔ معاً میں نے خود کو کمزور محسوس کیا۔ میں رونا نہیں چاہتی تھی، سو میں وہیں اپنے بازو لپیٹے اور پیٹھ سیدھی کیے بیٹھی رہی، لیکن میں ضرور زرد پڑ گئی ہوں گی کیونکہ لیوش نے مجھے تشویش کے ساتھ دیکھا۔

"پانی پیوگی؟ کسی کو بلاؤں؟"

"کسی کو نہیں،" میں نے کہا۔ "کوئی اہم بات نہیں۔ لگتا ہے اب میں اتنی تندرست نہیں رہی جتنی پہلے ہوا کرتی تھی۔ دیکھو، لیوش، جب دو لوگ ہنوز اس منزل میں ہوتے ہیں جب ایک دوسرے کے لفظوں پر شک کرتا ہے، تو تب بھی کافی زمین ہوتی ہے، خواہ کتنی ہی اتھلی، کہ اس پر ایک تعلق کی بنیاد ڈالی جا سکے۔ زمین دلدلی ہو سکتی ہے یا بھر بھری ریتیلی۔ آدمی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو تعمیر کر رہا ہے آخر کار ڈھے جائے گی، تاہم اس کوشش میں کوئی چیز حقیقی ہوتی ہے، انسانی اور مقدر۔ لیکن وہ جنھیں تمھاری تعمیر کے اوپر تعمیر کرنے کا عذاب دیا گیا ہو ان کا حال کہیں زیادہ برا ہوتا ہے، کیونکہ ایک دن وہ یہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے تو ہوا پر تعمیر کی ہے، یعنی صفر پر۔ کچھ لوگ اس لیے دروغ گوئی کرتے ہیں کہ یہ ان کی فطرت ہے، کیونکہ وہ کسی فائدے یا لمحاتی دھوم دھڑ کے متلاشی ہوتے ہیں۔ لیکن تم اس طرح جھوٹ بولتے ہو جیسے بارش برستی ہے: تم اپنے آنسوؤں کے ذریعے جھوٹ بول سکتے ہو، تم اپنے افعال کے ذریعے جھوٹ بول سکتے ہو۔ یہ بہت مشکل کام ہوگا۔ ایسے وقت آتے ہیں جب میں تمھیں ایک مطلق نابغہ خیال کرتی ہوں... جھوٹوں کا نابغہ۔ تم میری آنکھوں میں جھانک

Scanned with CamScanner

کر دیکھو یا مجھے چھوؤ، آنکھوں سے آنسو جاری ہوں، اور میں محسوس کرنے لگوں کہ تمھارے ہاتھ کس طرح لرز رہے ہیں، لیکن اس تمام مدت میں مجھے معلوم ہوتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، کہ تم نے ہمیشہ جھوٹ بولا ہے، ٹھیک اولین لمحے سے۔ تمھاری زندگی ایک طویل جھوٹ ہے۔ میں تو تمھاری موت پر بھی یقین نہیں رکھتی: وہ بھی ایک جھوٹ ہی ہوگی۔ ارے ہاں، تم ایک نابغہ ہو، اس میں کیا شک!"

"یوں ہی سہی،" اس نے سکون سے کہا۔ "بہر حال، میں وہ خط تمھارے لیے لیتا آیا ہوں۔ آخر میں نے ہی تو لکھے تھے، تمھارے لیے۔ یہ رہے۔"

اور ایک سادہ سی متواضع جنبش کے ساتھ اس نے تین خط اپنے کوٹ کی جیب سے نکالے اور مجھے دے دیے۔

18

اس موقعے پر مجھے خطوں کے مشمولات سے زیادہ سروکار نہیں تھا۔ مجھے لیوش کی مراسلتی قابلیتوں کا پورا پورا اندازہ تھا۔ لیکن میں نے لفافوں پر ایک بھرپور نظر ضرور ڈالی۔ تینوں پر میرا نام اور پتا درج تھا، اور خط بلا شبہ لیوش ہی کا تھا، اور جو مہر لگی ہوئی تھی وہ بتا رہی تھی کہ یہ بائیس سال قبل ڈاک کے سپرد کیے گئے تھے، ولما اور لیوش کی شادی سے ایک ہفتہ پہلے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مجھے کبھی وصول نہیں ہوئے تھے۔ کسی نے انھیں ضرور بیچ ہی میں روک لیا تھا۔ انھیں چرا لینا اتنا دشوار نہیں رہا ہوگا: یہ ہمیشہ ولما ہوتی تھی، ڈاک کے معاملے میں انتہائی متجسس، جو ڈاکیے سے خط خود وصول کرتی تھی، اور اسی کے پاس سائیڈ بورڈ کی کنجی بھی ہوتی تھی۔ میں نے غور سے لفافوں کے پشت کا جائزہ لیا، اور پھر سائیڈ بورڈ پر دوسری چیزوں کے پاس ڈال دیا، ولما کی تصویر کے برابر۔

"تم انھیں پڑھنا نہیں چاہتیں؟" لیوش نے پوچھا۔

"نہیں،" میں نے جواب دیا۔ "کیوں؟ مجھے یقین ہے کہ ان میں وہی سب لکھا ہے جو تم نے ابھی بتایا ہے۔ ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ تم..." میں نے کہا، تقریباً دیوانگی سے، لفظوں کو یوں ادا

Scanned with CamScanner

کرتے ہوئے جیسے کوئی دریافت کر رہی ہوں، ''تم تو حقیقت سے بھی جھوٹ بلوا سکتے ہو۔''

''تم تمھیں یہ خط کبھی نہیں ملے؟'' لیوش نے کسی ہلچل کے بغیر پوچھا، جیسے اسے میری خوشہ چینیوں کی بہت زیادہ پروا نہ ہو۔

''کبھی نہیں۔''

''میرے خط کس نے غائب کیے؟''

''کس نے غائب کیے؟ وِلما نے۔ اور کس نے؟ اس سے کسی اور کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟''

''بے شک،'' وہ بولا۔ ''ولما کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔''

وہ سائیڈ بورڈ کے قریب گیا اور خوب اچھی طرح خطوں پر ٹکٹوں اور ان پر لگی مہروں کو دیکھا، پھر اور قریب آ کر جھکا اور ولما کی تصویر کو دیکھنے لگا، چہرے پر دلچسپی کی خوشگوار مسکراہٹ لیے، سگار ہاتھ میں، جس سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ رہے تھے۔ اس نے پورے انہماک سے تصویر کو دیکھا، جیسے میں کمرے میں موجود ہی نہ ہوں، سر ہلاتا رہا، اور پھر مدھم سی تحسین آمیز سیٹی بجائی، یوں جیسے ایک نقب زن کسی دوسرے نقب زن کے کام کی داد دے۔ وہ وہاں کھڑا تھا، ٹانگیں خوب چوڑی کیے، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں دھواں دیتا ہوا سگار، ایک مطمئن پیشہ ور۔

''اس نے بڑی استادی سے کام کیا!'' اس نے بالآخر کہا، میری طرف مڑا اور ایک قدم پاس آ کر رک گیا۔ ''لیکن اس صورت میں،'' اس نے بات جاری رکھی، ''تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟ میرا جرم کیا ہے؟ مجھ پر کون سا قرضہ نکلتا ہے؟ کون سی اہم چیز ہے جو میں کرنے میں ناکام رہا؟ اس میں جھوٹ کیا ہے؟ بس جزئیات ہی ہیں۔ لیکن ایک لمحہ تھا،'' اس نے خطوں کی طرف اشارہ کیا، ''جب میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا، جب میں نے اپنے ہاتھ پھیلائے کیونکہ میں چکرا کر گرنے کو ہو رہا تھا، بالکل جس طرح ایک بلند تاروں پر چلنے والا بازیگر چکرانے لگتا ہے۔ اور تم نے میری مدد نہیں کی۔ کسی نے ایک انگلی تک نہ اٹھائی۔ سو میں جس طرح بھی ہو سکا، رقص کیے گیا، کیونکہ ایک پینتیس سالہ آدمی اتنی بلندی سے گرنے کا تصور نہیں کرتا... تم جانتی ہو کہ میں خاص طور پر جذباتیت کی رو میں نہیں بہہ جاتا ہوں، یہ ٹھیک ہے، اور میں تو ایک بہت ہیجانی آدمی بھی نہیں ہوں۔ مجھے بس زندگی ہی سے دلچسپی تھی... خطرات مول لینے سے... کھیل، جیسا کہ تم نے کہا۔ میں نہ کبھی اس قسم کا آدمی تھا، نہ رہا

ہوں جو ایک عورت کی خاطر ہر چیز داؤ پر لگا دے، کسی شغل یا جذبے کی خاطر... اور نہ یہ کوئی نا قابلِ مدافعت ضربوں کا طوفان تھا جس نے مجھے تمھاری طرف بہا دیا تھا، میں اب تمھیں یہ بتا سکتا ہوں۔ تم نے دیکھا، میں تمھیں رُلانے کے درپے نہیں ہوں، یہ نہیں ہے کہ میں چاہتا ہوں تمھارا دل بھر آئے۔ یہ مضحکہ خیز حرکت ہوگی۔ میں مانگنے اور گڑگڑانے نہیں آیا ہوں۔ میں تو مطالبہ کرنے آیا ہوں۔ اب آیا تمھاری سمجھ میں؟'' اس نے پوچھا، دوست داری لیکن متانت سے۔

''مطالبہ؟'' میں نے تقریباً نہ سنائی دینے والی آواز میں کہا۔ ''دلچسپ بات ہے۔ کہے جاؤ۔ مطالبہ کرو۔''

''بہت اچھا،'' اس نے کہا۔ ''کوشش کرتا ہوں۔ یہ ایسی چیز نہیں جس میں لکھ سکتا ہوں یا لے کر قانون کے پاس جا سکتا ہوں، ظاہر ہے۔ لیکن دوسری قسم کے قانون بھی ہوتے ہیں۔ تمھیں اس کا احساس نہ ہو، لیکن یہ لمحہ ہے جب تمھیں آگاہ ہو جانا چاہیے کہ اخلاقی قانون کے علاوہ بھی ایک قانون ہے، اتنا ہی واجب، اتنا ہی برحق... کیسے کہوں؟ ایک طرح کی خرد آگاہی ہوتی ہے جس کے متحمل ہونے سے لوگ ہچکچاتے ہیں۔ تمھیں جان لینا چاہیے کہ صرف الفاظ، عہد، اور وعدے ہی نہیں ہوتے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کرتے ہیں، اور نہ یہ احساسات یا ہمدردیاں ہیں جو ان کے تعلق کی حقیقی نوعیت کا تعین کرتی ہیں۔ کوئی اور چیز بھی ہے، ایک قانون جو زیادہ مستحکم، زیادہ سخت ہے، جو بتاتا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے وابستہ ہے یا نہیں ہے... یہ اس قانون کی طرح ہے جو ہم سازش لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ تو یہ قانون تھا جس نے مجھے تم سے منتھی کیا تھا۔ میں اس قانون سے آگاہ تھا۔ بیس سال پہلے بھی آگاہ تھا۔ میں تو تم سے ملتے ہی اس سے آگاہ تھا۔ اب کسرِ نفسی دکھانے کا کوئی مقصد نہیں نکلتا: میرا عقیدہ ہے، ایسھر، کہ ہم دونوں میں میں زیادہ ٹھوس مادے سے بنا ہوں، 'ٹھوس مادہ' اس مفہوم میں نہیں جس میں اخلاقی تربیت کی کتابیں تلقین کرتی ہیں۔ خیر، کچھ بھی سہی، یہ میں ہوں، بدعہد، نا قابلِ اعتبار، بھگوڑا، جو اپنی روح اور ارادے دونوں میں اس قانون سے وفاداری کی زیادہ صلاحیت رکھتا ہے، یہ قانون جس کی تمھیں کتابوں یا قانونی جدولوں میں کہیں ایک رمق بھی نظر نہیں آئے گی لیکن جو اس کے باوجود بالکل سچا قانون ہے۔ اور یہ بہت کٹھن قانون ہے... سنو! زندگی کا قانون یہ ہے کہ جو چیز شروع کی جائے اسے ختم بھی کیا جائے۔ اس سے کسی خاص طور پر

خوشگوار صورت حال کا قائم ہونا ضروری نہیں۔ کوئی چیز جب اس کی توقع کی جائے واقع نہیں ہوتی: ٹھیک جس لمحے آدمی اپنا قیمتی وقت کسی اہم تحفے کو وصول کرنے کی تیاری میں صرف کر چکا ہو، زندگی اسے کچھ بھی نہیں دیتی۔ یہ تاخیریت، یہ بدنظمی، آدمی کو ہمیشہ کے لیے گھائل کر سکتی ہے۔ ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ کوئی ہم سے محض کھیل رہا ہے۔ لیکن پھر ایک دن ہم دیکھتے ہیں ہر چیز ٹھیک ویسی ہی ہے جیسا اسے ہونا چاہیے تھا، نک سک سے درست، قطعی بامحل... یہ لوگوں کے لیے ناممکن ہے کہ جس دن انھیں ملنا ہے اس سے ایک دن پہلے مل جائیں۔ وہ اس وقت ہی ملتے ہیں جب ملنے کے لیے، تیار ہوتے ہیں... یہ ان کی خواہشیں یا من کی موجیں نہیں ہوتیں، جو انھیں ملاتی ہیں، بلکہ کوئی بہت گہری چیز، ستاروں کا کوئی ناقابلِ تردید قانون، جس طرح سیارے بے پایاں زمان و مکاں میں ملتے ہیں، جو مائیکرو سیکنڈ جتنا بے کم و کاست ہوتا ہے، ایک منفرد لمحے میں متصادم ہوتے ہیں، لمحہ جو وسعتِ مکاں میں ایک ارب سال میں آتا ہے۔ میں اتفاقی ملاقاتوں میں ایمان نہیں رکھتا۔ میں ایک ایسا آدمی ہوں جو عورتوں کی اچھی بھلی تعداد سے واقف رہا ہے... مجھے معاف کرنا، لیکن جو بات مجھے تم سے کہنی ہے یہ اس کا ناگزیر حصہ ہے... میں نے حسین عورتوں کو جانا ہے، بلند حوصلہ عورتوں کو بھی، حقیقت یہ ہے کہ میں کئی ایسی عورتوں کو بھی جانتا ہوں جن کی روح آتش نفس عفریتوں سے جلا پاتی تھی؛ میں ایسی سورما عورتوں کو جانتا ہوں جو ایک مرد کی رفاقت میں سائبیریا کی برف سے ریلتی پیلتی گزر سکتی تھیں، غیر معمولی عورتیں، جو میری مدد کر سکتی تھیں اور کچھ دیر کے لیے وجود کی دہشت ناک تنہائی میں میری شریک ہونے کے لیے آمادہ تھیں۔ ہاں، میں ان سب سے واقف رہا ہوں،'' وہ خاموشی سے بولا، جیسے ماضی کی بازخوانی کر رہا ہو، مجھ سے کم، اپنے آپ سے زیادہ۔

''مجھے بڑی مسرت ہے،'' جب وہ رکا تو میں نے اکڑے پن سے کہا، ''اتنی فرحت کہ تم میرے پاس لوٹ آئے ہو اور اپنی آشنا عورتوں کے قصوں سے میری ضیافت کر رہے ہو۔''

لیکن فوراً ہی میں یہ لفظ کہہ کر پچھتائی۔ یہ میرے شایانِ شان نہیں تھے، اور نہ اس بات کے جو لیوش نے ابھی ابھی کہی تھی۔ اس نے سکون سے مجھے دیکھ کر سر ہلایا، جیسے کسی سوچ میں گم ہو۔

''اب میں کیا کر سکتا تھا جبکہ مجھے ہمیشہ تمھارا ہی انتظار رہا؟'' اس نے دریافت کیا، تقریباً گدازی سے۔ بڑے سادہ سے لفظ تھے، اور بڑی نفاست اور انکساری سے ادا کیے گئے تھے۔

Scanned with CamScanner

''میں کیا کرسکتا تھا؟'' اس نے کچھ اور اونچی آواز میں کہا۔ ''اور تم بھی ہماری زندگی کے اِس وقت میں اتنی تاخیر سے کیے گئے اس اعتراف کو لے کر کیا کرسکتی ہو جس میں نہ کوئی معنی ہے اور نہ خوبی؟ آدمی کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہییں۔ لیکن جب حق کی بات ہو رہی ہو تو امر یا نہی کے انداز بے وقعت ہیں۔ دیکھو ایستھر، ایک الوداع بھی اتنی ہی پراسرار اور جذبات انگیز ہو سکتی ہے جتنی پہلی ملاقات... مجھے یہ زمانے سے معلوم رہا ہے۔ کسی ایسے فرد کے پاس دوبارہ ملاقات کے لیے آنا جس سے ہمیں محبت رہی ہو 'جائے واردات پر لوٹ آنے' جیسا نہیں ہوتا، جہاں ایک 'ناقابلِ مزاحمت جبر' ہمیں 'کشاں کشاں' لے آتا ہے، جیسا کہ جاسوسی کہانیوں میں لکھا ہوتا ہے۔ ساری زندگی میں نے صرف تمھیں چاہا ہے، کسی شدید ضرورت کی وجہ سے نہیں، نہ ہی ٹھیک منطق کے قانون کے مطابق... پھر کوئی چیز واقع ہوئی، صرف خطوں والا حادثہ ہی نہیں، وہ خط جو ولما نے چرا لیے۔ حقیقت میں تم نے محبت کا سواگت نہیں کیا۔ تردید مت کرو! کسی کو چاہنا ہی کافی نہیں، ضرورت تو اسے دلیری کے ساتھ چاہنے کی ہے۔ آدمی کو اس طرح چاہنا چاہیے کہ کوئی چور یا منصوبہ یا قانون، چاہے سماوی ہو یا اس دنیا کا، بیچ میں نہ آ سکے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کافی دلیری کے ساتھ نہیں چاہا۔ اور یہ تمھارا قصور ہے، کیونکہ محبت میں مرد کی دلیری کا تصور ہی مضحکہ خیز ہے۔ محبت کو آپ خود بناتے ہیں۔ یہی وہ واحد علاقہ ہے جس میں آپ عظمت حاصل کرتے ہیں۔ اور بس اسی میں، کسی نہ طرح سے، تم کوتاہ نکلیں، اور تمھاری ناکامیابی کے ساتھ ساتھ ہر اور چیز بھی ناکام رہی، ہر وہ چیز جو ہو سکتی تھی، سب کچھ جو فریضہ تھا، مشن تھا، زندگی کا مفہوم تھا۔ یہ درست نہیں ہے کہ مردوں کو اِس یا اُس محبت کا ذمے دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے، دلیری سے محبت کرو۔ لیکن تم نے اس بدترین گناہ کا ارتکاب کیا جو کوئی عورت کر سکتی ہے۔ تم نے سبکی محسوس کی، تم نے فرار اختیار کیا۔ اب تمھیں مجھ پر یقین آیا یا نہیں؟''

''اس سب کا حاصل کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرے یقین، اعتراف یا راضی بہ رضا ہونے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟'' مجھے اپنی آواز اتنی عجیب سنائی دی جیسے میں نے اسے کسی دوسرے کمرے میں اتفاقاً سن لیا ہو۔

''اسی لیے میں آیا ہوں،'' اس نے کہا، اور بھی زیادہ دھیرے سے کیونکہ کمرے میں اندھیرا

چھا گیا تھا اور ہماری آوازیں بلا ارادہ دھیمی پڑ گئی تھیں جیسے ہر چیز — کمرے کی تمام اشیا، سب کچھ جو ہمیں کہنا تھا — روشنی کے ساتھ ساتھ مدھم پڑتا جا رہا ہو۔ ''میں چاہتا تھا کہ تم جان لو؛'' اس نے بات جاری رکھی، ''کہ لوگ کسی چیز کو صرف یہ چاہ کر ختم نہیں کر سکتے کہ وہ ختم ہو جائے، آدمی کسی چیز کو اپنے انجام کو پہنچنے سے پہلے ترک نہیں کر سکتا۔ یہ ناممکن ہے!'' اس نے اعلان کیا، اور طمانیت سے ہنسا۔ میں یہ توقع کر رہی تھی کہ وہ کسی جواری کی طرح مسرت سے ہاتھ ملنے لگا جو اس دریافت پر حیرت زدہ رہ گیا ہو کہ جو بازی وہ حتمی طور پر ہارنے والا تھا، اس نے جیت لی ہے۔ ''تم میری ذات کا ایک حصہ ہو، اس وقت بھی، جب وقت اور فاصلے نے وہ سب کچھ تاراج کر دیا ہے جو کبھی ہماری مشترکہ ملکیت تھا... اب سمجھ میں آیا؟ تم میری زندگی کی ساری وارداتوں کی ذمے دار ہو، جس طرح میں — اپنے طور پر، ایک مرد کے انداز میں — تمھارا ذمے دار ہوں، تمھاری زندگی کا۔ اس دن کا آنا ناگزیر تھا جب تم اس بات کو جان لو۔ تمھیں چاہیے کہ ہمارے ساتھ چلی چلو، ہم سب کے ساتھ۔ ہم نونو کو بھی لیتے چلیں گے۔ سنو، ایستھر، کم از کم اس ایک بار تو میرا یقین کر لو۔ تم سے سوائے سچ کہنے کے مجھے کیا ممکنہ فائدہ پہنچ سکتا ہے، آخری ہلاکت خیز سچ؟... وقت ہر شے کو بھسم کر دیتا ہے، ہر وہ چیز جو ہماری ذات میں جھوٹی ہے۔ جو باقی بچ رہتا ہے وہ سچ ہی ہوتا ہے۔ اور جو باقی بچ رہا ہے وہ یہ ہے کہ تم میرا ہی ایک حصہ ہو، اگرچہ تم بھاگ کھڑی ہوئی تھیں، اگرچہ میں جو تھا وہی تھا، اور ہوں۔ ہاں، مجھے بھی یقین ہے کہ لوگ بدلتے نہیں ہیں۔ تم اس کے باوجود میرا حصہ ہو کہ تم جانتی ہو کہ میں بدلا نہیں ہوں، ویسا ہی ہوں جیسا پہلے تھا، اتنا ہی خطرناک اور ناقابلِ اعتبار۔ تم اس کی تردید نہیں کر سکتیں۔ سر اٹھاؤ، میری آنکھوں میں دیکھو... تم کیوں سر نہیں اٹھاتیں؟ ٹھہرو، میں بتی جلا دیتا ہوں... تمھارے یہاں ابھی تک بجلی نہیں آئی؟... دیکھو، اب یہاں بالکل اندھیرا ہے۔''

وہ دریچے کے پاس گیا، باہر دیکھا، پھر اسے بند کر دیا۔ لیکن اس نے ٹیبل لیمپ روشن نہیں کیا۔ اس کے بجائے اس نے تاریکی میں مجھ سے بات کی۔

''تم میری طرف کیوں نہیں دیکھتیں؟'' اس نے پوچھا۔

اور جب میں نے جواب نہیں دیا، وہ اندھیرے میں ہی بولے گیا، اب اس کی آواز اور دور سے آ رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

''اگر تم واقعی اتنے حتمی طور پر قائل ہو تو مجھے کیوں نہیں دیکھتیں؟ میرا تم پر کسی قسم کا زور نہیں چلتا۔ میرے کوئی حقوق نہیں۔ تاہم تم میرے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔ تم مجھے جو الزام بھی چاہو دے سکتی ہو، لیکن یہ ضرور جان لو کہ دنیا میں صرف تمھارے سامنے ہی میں معصوم ہوں۔ اور ایک ایسا دن بھی آیا، اور یہ میں تھا جو لوٹ آیا۔ کیا تم اب بھی 'انا' جیسے لفظوں میں یقین رکھتی ہو؟ ان لوگوں کے درمیان جو تقدیر کے ہاتھوں ایک دوسرے سے بندھے ہوں، کوئی انا نہیں ہوتی۔ تم ہمارے ساتھ چلو گی۔ ہم سب انتظام کر لیں گے۔ کیا ہو گا؟ ہم زندہ رہیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ زندگی ہمارے لیے اب بھی کچھ رکھتی ہو۔ ہم خاموش زندگی گزاریں گے۔ دنیا میری بابت سب کچھ بھول بھال گئی ہے۔ تم وہاں میرے ساتھ رہو گی، ہمارے ساتھ۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں،'' اس نے بلند آواز میں کہا، دق آ کر، جیسے بالآخر کوئی بات اس کی سمجھ، اس کی گرفت میں آ گئی ہو، کوئی بات جو اتنی سیدھی سادی، اتنے چندھیا دینے والے طور پر ظاہر ہو کہ اس پر بحث کرنا اسے برہم کر دیتا ہو۔ ''میں تم سے سوائے اس کے کچھ اور نہیں چاہتا کہ صرف اس بار، اپنی زندگی میں آخری بار، تم اس قانون کی تعمیل کرو جو تمھاری زندگی کا مفہوم اور اس کا مشمول ہے۔''

اب اندھیرا اتنا بڑھ گیا تھا کہ مجھے اور دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''تمھاری سمجھ میں آتا ہے؟'' اس نے پوچھا، اس کی آواز دھیمی تھی، مجھے تک بڑے فاصلے سے پہنچ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ماضی سے مجھ سے بات کر رہا تھا۔

''ہاں،'' میں نے غیر اختیاری طور پر کہا، تقریباً بے خودی سے۔

وہ عجیب سی بے حسی اس لمحے شروع ہوئی، ایسی ہی بے حسی جو نیند میں چلنے والے اپنی پُر خطر راہ پر گامزن ہوتے وقت محسوس کرتے ہوں گے؛ میرے آس پاس جو ہو رہا تھا میں اسے سمجھ رہی تھی، میں جو کچھ کر اور کہہ رہی تھی اس سے پوری طرح آگاہ تھی، مجھے لوگ صاف صاف نظر آ رہے تھے، اور ان کی روحوں کے وہ حصے بھی جن کے اوپر طور طریق اور رسم و رواج پردہ ڈال دیتے ہیں؛ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی جانتی تھی کہ جو کچھ باہوشی اور پختہ ارادے سے کر رہی تھی وہ کسی نہ کسی حد تک غیر شعوری بھی تھا، کچھ کچھ ایک خواب جیسا۔ میں آسودہ خاطر تھی، تقریباً شگفتہ مزاج۔ میں خود کو ہلکا محسوس کر رہی تھی، قطعی بے فکر۔ لیوش نے جو کچھ کہا اس میں واقعی کوئی بات تھی جو میں اس لمحے سمجھ گئی، کوئی چیز جو زیادہ

قوی تھی، زیادہ معقول، کسی اور چیز سے زیادہ اپنے کو منوا لینے والی، کوئی چیز جو مجھ پر اس کے الزام سے سے بالا اور ماوراتھی۔ ظاہر ہے، مجھے اس کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آیا تھا، لیکن مجھے اپنی بے اعتقادی پُرتفنن معلوم ہوئی۔ جب وہ بول رہا تھا تو میں ایک بات سمجھ گئی، سیدھی سادی، دلاسا دینے والی صداقت، جسے الفاظ میں ادا کرنا میرے لیے ناممکن ہوتا۔ وہ پھر جھوٹ بول رہا تھا، ظاہر ہے... میں ٹھیک سے نہیں جانتی تھی، کس کس طرح اور کس اعتبار سے، لیکن وہ جھوٹ ضرور بول رہا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے لفظ اور احساسات جھوٹ نہ بول رہے ہوں، ہوسکتا ہے، اس کا وجود بذاتہٖ جھوٹ بول رہا ہو، یہ امرِ واقعہ کہ وہ، لیوش، اس کے علاوہ اور کچھ کرہی نہ سکتا ہو، نہ پہلے اور نہ اب۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں ہنس رہی ہوں؛ میں بے اختیار ہنس پڑی تھی، لیکن یہ ایک تمسخرانہ خندہ زنی نہیں تھی بلکہ مخلصانہ اور خوشگوار ہنسی تھی۔ لیوش سمجھا نہیں کہ میں ہنس کیوں رہی ہوں۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟" اس نے شک سے لہا۔

"کچھ نہیں،" میں نے کہا۔ "براہ کرم تم اپنی بات کیے جاؤ۔"

"تو تمھیں اتفاق ہے؟"

"ہاں،" میں نے کہا۔ "کس بات سے؟ نہیں، ظاہر ہے، میں اتفاق کرتی ہوں،" میں نے تیزی سے اضافہ کر دیا۔

"خوب،" وہ بولا۔ "اس صورت میں... اب دیکھو، ایسھر، تم یہ خیال دل میں نہ لانا کہ کوئی تمھارے خلاف ہے یا تمھیں تکلیف پہنچانا چاہتا ہے۔ ہمیں اپنے معاملات جس قدر سادگی اور ایمانداری سے ممکن ہو سکے نمٹانے ہیں۔ تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔ نونو بھی... شاید فوراً تو نہیں... ذرا بعد میں۔ ایوا شادی کر لے گی۔ ہمیں اس کو نجات دلانی ہی ہوگی۔" اس نے اور زیادہ دھیرے سے کہا، یوں جیسے ہم ساز باز کر رہے ہوں۔ "اور مجھے بھی... یہ تم ابھی نہیں سمجھو گی... لیکن کیا تم مجھ پر بھروسا کرتی ہو؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا، اس کی آواز آہستہ تھی۔

"بولے جاؤ،" میں نے جواب میں کہا، اتنی ہی آہستگی سے، جیسے سازشی فضا میں شامل ہو رہی ہوں۔ "ہاں بالکل، میں تم پر بھروسا کرتی ہوں۔"

"یہ سب سے زیادہ اہم ہے،" وہ اطمینان سے بڑبڑایا۔ "یہ خیال مت کرنا،" اس نے ذرا

Scanned with CamScanner

اونچی آواز میں اضافہ کیا، ''کہ میں تمھارے اعتماد کو ٹھیس پہنچاؤں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم جھٹ پٹ کوئی فیصلہ کرو۔ یہاں صرف ہم دو ہی ہیں۔ میں جا کر اینڈرے کو بلا لاتا ہوں۔ وہ خاندانی دوست ہے، ایک نوٹری پبلک، اور سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے۔ تم اس کی موجودگی میں دستخط کرنا،'' اس نے ہاتھ کی بڑی کشادہ حرکت کے ساتھ اعلان کیا۔

''دستخط، کس پر؟'' میں نے اسی سازشی انداز میں اس سے پوچھا، جیسے کسی کام کی ہامی بھر لی ہو اور خود کو رضا کارانہ طور پر اس کے لیے پیش کر دیا ہو اور اب صرف اس کی تفصیلات کا پوچھ رہی ہوں۔

''کاغذ کے اس پرزے پر،'' وہ بولا۔ ''اس معاہدے پر جو ہمیں یہ اختیار دیتا ہے کہ ہر چیز کا انتظام کریں اور تمھیں اپنے ساتھ رہنے لے جائیں۔''

''تمھارے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ،'' وہ بے چینی سے بولا۔ ''ہمارے ساتھ... ہمارے قریب۔''

''ذرا ٹھہرو،'' میں نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ تم اینڈرے کو بلاؤ... اس سے پہلے کہ میں دستخط کروں... ایک معاملے کی میرے لیے وضاحت کر دو۔ تم چاہتے ہو کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تمھارے ساتھ چل پڑوں۔ اتنا تو میں سمجھتی ہوں۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ میں تمھارے قریب، کہاں رہوں گی؟''

''ہمارا خیال تھا،'' اس نے آہستگی سے کہا، معاملے کو اپنے ذہن میں گھما پھرا کر جیسے یہ بالکل حسبِ حال بات ہو، ''کہ یہ کہیں ہمارے نزدیک ہی ہوگا۔ بدقسمتی سے ہمارا اپارٹمنٹ موزوں جگہ نہیں ہے... لیکن قریب ہی ایک مقام ہے جہاں ایک خاص حیثیت کی تنہا خواتین... یہ بہت قریب ہی ہے۔ اور ہم ایک دوسرے سے اکثر مل سکیں گے،'' اس نے بڑی فیاضی سے اضافہ کیا، یوں جیسے میری ہمت افزائی کرنا چاہتا ہو۔

''یعنی ایک طرح کا ورک ہاؤس؟'' میں نے پوچھا، پورے اطمینان کے ساتھ۔

''ورک ہاؤس؟'' اس نے زخمی لہجے میں کہا۔ ''کیا عجیب خیال ہے! میں نے 'گھر' کہا تھا، اچھی تربیت یافتہ خواتین کے ساتھ۔ تم اور نونو جیسے لوگ۔''

''مجھ اور نونو جیسے...'' میں نے کہا۔

وہ کچھ اور دیر تک انتظار کرتا رہا۔ پھر میز کی طرف گیا، ایک ماچس ڈھونڈ نکالی، اور ٹیبل لیمپ کو بڑی ان گھڑ، غیر مشاق جنبشوں کے ساتھ روشن کر دیا۔

''اس پر غور کرلو،'' وہ بولا۔ ''ایستھر، غور کرلو۔ میں اینڈرے کو اندر بھیج دوں گا۔ خوب غور کرلو۔ اور دستخط کرنے سے پہلے معاہدے کو پڑھ لینا۔ بڑے غور سے پڑھنا۔''

اس نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکالا اور انکساری سے میز پر رکھ دیا۔ اس نے ایک بار اور مجھے دوستانہ اور ہمت افزا مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا، خفیف سا جھکا، اور کسی نوجوان کی سی زندہ دلانہ پھرتی سے مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔

19

جب چند منٹوں بعد اینڈرے داخل ہوا تو اس وقت تک میں معاہدے پر دستخط کر چکی تھی جس کی رو سے لیوش کو مکان اور باغ بیچ دینے کا اختیار مل گیا۔ یہ ایک باضابطہ معاہدہ تھا، قانونی اصطلاحوں سے پُر، اور سارا متن پیشہ ورانہ قسم کے فقروں سے بنا تھا، ٹھیک وصیت ناموں اور شادی کے معاہدوں کی طرح۔ لیوش نے اسے ''دو فریقوں کے مابین معاہدہ'' کا عنوان دیا تھا۔ ایک فریق میں تھی، دوسرا لیوش، جو مکان اور باغ دونوں پر مشتمل جائیداد کے تصرف کے حق کے بدلے میں نونو اور میری دیکھ بھال کا پابند تھا۔ ''دیکھ بھال'' کی تفصیل کی شرح نہیں کی گئی تھی۔

''لیوش نے مجھے سب بتا دیا ہے،'' جب ہم گول میز کے گرد روبرو بیٹھ گئے تو اینڈرے نے کہا۔ ''ایستھر، میرا فرض ہے کہ تمھیں خبردار کر دوں کہ لیوش ایک پرلے درجے کا بدمعاش ہے۔''

''ہاں،'' میں نے کہا۔

''تمھیں متنبہ کر دینا میرا فرض ہے کہ معاہدے کی شرائط اور مقاصد جو اس نے اچانک تمھارے سر تھوپ دیے ہیں، خطرناک ہیں اور اگر وہ ان کی حرف بہ حرف تعمیل کرے تب بھی خطرناک ہی رہیں گے۔ عزیز ایستھر، مکان اور باغ کے طفیل تم دونوں کا یہاں درمیانہ درجے کا لیکن مستحکم گزارہ ہوتا رہا ہے، اور لیوش کے منصوبے، کم از کم ایک اجنبی کو بھی، قدرے جذباتی معلوم ہوں گے۔ باقی رہا

میں، تو مجھے اس کے جذبات پر کوئی بھروسا نہیں ہے۔ میں اس سے واقف رہا ہوں، اور اچھی طرح واقف رہا ہوں، پچیس سال سے۔ لیوش اس قسم کا آدمی ہے، اس قسم کا کردار ہے جو بدل نہیں سکتا۔''

''ٹھیک ہے،'' میں نے کہا۔ ''وہ خود کہتا ہے کہ نہیں بدل سکتا۔''

''وہ بھی یہ کہتا ہے؟'' اینڈرے نے پوچھا۔ اس نے اپنا چشمہ اتار کر اپنی کم بین آنکھوں سے میری طرف دیکھا، انھیں تیزی سے جھپکاتے ہوئے، چکرایا ہوا سا۔ ''اس سے غرض نہیں کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کیا وہ اس وقت اخلاص سے کام لے رہا تھا؟ پورے پورے اخلاص سے؟ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیوش سے میری کئی بار مخلصانہ ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ بیس سال پہلے، اگر تمھیں یاد رہا ہو، ایستھر ... بیس سال تک میں نے زبان بند رکھی ہے۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ تمھیں بتا دوں — بیس سال پہلے جب بوڑھے گابور، تمھارے والد، عزیز ایستھر ... معاف کرنا، وہ اچھے دوست تھے، سچ مچ بہت اچھے دوست... گویا، بیس سال پہلے جب تمھارے والد کا انتقال ہوا اور ان کی جائیداد کے معاملے کو یکسو کرنے کی افسوسناک ذمے داری مجھ پر ان کا دوست اور مقامی وکیل ہونے کی حیثیت سے عائد ہوئی، تو یہ کھلا کہ بعض ہبی نامے لیوش نے بڑے میاں کے نام سے جعلی طور پر بنائے ہوئے تھے۔ کیا تم اس کے بارے میں جانتی تھیں؟''

''یوں ہی دھندلا سا پتا تھا،'' میں نے کہا۔ ''کچھ باتیں ہو رہی تھیں۔ لیکن کچھ ثابت وابت نہیں ہوا تھا۔''

''لیکن بات یہ ہے کہ ثابت ہو سکتا تھا،'' اس نے کہا اور چشمے کے شیشے صاف کیے۔ میں نے پہلے کبھی اسے اتنا چکرایا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ ''یہ ثابت کرنے کی دستاویزی شہادت موجود تھی کہ وہ ہبی نامے لیوش نے جعلی بنائے تھے۔ اگر ہم لوگوں نے اس کا ٹھیک سے خیال نہ رکھا ہوتا تو، عزیز ایستھر، یہ مکان اور یہ باغ آج تمھارے نہ ہوتے۔ اب میں تمھیں بتا سکتا ہوں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا... بس اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ مجھے لیوش کے ساتھ ایک 'مخلصانہ' گفت وشنید برداشت کرنی پڑی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، کیونکہ یہ ایسا منظر نہیں تھا جسے انسان آسانی سے بھول جائے۔ میں دوبارہ کہتا ہوں: لیوش پرلے درجے کا بدمعاش ہے۔ تم سب لوگوں میں ایک میں ہی تھا جو اس کے طلسم میں آ کر نہ دیا۔ وہ یہ جانتا ہے، خوب جانتا ہے... وہ مجھ سے خائف ہے۔ اور اب، جب وہ تم پر ناگہانی نازل

ہوا ہے اور تمھارا جو کچھ بھی باقی بچ رہا ہے اس پر، کم وبیش، ڈاکا ڈالنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، اس واجبی، ننھے سے جزیرے کے تباہ ور اندہ باسیوں کے سکون واطمینان پر ڈاکا ڈالنے پر تلا ہوا ہے، تو یہ میرا فرض ہے کہ تمھیں حقیقت حال سے مطلع کردوں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اب لیوش اپنا کام ذرا زیادہ احتیاط سے کرتا ہے۔ اب وہ ہنڈیاں استعمال نہیں کرتا۔ لگتا ہے وہ کسی جال میں پھنس گیا ہے اور کوئی حربہ تلاش نہیں کرسکا، سوائے اس کے کہ یہاں تم لوگوں سے خدا حافظ کہنے کے بہانے آئے اور تمھارے پاس جو کچھ بھی باقی بچ رہا ہے اسے ہتھیا کر چلتا بنے... اگر تم مکان اور باغ اس کے حوالے کرنا ہی چاہتی ہو تو میں سرکاری طور پر تمھارے لیے کچھ بھی نہیں کرسکوں گا، ویسے کوئی اور بھی کچھ نہیں کرسکے گا، صرف میں ہی کرسکتا ہوں... یعنی، اگر تم چاہو تو۔"

"اینڈرے، تم کیا کرسکتے ہو؟" میں نے دنگ ہو کر پوچھا۔

اس نے سر جھکا کر اپنے بٹن لگے جوتوں کو گھورا۔

"میں..." اس نے بولنا شروع کیا، صاف طور پر گھبراہٹ اور ہچکچاہٹ سے۔ "تمھیں جان لینا چاہیے کہ اُس موقعے پر میں نے حماقت کی اور لیوش کو بچا لیا۔ میں نے اسے جیل جانے سے بچا لیا تھا۔ کیسے؟ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ بل بہر حال چکانے تھے تاکہ تم گھر میں رہ سکو... دراصل یہ لیوش نہیں تھا جسے میں بچانا چاہتا تھا۔ اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ بل چکا دیے گئے۔ اور تم یہیں امن و سکون کے ساتھ رہتی رہیں۔ میں نے لیوش کو آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن بل، جرم کی ساری شہادت، میں نے سنبھال کر رکھ لی۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے، شہادت اب موثر نہیں رہی۔ لیکن لیوش جانتا ہے کہ اگرچہ وہ قانون کی دسترس سے بچ نکلا ہے، لیکن شہادت ابھی تک میرے قبضے میں ہے۔ میں تم سے استدعا کرتا ہوں ایستھر،" اس نے تقریباً جذباتی انداز میں کہا، اور اٹھ کھڑا ہوا، "مجھے لیوش سے بات کرنے کا اختیار دے دو، کہ میں اسے یہ... کاغذ کا یہ ٹکڑا واپس کردوں... اور اس کے ساتھیوں کو ان کے راستے پر چلتا کروں۔ اگر میں اصرار کروں گا تو وہ چلے جائیں گے۔ یقین کرو،" اس نے اطمینان سے کہا۔

"مجھے تم پر یقین ہے،" میں نے کہا۔

"تو اس صورت میں..." اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور حرکت کرنے کو ہوا۔

Scanned with CamScanner

''میں تمھارا یقین کرتی ہوں،'' میں نے جلدی سے کہا، اس طرح جیسے گلے میں کوئی چیز پھنس رہی ہو۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ اینڈرے کی فہم سے ماورا ہوگا، کہ وہ کبھی اس پر قائل نہیں ہوگا، واقعی کبھی گرفت میں نہیں لا سکے گا۔ ''اور میں تمھاری بے حد ممنون ہوں... صرف اب آ کر میری سمجھ میں آیا ہے، اور میں اس قابل نہیں کہ تمھارا شکریہ ادا کر سکوں۔ لیکن کیا اس کا مطلب ہے کہ ہر چیز، والد کے انتقال کے بعد جو چیز بھی باقی رہی ہے، صرف تمھارے طفیل ہی ہماری ہے، پیارے اینڈرے؟ اگر تمھاری مدد شامل حال نہ ہوتی، بیس سال قبل... تو نہ مکان باقی بچتا، نہ باغ، کچھ بھی نہیں؟ اور ہر چیز مختلف ہو جاتی... میری زندگی سمیت... مجھے کہیں اور رہنا پڑا ہوتا، کسی ان جانی جگہ... کیا ایسا ہی ہے؟''

''پوری طرح تو نہیں،'' اس نے پشیمانی سے کہا۔ ''اکیلا میں ہی نہیں تھا... شاید اب میں واقعی تمھیں بتا سکتا ہوں۔ تمبور نے پہلے مجھے اس کا ذکر کرنے سے منع کر دیا تھا۔ اس نے بھی مدد کی تھی۔ بوڑھے گابور کے دیرینہ رفیق کی حیثیت سے وہ خوشی خوشی اور شوق سے مدد کرنا چاہتا تھا۔ ہم سب اس میں شریک تھے...'' اس نے واضح تکلیف کے ساتھ، بڑی آہستگی سے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

''اوہ، تمبور!'' میں نے کہا، اور گھبرائی ہوئی ہنسی ہنسی۔ ''اچھا، تو یہ اس طرح ہوا۔ آدمی لاعلمی میں زندہ رہتا ہے، اس سے بے خبر کہ اس کے ساتھ کوئی بری، یہ نہیں کہ کوئی بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ اس کا ٹھیک طرح سے شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ اور بھی زیادہ مشکل ہے...''

''کہ لیوش کو چلتا کیا جائے؟'' اس نے گمبھیر پڑتے ہوئے کہا۔

''کہ لیوش کو چلتا کیا جائے،'' میں نے میکانکی انداز میں دہرایا۔ ''ہاں، ایسا کرنا اب بہت دشوار ہوگا۔ ظاہر ہے، وہ اپنے بچوں اور ان دوسرے لوگوں کے ساتھ فوراً واپس جانے ہی والا ہے۔ وہ جلد روانہ ہو جائیں گے، کیونکہ وہ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتے ہیں۔ لیکن مکان اور باغ ...ہاں، یہ سب میں نے اسے دے دیا ہے۔ میں نے کاغذ کے اس پرزے پر دستخط کر دیے ہیں... اور میں تم سے گزارش کرتی ہوں کہ اس سے بات کرو اور اسے نونو کی خبر گیری کرنے پر راضی کر لو۔ کم از کم اس ایک بات کا وعدہ اسے ضرور کرنا ہوگا۔ تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو، ظاہر ہے، اس کے وعدوں کی کوئی وقعت نہیں، سو اس کا انتظام باضابطہ قانونی طور پر کرنا ہوگا، کسی سرکاری معاہدے کے ذریعے، لیکن ایسا معاہدہ جو نافذ بھی ہو سکے... اسے فروخت کی قیمت کا کچھ حصہ نونو کے واسطے محفوظ

رکھنا ہوگا۔ اب اسے بہت زیادہ کی حاجت نہیں ہوگی، بیچاری۔ یہ ہوسکتا ہے؟''

''ہاں،'' اس نے کہا۔ ''ہم یہ سب کر سکتے ہیں۔ لیکن تمھارا کیا ہوگا، ایسطھر؟''

''بالکل۔ میرا کیا ہوگا؟ یہی تو ساری بات ہے،'' میں نے کہا۔ ''لیوش نے تجویز کیا تھا کہ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں اس سے قریب آ بسوں... بالکل اس کے ساتھ نہیں... وہ اس کی تفصیلات میں نہیں گیا۔ لیکن یہ اہم بات نہیں ہے،'' میں نے جلدی سے کہا، یہ دیکھ کر کہ اینڈرے کی بھنویں چڑھ گئی ہیں اور ہاتھ اٹھ رہا ہے جیسے میری بات کاٹنا چاہتا ہو۔ ''میں تم سے اس کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں، اینڈرے، تم سے اور تیبور سے، اور لاتسی سے بھی، تم سبھوں سے جو ہمارے ساتھ اتنی مہربانی سے پیش آئے ہو... نونو سے وضاحت کی ضرورت نہیں... شاید وہی ایک ہے جسے معلوم ہے کہ آج ہر چیز کو ٹھیک اسی طرح انجام پانا چاہیے جس طرح بیس سال پہلے۔ میرا خیال ہے وہ سمجھ جائے گی۔ میرا خیال ہے صرف ایک عورت ہی یہ سمجھ سکتی ہے، ایسی عورت جو اب جوان نہیں رہی اور جو زندگی سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھتی... نونو جیسی عورت، مجھ جیسی عورت۔''

''میری سمجھ میں نہیں آیا،'' وہ بے اطمینانی سے بڑبڑایا۔

''اور میں چاہتی بھی نہیں کہ تم سمجھو،'' میں نے کہا اور اس کے ہاتھ کو تھامنا یا اس کے سفید ریش چہرے کو اپنی انگلیوں کے سروں سے چھونا چاہا ہوتا، اس سوگوار، دانشمند، مرد چہرے کو، ایک آدمی کا چہرہ۔ میں اس آدمی کو چھونا چاہتی تھی جس نے کبھی اپنے کو مجھ پر مسلط نہیں کیا تھا لیکن بیس سالہ شریفانہ، باعزت، مہربان زندگی کے لیے جس کا شکریہ مجھ پر واجب تھا۔

''تم ایک سچے انسان ہو، اینڈرے، ایک شاندار، سچے آدمی، اور اسی لیے ہمیشہ عقلی طور پر سوچنے پر مجبور ہو، جس کی قانون یا رواج یا خرد بڑی دانشمندانہ ہدایت کرتی ہے۔ لیکن ہم، ہم عورتیں اس طور پر دانشمند اور استدلالی نہیں ہوسکتیں... ہاں، اب میں سمجھتی ہوں کہ یہ ہمارا سرد کار نہیں۔ اگر بیس سال قبل میں واقعی دانشمند اور ایماندار ہوتی تو لیوش کے ساتھ، اپنی بہن کے منگیتر کے ساتھ، یہاں سے کہیں بھاگ گئی ہوتی، لیوش جو فریبی ہے، ایک پکا دروغ گو، انسانی غلاظت کا ٹکڑا، جس طرح نونو، جو اپنی بات کو زوردار لفظوں میں ادا کرنا پسند کرتی ہے، کہے گی۔ تو مجھے یہی کرنا چاہیے تھا، اگر بیس سال پہلے میں دلیر اور عقلمند اور دیانتدار ہوتی... اس صورت میں میری قسمت کا کیا حال ہوتا؟ یہ میں نہیں جانتی۔ وہ

Scanned with CamScanner

خوشگوار یا شگفتہ ہوتی، اس میں مجھے شک ہے۔ لیکن کم از کم میں نے ایک قانون کی تعمیل کی ہوتی اور ایک فرض انجام دیا ہوتا جو عقل کے اور عام طور پر دنیا کے قوانین سے زیادہ مستحکم ہے... اب آیا تمھاری سمجھ میں؟ چونکہ میری سمجھ میں آ گیا ہے... میں اس حد تک اسے سمجھ گئی ہوں کہ میں لیوش اور ایوا کو مکان دیے دے رہی ہوں کیونکہ یہ مجھ پر ان کا قرض ہے... اور اس کے بعد... جو ہوگا سو ہوگا۔"

"تم یہاں سے چلی جاؤ گی؟" اس نے آہستہ سے پوچھا۔

"مجھے معلوم نہیں،" میں نے یکدم خود کو نڈھال محسوس کر کے کہا۔ "میرا کیا بنے گا، اس کی بابت میں نے غور نہیں کیا ہے۔ بہرکیف، میں تم سے گزارش کرتی ہوں کہ کاغذ کا یہ ٹکڑا لیوش کو دے دو — بالکل، میں نے اس پر دستخط کر دیے ہیں۔ اور، اینڈرے، میں چاہتی ہوں کہ تم اس میں ایک پکی اور لازمی شرط کا اضافہ کر دو کہ نونو کے حصے میں آنے والی حقیری سی رقم کسی قیمت پر لیوش کے ہاتھوں نہیں لگے گی۔ وعدہ کرتے ہو؟"

اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے دو انگلیوں سے معاہدہ اٹھایا، یوں جیسے کہ کوئی غلیظ سی مشتبہ شے ہو۔

"اچھا، ٹھیک ہے،" اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بالکل، مجھے اس کی بابت کچھ معلوم نہیں تھا۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا لیکن پھر فوراً ہی چھوڑ دیا۔

"مجھے معاف کرنا،" میں نے کہا، "لیکن بیس سال میں کسی نے کبھی پوچھا ہی نہیں۔ نہ تم نے، نہ تیبور نے — ہوسکتا ہے خود مجھے کم یقین رہا ہو، اینڈرے، آج کے مقابلے میں اتنا کم تلخ یقین کہ لیوش یہ کہنے میں بجا تھا کہ زندگی میں ایک نوع کا غیر مرئی نظام ہوتا ہے اور جو کچھ آپ نے ایک دفعہ شروع کیا ہو اسے ختم بھی کرنا لازمی ہے — جیسے بھی، اور جب بھی... خیر، اب سب طے ہو ہی چکا ہے،" میں نے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

"ہاں،" اس نے کہا، ہاتھ میں کاغذ تھامے، سر جھکائے۔ "شاید اب یہ کہنا فالتو بات ہے، لیکن اگر تم اس پر پچھتاوا محسوس کرو... اب یا آئندہ کبھی... تو ہم ہمیشہ حاضر ہیں، تیبور اور میں۔"

"واقعی یہ فالتو بات ہے،" میں نے کہا اور مسکرانے کی کوشش کی۔

Scanned with CamScanner

20

نصف شب کے قریب مجھے نونو کے قدموں کی آہٹ سنائی دی؛ وہ آہستہ آہستہ چرچراتے بوسیدہ چوبی زینے پر چڑھ رہی تھی، ہر تیسری سیڑھی پر کھانسنے کے لیے رکتی ہوئی۔ میرے کمرے کی دہلیز پر آکر وہ رک گئی، جس طرح پچھلی رات رکی تھی، ٹمٹماتی موم بتی ہاتھوں میں لیے، اپنے دن والے کپڑے پہنے ہوئے، وہی سیاہ رنگ کا واحد تقریباتی ڈریس جسے تن سے جدا کرنے کی اسے ابھی تک مہلت نہیں ملی تھی۔

''تم ابھی تک سوئیں نہیں؟'' اس نے پوچھا، اور بستر پر میرے برابر بیٹھ گئی، اور باقی ماندہ موم بتی کو پلنگ کے پہلو کی میز پر رکھ دیا۔

''معلوم ہے، وہ لوگ مربہ بھی لے گئے ہیں؟''

''ارے نہیں!'' میں نے کہا۔ میں لیٹنے سے اٹھ کر سیدھی بیٹھ گئی اور ہنسنے لگی۔

''سب نہیں، بس آڑو کا،'' اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''پورے کے پورے بیس جار۔ ایوا نے مانگے تھے۔ وہ پھول بھی بٹور لے گئے ہیں، باغ میں جتنے ڈالیا کے پھول بچ رہے تھے۔ خیر، اگلے ہفتے کے آتے آتے وہ مرجھا ہی گئے ہوتے۔''

''پھول کس نے لیے؟'' میں نے پوچھا۔

''عورت نے۔''

وہ کھانسی، ہاتھ باندھے، اور بالکل سیدھی تن کر بیٹھ گئی، اتنی ہی پرسکون اور خود مکتفی جتنی ساری زندگی رہی تھی، چاہے صورت حال کچھ بھی ہو۔ میں نے اس کا ہڈیالا ہاتھ تھام لیا جو نہ گرم تھا نہ سرد۔

''نونو، وہ جو چاہیں لے جائیں،'' میں نے کہا۔

''بالکل،'' اس نے اتفاق کیا۔ ''لے جائیں، میری بچی۔ اگر کوئی اور چارہ نہ ہو۔''

''میں کھانے کے وقت نیچے نہ آ سکی،'' میں نے سہارے کی خاطر اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''برا نہ ماننا۔ کیا وہ حیران نہیں ہوئے؟''

''نہیں، وہ بس چپ تھے۔ میرے خیال میں تو حیران نہیں تھے۔''

ہم دونوں نے ڈانواڈول موم بتی کی طرف دیکھا۔

''نونو، ڈارلنگ،'' میں نے اس سے کہا۔ ''مہربانی سے کھڑکیاں بند کردو۔ اور وہاں، سائیڈ بورڈ پر، تمھیں تین خط نظر آئیں گے۔ وہ مجھے لاکر نہ دے دوگی، پیاری؟''

وہ آہستہ قدم کمرے کے پار گئی، دیوار پر اس کا سایہ بہت بڑا پڑ رہا تھا۔ اس نے کھڑکیاں بند کیں اور خط لاکر مجھے دے دیے۔ پھر مجھے اچھی طرح سے ڈھانک دیا اور دوبارہ میرے برابر بیٹھ گئی، ہاتھ باندھے، تقریباتی ڈریس پہنے، ذرا رسمی سی طریقے پر، جیسے کسی مخصوص بے تکے موقع میں شامل ہو رہی ہو، ایسا موقع جو کسی دوسرے موقعے جیسا نہیں تھا، ایسا جو نہ شادی کا تھا نہ تجہیز و تکفین کا۔ وہ بیٹھی میری بات سنتی رہی۔

''نونو، کچھ سمجھ میں آیا تمھاری؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میری بچی، میں سمجھتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں،'' وہ بولی اور اپنی بانہیں میرے گرد ڈال دیں۔

سو ہم بیٹھے موم بتی کے خاتمے کا انتظار کرتے رہے یا شاید ہوا کا زور ٹوٹنے کا، وہ ہوا جو نصف شب سے ہمارے گھر کے گرد سسک رہی تھی، درختوں کی گرد آلود شاخوں کو توڑے دے رہی تھی، صبح کے انتظار میں شاید۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ ہم کس چیز کا انتظار کر رہے تھے۔ میں کپکپائی۔

''تم تھکی ہوئی ہو،'' اس نے کہا اور مجھے اچھی طرح ڈھانپ دیا۔

''ہاں،'' میں نے کہا۔ ''بہت تھکی ہوئی ہوں۔ یہ بساط سے زیادہ تھا، تم جانتی ہو۔ میں سونا چاہتی ہوں۔ پیاری نونو، کیا تم مہربانی کر کے وہ خط مجھے پڑھ کر سنا سکتی ہو؟''

اس نے اپنے پیش بند کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اپنا تاروں کے فریم والا چشمہ ٹٹول کر نکالا اور بڑے غور سے خطوں کا مطالعہ کرنے لگی۔

''انھیں لیوش نے لکھا ہے،'' وہ بولی۔

''تم اس کی لکھائی پہچانتی ہو؟''

''ہاں۔ کیا یہ ابھی ملے ہیں؟''

''بالکل ابھی۔''

اس نے کب لکھے تھے؟''

''بیس سال پہلے۔''

''یہ ڈاک کا قصور ہے کہ اب مل رہے ہیں؟...''اس نے پوچھا، کچھ تجسس، کچھ رقابت سے۔

''نہیں، ڈاک کا نہیں!''میں مسکرا دی۔

''کس کا قصور تھا؟''

''ولما کا۔''

''اس نے چرا لیے تھے؟''

''ہاں، اس نے چرا لیے تھے۔''

''سمجھی،'' وہ بولی اور آہ بھری۔''خدا اسے سکون دے۔ وہ مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔''

اس نے چشمے کو ناک پر ٹھیک سے جمایا، لو کی طرف جھکی، اور ان میں سے ایک خط کو یوں پڑھنے لگی جیسے واپس اسکول پہنچ گئی ہو، آہستہ آہستہ، مترنم آواز میں۔

''میری واحد اور صرف واحد ڈارلنگ،'' اس نے پڑھا،''زندگی ہمارے ساتھ غیر معمولی چالیں چل رہی ہے۔ مجھے اگر کوئی امید رہ گئی ہے تو یہی کہ میں نے تمھیں ہمیشہ کے لیے پالیا ہوتا...''

اس نے پڑھنا بند کر دیا، چشمے کو دھکیل کر پیشانی پر چڑھا دیا، اور میری طرف چمکتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا، جیسے متاثر اور سحر زدہ ہو گئی ہو۔

''اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے شاندار خط لکھ سکتا ہے!''

''ہاں،''میں نے اتفاق کیا۔''پڑھے جاؤ۔ وہ بڑے اچھے خط لکھتا تھا۔''

لیکن ہوا، ستمبر کے آخر کی ہوا، جواب تک گھر کی دیواروں سے سر پٹخ رہی تھی، دھڑ سے کھڑکیاں کھول کر در آئی، پردوں کو لہرایا، اور، جیسے کوئی خبر لیے آ رہی ہو، کمرے کی ہر شے کو چھوا اور اپنی جگہ سے کھسکا دیا۔ پھر اس نے موم بتی کی لو گل کر دی۔ یہ مجھے ابھی تک یاد ہے، اور یہ بھی، اگرچہ دھندلا دھندلا سا، کہ کسی وقت تو تو نے کھڑکیاں بند کر دیں، اور میں سو گئی۔

❊❊

اینا کیون

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

گمشدہ چیزوں کے درمیان

نئے عظیم اور الوہی ستارے جیسا کوئی نہیں۔ صرف اسی میں وہ شان، وہ خدائی طاقت ہے جو زندگی کی نئی قسموں کو وجود میں لا سکتی ہے، اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتی ہے۔ وہ وسط سرما کے آفتابی تحول کے موقعے پر، جب انسان ایک خدا کی ولادت کا جشن منا رہے تھے، وجود میں آیا۔

اب یہ ستارہ ہی انسان کا نیا خدا ہے اور انسان کے سیارگانی ماحول میں ایسی تبدیلیاں لا رہا ہے جن کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اس نے واقعات کے ایک سلسلے کو متحرک کر دیا ہے جس کا خواب میں بھی تصور نہ کیا گیا تھا۔ یہ ستارہ ایسے نازک توازنوں کو ملیامیٹ کر رہا ہے جو ہزاروں سال میں بتدریج ارتقا پا کر موجودہ مقام تک پہنچے تھے۔

شہاب ثاقب کی طرح فضا سے گزرتے ہوے، وہ کیسے جگمگا گیا، کس طرح، کسی ہیبت ناک میزائل کی طرح اڑ کر آسمان میں اپنی جگہ پر پہنچا۔ اس کی رخشندگی نے تاریکی میں آگ لگا دی۔ اس کی کرنوں نے طلسم کی طرح زمین کو چھوا اور دنیا کے باسیوں پر منتر پھونک دیا۔ اس کے صعود کرنے کی گرج، جو کانوں کے پردوں کو شق کیے دیتی تھی، ایک نئے عہد کی نقیب تھی، جو انسانی تخیل کی رسائی سے ماورا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی تابکاریوں نے حیویاتی طرازوں کو بدل ڈالا، جو تغیر ناآشنا تھا اسے منقلب کر دیا، عجیب عجیب نئے رویوں کو جنم دیا۔ ابھی اس بارے میں شک پایا جاتا ہے کہ ان

Scanned with CamScanner

تبدّلات میں سے کون سے بالآخر مستحکم ثابت ہوں گے، بشرطے کہ مستحکم ثابت ہوے۔ اور آیا نسلِ انسانی کسی قابلِ شناخت شکل میں جانبر ہو سکے گی؟ اس امر کا دار و مدار اس نئے خدائی ستارے پر ہے جو انسان اور دنیا کو نئے سرے سے بدل رہا ہے۔

آسمان پر، جیسے زمین پر، تمام قدرت، تمام جگمگ جگمگ کرتی شان، ستارے کے حصے میں آئی ہے۔ اس کے جاہ و جلال کے آگے سورج ماند پڑ گیا ہے اور سیارے کی آنکھوں سے بینائی جاتی رہی۔ جہاں پہلے کچھ نہ تھا، وہاں اب وہ ستارہ ایک تجلی کی فروزش بنا ہوا ہے۔

میں کہاں ہوں؟ کون ہوں؟ اس ستارے کے نمودار ہونے کے بعد سے کسی چیز پر یقین نہیں رہا۔ یہاں اندھیرا ہے اور چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ کوئی زیادہ دیر تک ایک جیسی نہیں رہتی۔ میں ہر وقت چیزیں گم کرتی رہتی ہوں۔ اندھیرے میں میں انھیں گراتی نہیں، غلط جگہ نہیں رکھتی، چھوڑ کر نہیں چلی جاتی؛ بس مجھے پتا چل جاتا ہے کہ وہ موجود نہیں، اچانک کہیں کھسک جاتی ہیں۔

یہ تمام تبدیلیاں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ ان تبدیلیوں کا آغاز ستارے کے ساتھ ہوا۔ میں خود بدل رہی ہوں۔ میں اس تبدیلی کو محسوس کر سکتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں بدل کر ویسی نہیں رہی جیسی کبھی تھی۔ گمشدہ چیزوں کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو چکی ہیں۔ میں اب انھیں کبھی نہ ڈھونڈ پاؤں گی۔ بنیادی لازمی چیزیں، جن کے بارے میں ہمیشہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ تو موجود ہی ہیں، دور ہٹتی جاتی ہیں، تحلیل ہوتی ہیں، گم ہو جاتی ہیں، بالکل مختلف چیزوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ بات پریشان کن ہے۔

اندھیرا گہرا ہوتا ہوتا، چڑھتا چڑھتا، رینگ رینگ کر میرے گھٹنوں تک آ جاتا ہے، میری کمر تک۔ کمر کے مہرے اپنی جگہ سے کھسک جاتے ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی اندھیرے میں سما جاتی ہے۔ اس کے بعد بالوں کی باری آتی ہے، اب چہرے کی۔ آنکھیں اپنے حدقوں سے چوس کر نکال لی جاتی ہیں، کستورا مچھلیوں جیسی چکنی جو کسی بدررو میں آرام سے بہی جا رہی ہوں۔ اچانک یہ سب کے سب گمشدہ چیزوں میں جا ملے ہیں۔ اندھیرا، مجھ سمیت، ہر شے کو نگلے جا رہا ہے۔ یہ بلاشبہ پریشان کن بات ہے۔

گھڑی کی سوئیاں ہر وقت سوا پانچ پر۔ صبح؟ سہ پہر؟ اندھیرے میں کچھ پتا نہیں چلتا۔ کیا کمرہ

Scanned with CamScanner

بھی ہمیشہ وہی ہوتا ہے؟ یہ جاننے کی بھی کوئی صورت نہیں۔ زمان و مکاں بھی گمشدہ چیزوں میں شامل ہیں۔ جنس بھی گم ہے۔ مرد اور عورت اب ایک دوسرے کی جگہ لے سکتے ہیں۔ اسے انھوں نے 'بدل جنسیت' کا نام دیا ہے۔ یہ ستارے کی وجہ سے ہوا۔

دیواروں پر سائے تھپے ہوئے، کونوں میں سیاہی چھائی ہوئی۔ باہر آسمان بھی ضرور سیاہ ہوگا۔ میں آسمان کو دیکھ نہیں سکتی۔ ایک درخت ہے یہاں، اتنا قریب اگا ہوا کہ اس کی ٹہنیاں کھڑکی کو چھوتی ہیں۔ پتے اب بہت آہست آہستہ، مسلسل، آواز کیے بغیر، تھرّاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ سندیسے بھی لاتے ہیں۔ کیا پتے ہمیشہ... اب وہ تاریک پتنگے ہیں، جو کھڑکی کے شیشوں پر امنڈے پڑ رہے ہیں۔

یکا یک پتے اور ہی انداز میں حرکت کرنے لگتے ہیں۔ خیرہ کر دینے والا سفید اجالا۔ چمکیلے روپہلے کوندے، ٹہنیوں کے درمیان سے آہستگی سے پھسلتے ہیں۔ ستارے کی روشنی۔ میں اسے دیکھنا نہیں چاہتی۔ یہ ہرگز میرے جسم پر نہیں پڑنی چاہیے۔ میں کھڑکی سے پرے ہو کر پیچھے ہٹتی ہوں۔

روشنی کی پہنچ سے باہر میرے ذہن کے کسی کونے کھدرے میں ایک مبہم شبیہ دائیں بائیں کھسکتی ہے۔ میں نظر جھکا کر اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہوں۔ جنس بظاہر ابھی عورت ہی کی ہے۔ میں نے اسکرٹ تو پہن رکھی ہے، خیر سے۔

دوسری جنس کا ایک فرد اندر آتا ہے، ہشاش بشاش: ''اجی، میں نے کہا، بالکل اندھیرے میں؟''

''تمھیں پتا ہے مجھے اندھیرا اچھا لگتا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں بجلی نہیں جلاؤں گا۔''

میں محسوس کرتی ہوں کہ اس نے ہاتھ سوئچ سے ہٹا لیا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر سے بوجھ اتر گیا۔ اب وہ دفع کیوں نہیں ہو جاتا؟ وہ جانتا ہے کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے۔ وہ صرف مجھے تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ جتنی دیر وہ کمرے میں موجود ہوتا ہے، میں ہمیشہ تناؤ میں رہتی ہوں، بے کل ہو جاتی ہوں۔ خاص طور پر اُس وقت جب میں اصل میں اسے دیکھ ہی نہیں سکتی۔ وہ ٹھیک کہاں پہ ہے؟ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری بے چینی سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جان

بوجھ کر اسے طول دیتا ہے۔ یہ اس کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ وہ کینہ پرور ہے۔

بظاہر فی الحال وہ بات چیت کرنا چاہتا ہے۔ ''لوگ اوپر ہمارے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ تمھارے بارے میں نہیں۔ انھوں نے میرے قدموں کی آہٹ نہیں سنی۔ میں راہداری میں کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔''

انھوں نے کہا کیا؟'' مجھے پروا نہیں، جاننا بھی نہیں چاہتی، لیکن یہ بھی پتا ہے کہ سوال کرنا ضرور ہے۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ حیرانی کی بات ہے، تم، اس تنہا مکان میں، میرے ساتھ رہنے سے ڈرتی نہیں ہو۔'' اس کا لہجہ بدلتا ہے۔ اب پہلے سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ آواز سے لگتا ہے کہ مجھے چھیڑ رہا ہے، لیکن انداز ایذا رسانی کا ہے۔

''میں کیوں ڈروں؟''

''اس لیے کہ کہیں میں تمھارے ساتھ کچھ کر نہ بیٹھوں۔''

''کیا کر بیٹھو؟''

''تمھیں ٹھکانے لگا دوں۔''

دانت یونہی سے چمکتے ہیں۔ دانت دکھاتی مسکراہٹ۔ اس کے بعد وہ جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر مغرورانہ انداز میں لمبے ڈگ بھرتا ہے، جو میں نہیں دیکھ سکتی۔ کسی کاؤبوائے کی طرح کولھوں سے جسم کو بل دیتا ہے، انگوٹھے نیچے کو بندھی پیٹی میں ٹھنسے ہوئے۔ اب روشنی تقریباً معدوم ہو چکی ہے۔ کھڑکی کے بالمقابل وہ محض ایک دھندلی، تاریک سی شکل ہے، تھوڑی سی آگے کو جھکی، جو اندھیرے کو گھور رہی ہے، کسی بھی چیز کی طرف نہیں گھور رہی۔ اس کا ماتھا ضرور کھڑکی کو چھو رہا ہوگا۔ کیا وہ پتنگے پتوں کی سرگوشیاں سن رہا ہے؟ وہ کون سی پراسرار معلومات، خفیہ احکامات، اس تک پہنچ رہے ہیں؟ آناً فاناً روپہلا پن، اس کے بالوں پر چمکتا ہوا، اور دوبارہ ایک ہی لپک میں غائب۔ اسے ستارے سے خوف کیوں نہیں آتا؟

''کیا تم خوفزدہ ہو؟'' وہ پوچھتا ہے، ''میرا مطلب ہے، قتل ہونے سے۔''

''میں نے کبھی اس بارے میں سوچا نہیں۔''

''کبھی نہیں سوچا؟'' سائے جیسا چہرہ میری طرف مڑتا ہے۔ دانتوں کی دھندلی چمک دوبارہ نمایاں ہے، جو بات کہے جانے کے بعد بھی مدھم سفید سی نظر آتی رہتی ہے۔ ''معلوم ہے شاید تمھیں ڈرنا چاہیے۔ صرف تیار رہنے کے لیے۔ صرف احتیاطاً۔ کیونکہ شاید آج کل میں مجھے تمھیں قتل کرنا پڑے۔''

''کیوں؟''

جسم سے الگ تھلگ وہ دانت دکھاتی مسکراہٹ بدستور فضا میں معلق ہے۔ قاتل کی دانت نکوستی مسکراہٹ؟ چیشر بلی[1] کی مسکراہٹ؟

''تم سمجھتی نہیں۔ مجھے شاید مجبور کر دیا جائے۔ شاید یہ واحد کام ہے، جو میرے بس میں ہے۔ بات ہے تو یہ ہے۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''نہیں سمجھیں؟'' خاموشی... مکمل تاریکی نے کمرے کو ایک ٹھوس سیاہ مکعب میں تبدیل کر دیا ہے۔ اب وہ مجھے بالکل نظر نہیں آ رہا۔ کھڑکی کے بالمقابل بھی نہیں، وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے۔ غیر متوقع طور پر ادھر بائیں طرف سے اس کی آواز آ کر چونکا دیتی ہے، ''خیر سوچو تو، تمھارے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟''

''نہ جانے تم کیا کہے جا رہے ہو؟'' میری آواز میں خوف... کیا خوف اسے سنائی دے گیا ہے؟

اس کی آواز، الکسائی ہوئی، کینہ پرور انداز میں چڑانے والی، کچھ پتا نہیں چلنے دیتی۔

''چلو بھی... بنومت، جیسے کچھ سمجھی ہی نہیں ہو، حالانکہ تمھیں بھی معلوم ہے اور مجھے بھی...''

''میں بتا رہی ہوں، مکر نہیں کر رہی، میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا کہ تمھارا مطلب کیا ہے۔''

میں خود پر قابو رکھنے کی کشاکش میں مبتلا ہوں، جس میں مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہو رہی۔

اس کے بعد مزید خاموشی۔ عمیق طور پر ایک ہی خیال میں جکڑا ذہن، جو گہرائی میں سرگرمِ عمل

---

[1] ایلس ان ونڈر لینڈ میں ایک بلی جو رفتہ رفتہ غائب ہوتی جاتی ہے اور آخر میں صرف اس کی مسکراہٹ نظر آتی ہے۔ (مترجم۔)

ہے، یہ جانتا ہے کہ اس آدمی نے اپنی جگہ پھر بدل لی ہے۔ اندھیرے میں ایسی آرجار جو بے آواز ہے، اسے میرے بالکل پیچھے لے آتی ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ وہاں دھمکانے والے انداز میں ہاتھ اٹھائے کھڑا ہے۔ وہ کیا کرنے والا ہے؟ مکمل سراسیمگی کا ایک پل۔

وہ ماچس کی تیلی جلاتا ہے اور ظاہر کردیتا ہے کہ وہ کہاں ہے۔ بہرصورت میرے پیچھے نہیں، ذرا سا پہلو میں۔ ننھی جھلملاہٹ لمحاتی بھی معلوم ہوتی ہے اور قرن ہا قرن پر محیط بھی، اور بجھنے کے بعد اندھیرے کو زیادہ تخویف آمیز، زیادہ شدید بنادیتی ہے۔ جب بھی سگریٹ کا کش لیا جاتا ہے تو اس کا چہرہ وقفے وقفے سے ایک غیر واضح، مٹی مٹی حالت میں مجسم ہوجاتا ہے، ورنہ نظر نہیں آتا۔ میں دیکھے جاتی ہوں اور دیکھے جاتی ہوں۔ مشوش ہوکر منتظر رہتی ہوں کہ چہرہ پھر دکھائی دے۔ ان جھلکیوں کے درمیان بالکل سوچ نہیں پاتی کہ وہ کیسا ہے۔ میں اسے کبھی یاد ہی نہیں رکھ سکتی۔ عجب بات، جبکہ میں کسی کے اٹھنے بیٹھنے اور چلنے پھرنے کو اچھی طرح یاد رکھتی ہوں۔ یہ چہرہ دوسری بار کبھی ویسا نظر نہیں آتا جیسا پہلے نظر آیا تھا۔

آخرکار آواز دوبارہ سنائی دیتی ہے: ''تم بخوبی واقف ہو کہ کس طرح بدلتی جارہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تم نے خود کو یہاں بند کرلیا ہے۔'' ان انتہائی پریشان کن لفظوں کے بعد ایک وقفہ آتا ہے، جس کے دوران میں دہشت آہستہ آہستہ اپنا خبیث باطنی سر اٹھاتی ہے۔ چند مزید الفاظ: ''تمھیں صرف آئینے میں خود پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔''

ایک اور وقفہ جس کے دوران میں ہولناکی کی کلی کھلتی اور پھول بن جاتی ہے۔ ''تمھارا مطلب ہے؟''... میرا منھ اتنا خشک ہوچکا ہے کہ میرے لیے سرگوشی کرنا بھی مشکل ہے۔

''میرا مطلب بالکل وہی ہے جو تم نے سمجھا۔'' اس کی آواز ظالمانہ حد تک پراعتماد اور محکم ہے۔

تخیل یک بیک کسی موذی افزائش کی طرح پھلنے پھولنے لگتا ہے۔ اندھیرے کمرے میں کابوسی ہولناکیوں کی بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ''نہیں، ممکن نہیں کہ ایسا ہوسکے۔ میرے ساتھ تو نہیں ہو سکتا...'' الفاظ مفہوم سے تقریباً لاتعلق ہوکر بغیر کسی ربط کے میرے منھ سے نکل پڑتے ہیں۔ ''اس کے ساتھ ایسی بات پیش نہیں آسکتی جو حیویاتی طور پر مستحکم ہو، کوئی پوری طرح ذہنی اور جسمانی طور پر

Scanned with CamScanner

پختہ بالغ فرد... ڈی این اے، کہاں گیا... جینز اور دوسری سب باتیں کیا ہوئیں؟'' آواز انتہا درجے کی مایوسی کی حامل ہے، جیسے کسی ایسے جج کو مخاطب کیا جا رہا ہو جس کے فیصلے پر ان باتوں کے ذریعے اثر انداز ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ شاید جو آدمی مجھے دکھائی نہیں دے رہا وہی جج ہے۔ مجھے اس کے بارے میں سرے سے کچھ علم نہیں۔

''اس منظر کی قطعاً کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہ صورتحال سراسر نئی ہے۔'' اس کی آواز میں، جو دوبارہ تبدیل ہو گئی ہے، ان کینہ پرور لہجوں سے مختلف جو میں سنتی رہی ہوں، ایک خاص طرح کی عدالتی لاتعلقی موجود ہے۔ ''ہمارے پاس ایسے کوئی معین اصول یا معیار نہیں جن کی روشنی میں کسی فیصلے پر پہنچا جا سکے، کسی ایسی چیز کا علم نہیں جس سے اس صورتحال کا تقابل ممکن ہو، اور اسی لیے کچھ بھی پیش آ سکتا ہے۔'' وقفہ۔ پھر اس طرح جیسے کسی بچے سے اس کی سمجھ کے مطابق گفتگو کی جائے: ''ابھی ذرا پہلے کی بات ہے کہ جنس کی تبدیلی کو ناممکنات میں شامل سمجھا جاتا ہوگا۔''

''لیکن یہ دوسری بات تو واقعی ناممکن ہے۔ مجھے تو اس پر بالکل یقین نہیں آ رہا۔'' کیا یہ آواز میری ہو سکتی ہے؟ اتنی دیوانہ وار طفلانہ گفتگو کرتی ہوئی، تقریباً آنسوؤں میں بھیگی ہوئی۔

سگریٹ پیا جا چکا ہے۔ زور سے دبا کر بجھا دیا گیا ہے۔ بے روشن کمرے میں نظر نہ آنے والی حرکات کا احساس ہوتا ہے۔ اس مرتبہ رخ دروازے کی طرف ہے۔ آخر کار لگتا ہے کہ وہ جا رہا ہے۔ دروازے کے دستے کے گھومنے کی کھٹک سنائی دیتی ہے۔ چہرہ بھی ساتھ ہی پلٹ آتا ہے، ایک دفعہ پھر دانتوں کی مدھم چمک۔ پھر وہ چمک بھی ناپید ہو جاتی ہے۔

اپنی آنکھوں سے مجھے مطلق کچھ نظر نہیں آتا۔ میں صرف تخیل میں دیکھتی ہوں کہ وہ بند ہوتے دروازے کی درز میں سے جھک کر، ملائمت سے، خون ٹھٹھرا دینے والی گہری انسیت کے لہجے میں بولتا ہے۔ تین لفظ مجھ تک پہنچتے ہیں:

''اپنے کان چھوؤ۔''

وہ شخص اب وہاں موجود نہیں.. اس کے ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ اب تو اہمیت ستارے کو حاصل ہے، جو وہاں ہے: ''کھڑکی سے باہر''۔ کالے پتوں، کالی ٹہنیوں کے بیچ میں سے کالے آسمان پر جگمگاتا ہوا ستارہ ہر جگہ موجود ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ اس کی

Scanned with CamScanner

تابکاریاں مجھ میں اپنا کام دکھا رہی ہیں۔ میری انسانیت کو نگل اور پارہ پارہ کر رہی ہیں۔ ستارہ کسی طور سے انسانی عنصر کو جسمانی سطح پر بدل سکتا ہے۔

جو انسان میں پہلے کبھی تھی اب نہیں رہی۔ مجھے اب نہیں معلوم کہ اپنے بارے میں کیا فرض کروں کہ میں کیا ہوں۔ یہاں چیزیں ادلتی بدلتی رہتی ہیں۔ اندھیرے میں گم ہوتی جاتی ہیں۔ یہ بہت پریشان کن ہے۔

میں جو بھی سہی، گمشدہ چیزوں کے درمیان ہوں... اتنا مجھے معلوم ہے۔

❁❁

ایوان بونین

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

سان فرانسسکو کا شریف زادہ

''افسوس، افسوس، وہ غدار شہر بابل، وہ بلوان شہر!''

—مکاشفہ

سان فرانسسکو کا شریف زادہ — نہ نیپلز میں اور نہ کاپری کے جزیرے پر کسی کو اس کا نام یاد آ سکا— اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ یورپ جا رہا تھا، جہاں اس کا پورے دو سال، محض لطف اٹھانے کی خاطر، قیام کرنے کا ارادہ تھا۔

وہ مصمم طور پر یقین رکھتا تھا کہ اسے آرام کرنے، لطف اندوز ہونے، ایک طویل پر آسائش سفر پر جانے اور نہ جانے کون کون سی باتوں کا پورا حق حاصل ہے۔ اس ایقان کی ایک دوگانہ وجہ تھی: اوّل یہ کہ وہ امیر تھا، اور دوم یہ کہ اٹھاون سال کا ہونے کے باوجود وہ بس اب زندگی کی لذتوں کے بہاؤ میں قدم دھرنے کو تھا۔ اس میں کلام نہیں، اب تک وہ درحقیقت جیا نہ تھا، بلکہ محض ایک وجود رکھتا تھا— خاصی آسودہ طرح لیکن اس نے اپنی محبوب ترین امیدوں کو آئندہ پر ٹال رکھا تھا۔ وہ ماندہ ہوئے بغیر جاں فشانی کرتا رہا— چینیوں کو، جنھیں اس نے اپنے کاروبار کی خاطر ہزاروں کی تعداد میں درآمد کیا تھا، بخوبی علم تھا کہ اس کے کیا معنی تھے — اور آخرکار اس نے دیکھا کہ وہ بہت کما چکا اور قریب قریب ان لوگوں کے معیار تک پہنچ گیا جنھیں اس نے ایک وقت میں اپنے لیے مثال بنایا

Scanned with CamScanner

تھا، اور اس نے دم لینے کی ٹھان لی۔ جس طبقے کے لوگوں سے اس کا تعلق تھا، ان کی عادت تھی کہ یورپ، ہندوستان، مصر کا سفر کر کے زندگی سے حظ اٹھانے کا آغاز کرتے تھے۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ بھی یہی کرے گا۔ ظاہر ہے، سب سے زیادہ وہ خود کو سالہاسال کی مشقت کا انعام دینے کا آرزومند تھا، لیکن اسے اپنی بیوی اور بیٹی کی خوشی بھی ملحوظ تھی۔ اس کی بیوی کو کبھی کسی غیر معمولی تاثر پذیری نے ممیّز نہ کیا تھا، تاہم ادھیڑ عمر کی امریکن عورتیں سب ہی گرمجوش سیاح ہوتی ہیں، اور سفر تو اس کی بیٹی کی، جو شادی کے قابل عمر کی کچھ کچھ روگی سی لڑکی تھی، ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اس کی صحت کی بہتری کا مذکور تو ایک طرف رہا، کیا سفر کے دوران میں بختاور ملاقاتیں نہیں ہوتیں؟ بدیس میں، ممکن ہے، آدمی کو ایک شہزادے کے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھنے، یا ایک کروڑ پتی کے پہلو بہ پہلو دیواری مرقعے دیکھنے کا موقع ملے۔

سان فرانسسکو کے شریف زادے نے سفر کا جو خاکہ مرتب کیا تھا وہ بڑا مبسوط تھا۔ دسمبر اور جنوری میں اسے جنوبی اطالیہ کی دھوپ، پاستانی عمارات، تارنتیلا ناچ، سیلانی گویّوں کے شبینہ نغموں اور اُس بات کا مزہ لوٹنے کی توقع تھی جس کی ضرورت اس کی عمر میں انتہائی شدت سے محسوس ہوتی ہے — نوجوان نیپلزی لڑکیوں کی محبت، جو بالکل بے غرض اگرچہ نہیں ہوتی۔ ایامِ کارنیوال اس نے نیس اور مونتے کارلو میں بسر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا، جو سال کے اس زمانے میں منتخب ترین سوسائٹی کے میل ملاپ کی جا ہے، سوسائٹی جس پر تہذیب کی تمام رحمتوں کا انحصار ہے: شام کے سوٹ کی قطع، راج گدیوں کی استقامت، جنگوں کے اعلان اور ہوٹلوں کے فروغ کا۔ ان لوگوں میں بعض خود کو گرمجوشی کے ساتھ موٹروں اور کشتیوں کی دوڑوں کے لیے اور بعض جوئے کی میز کے لیے وقف کر دیتے، بعض، مزید برآں، خود کو اُس کام میں مشغول رکھتے جسے عشق بازی کہا جاتا ہے، اور بعض کبوتروں کا شکار کھیلتے، جو کابکوں سے اتنے خوبصورت انداز میں پرواز کر کے ذرا دیر کو زمردیں لان کے اوپر، نیلے پھول سمان سمندر کے پس منظر پر، منڈلاتے ہیں اور پھر یک بیک، چھوٹے سفید لوندوں کی طرح، نیچے آ پڑتے ہیں۔ مارچ کا آغاز وہ فلورنس کے لیے وقف کرنا اور ایسٹر پر، پیرس میں میزیری رے (پچاسویں مزمور) کی خواندگی سننا چاہتا تھا۔ اس کے منصوبوں میں وینس، پیرس، اشبیلیہ میں بندھے بیل اور کتوں کا مقابلہ، جزائرِ برطانیہ میں سمندری غسل، ایتھنز، قسطنطنیہ، فلسطین اور مصر بھی، حتیٰ

Scanned with CamScanner

کہ جاپان تک شامل تھا، ظاہر ہے، واپس جاتے ہوئے... اور ابتدا میں سفر واقعی بہت اچھا کٹا۔

نومبر کا آخر تھا اور جبرالٹر تک، تمام راستے، جہاز ایسے سمندر سے گزرا جس پر یا تو برفانی تاریکی مسلط تھی یا گیلی برف برسانے والے طوفانوں کا زور تھا، لیکن کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور جہاز کو لغزش تک نہ ہوئی۔ مسافر — جو تمام مرتبے والے لوگ تھے — متعدد تھے اور دُخانی، مشہور اٹلانٹس، ایسے انتہائی گراں یورپی ہوٹل سے مشابہ تھا جو تمام نئی اصلاحات کا حامل ہو: نقل وشرب کی ایک شبینہ بار، مشرقی حمام، حتیٰ کہ ایک اپنا اخبار بھی۔ رہن سہن کا انداز بے حد اشرافی تھا۔ مسافر، ایک بگل کی کٹیلی آواز سے بیدار ہو کر، علی الصباح ہی اٹھ جاتے اور اس تاریک ساعت میں غلام گردشوں میں جمع ہو جاتے جب کہرے میں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہلکے بھورے اور سبز آبی بادیے پر پو آہستہ آہستہ، اور آزردہ خاطری سے پھٹتی ہوتی۔ فلالین کے پاجامے پہننے کے بعد وہ کافی، چوکولیٹ اور کوکو پیتے؛ مرمریں طبوں میں آرام کرتے، اپنی معمولی ورزش کرتے اور اپنی آسودگی کے احساس کو بڑھاتے اور اشتہا کو تیز کرتے ہوئے، دن کا لباس پہنتے اور ناشتہ کرتے۔ ان سے یہ توقع رکھی جاتی تھی کہ گیارہ بجے تک وہ عرشے پر، سمندر کی سرد تازگی میں سانس لیتے ہوئے، چہل قدمی کریں گے، یا وہ ٹیبل ٹینس یا دوسرے اشتہا انگیز کھیل کھیلتے۔ گیارہ بجے سینڈوچوں اور یخنی کے شوربے پر مشتمل چاشت حاضر کیا جاتا، جس کے بعد لوگ دوپہر کے کھانے کا، جو ناشتے سے زیادہ مطعم اور متنوع ہوتا تھا، سکون سے انتظار کرتے ہوئے اخبار پڑھتے رہتے۔ اگلے دو گھنٹے آرام کے لیے مخصوص تھے: اس وقت تمام عرشے دخانی کرسیوں سے بھر جاتے، جن پر مسافر، اونی چوخانہ چادریں لپیٹے، دراز ہو کر کاہلانہ اونگھتے یا ابرناک آسمان اور جہاز کے پہلوؤں سے پرے جھاگ کے حاشیوں والے چھچھاتے آبی ٹیلوں کو دیکھتے رہتے۔ پانچ بجے تازہ دم اور بشاش ہو کر، وہ تیز، خوشبودار چائے نوش کرتے۔ سات بجے بگل کی آواز ماکولات کے نو اَدوار پر مشتمل ڈنر کا اعلان کرتی... پھر سان فرانسسکو کا شریف زادہ، عزیزی توانائی کے ریلے کے زیرِ اثر ہاتھ ملتا ہوا، ڈنر کا لباس پہننے کے لیے اپنے پرتکلف جہاز کے بہترین کمرے کی طرف لپکتا۔

شام کے وقت اٹلانٹس کے تمام عرشے تاریکی میں پسر جاتے، ان کی ان گنت آتشیں آنکھیں چمکتیں اور نوکروں کا ایک جم غفیر باورچی خانوں، برتن دھونے کے کمروں اور شراب کے

سردابوں میں بڑھتی ہوئی ہڑبڑاہٹ کے ساتھ کام میں مصروف ہوتا۔ جہاز کے پہلوؤں میں ایک ہولناک ساگر کروٹیں لے رہا تھا، لیکن کسی کو اس کا خیال نہ تھا۔ سب کو کپتان کی جہاز پر قابو رکھنے کی قابلیت پر اعتماد تھا، جو ایک سرخ بالوں والا دیو تھا، بھاری بھر کم اور بہت تندا سا، اور چوڑی سنہری دھاریوں والی وردی پہن کر ایک عظیم الجثہ مورت معلوم ہوتا تھا، اور اپنی پر اسرار کمین گاہ سے، لوگوں کو مستفیض کرنے کی خاطر، شاذ ہی باہر نکلتا تھا۔ پیش بالا خانے پر سائرن افسردگی سے چنگھاڑتا یا دیوانے غیظ کے دورے میں کلکارتا، لیکن کھانا تناول کرنے والوں میں سے کم ہی اسے سنتے۔ اس کی جہنمی آواز کو تاروں والے باجوں کے ایک نہایت اعلیٰ ارکسٹرا کے شور نے دبا دیا تھا، جو ایک کشادہ ایوان میں، جہاں سنگ مرمر کی آرائش تھی اور مخملیں قالین بچھے ہوئے تھے، مسلسل اور نفیس طرح بجتا رہتا۔ ایوان روشنی کی بوچھاروں میں غرق ہوتا، جو بلوریں شمعدانوں اور مغرق جھاڑوں سے پھوٹتی رہتی؛ وہ کھلے گریبان کی پوشاکوں میں ملبوس مرصع خواتین، ڈنر کوٹ پہنے ہوئے مردوں، خوش سلیقہ ملازموں اور مودب مہتمموں کے ہجوم سے معمور رہتا۔ ان میں سے ایک مہتمم، جو استثنائی طور پر شراب کی فرمائشیں پوری کرتا تھا، کسی لارڈ میئر کی طرح گلے میں زنجیر پہنے رہتا۔ شام کے لباس اور مثالی کتان میں سان فرانسسکو کا شریف زادہ بہت جوان نظر آتا۔ اس کی جلد خشک، قد درمیانہ اور کاٹھی مضبوط گو بے ہنگم تھی، اور مکمل دھلائی اور صفائی کی بدولت چکنا اور معتدل طور پر جوشیلا، وہ اس محل کے زریں احتشام میں بیٹھا کرتا۔ اس کے قریب ہی عنبریں جوہانس برگر کی بوتل اور مختلف تقطیع کے انتہائی نازک شیشے کے ساغر دھرے ہوتے، جن پر تازہ سنبلوں کا ایک گھونگھریالا گچھا ہوتا۔ اس کے تراشیدہ روپہلی مونچھوں والے زرد چہرے میں کچھ منگولی شباہت تھی؛ اس کے بڑے بڑے دانت بھرے ہوئے سونے سے جھمکتے تھے اور اس کے مضبوط گنجے سر پر، پرانے عاج جیسی، پھیکی چمک تھی۔ اس کی بیوی، جو چوڑی چکلی اور حلیم عورت تھی، بیش قیمت، لیکن اپنی عمر کے مطابق، لباس پہنتی تھی۔ اس کی قدآور اور چھریری لڑکی کی پوشاک، پرپیچ لیکن ہلکی، شفاف اور معصومانہ شوخ ہوتی اور شاندار بال خوش اسلوبی سے گندھے ہوتے؛ بنفشے کی مہک سے بھری گولیوں سے اس کی سانس خوشبودار ہوتی اور اس کے ہونٹوں کے پاس اور اس کے خفیف سا پاؤڈر لگے مونڈھوں کے درمیان متعدد ننھے اور انتہائی نازک گلابی گڑھے تھے...

Scanned with CamScanner

ڈنر پورے دو گھنٹے تک جاری رہتا، اور بعد ازاں رقص خانے میں ناچ ہوتے؛ اس اثنا میں مرد — جن میں سان فرانسسکو کا شریف زادہ بھی شامل ہوتا — نکل کر نقل و شرب کی بار میں جا بیٹھتے، جہاں سرخ جاکٹ والے حبشی، جن کے دیدے خوب اُبلے ہوئے چھلکا اترے انڈوں جیسے تھے، خدمت میں حاضر ہوتے۔ وہاں وہ میزوں پر پاؤں دھرے، ہوانا سگار پیتے ہوئے، شراب پی پی کر چہروں کو لالہ انگارہ کیے، تازہ ترین سیاسی اور اسٹاک ایکسچینج کی خبروں کی رو سے قوموں کے مقدر کا فیصلہ کرتے۔ باہر، سمندر بھدا کے سے کالے پہاڑ اُچھالتا؛ برفانی طوفان، پگھلتی برف سے بوجھل ہوتے جہاز کے بالائی کھٹ راگ میں، غضب ناک طور پر پھنکارتا؛ طوفان سے کشمکش کرتے ہوئے اور ان جگہ بدلنے اور کھولنے والے کوہ آسا انباروں کو بمشکل چیرتے ہوئے، جو اپنی کف آلودہ دُمیں دور دور تک اچھال رہے تھے، جہاز کا جوڑ جوڑ کانپتا؛ طوفان اور کہر سے گلو گرفتہ سائرن اذیت کے مارے کراہتا؛ نگہداری کے مافوق البشر دباؤ سے پہریدار اپنے اپنے دیدبانوں پر اکڑ کر تقریباً بے اوسان ہو جاتے۔ دخانی کا مغروق رحم، جہنم کی تیرہ و تار اور پُر حبس بساط کے مانند، جہنم کے آخری، نویں حلقے کی طرح تھا، جہاں کھلے جبڑوں والی سرخ انگارہ عفریت نما بھٹیاں جمائیاں لیتیں، اور گھگھڈ، ہو ہو کرتی آوازیں نکالتیں؛ جہاں بھٹی جھونکنے والے، کمر تک برہنہ اور شعلوں کے عکس سے ارغوانی، خود اپنے گندے، تیزابی پسینے میں نہاتے۔ اور یہاں، نقل و شرب کی بار میں، بے فکر انسان، رقص کے جوتوں میں جکڑے پاؤں میزوں پر دھرے، کونیاک اور شرابوں کی چسکیاں لیتے، معطر دھوئیں کی موجوں میں چکراتے اور دقیق فقرے چست کرتے؛ اور اُدھر رقص خانے میں ہر شے جگمگاتی اور روشنی، حرارت اور مسرت بکھیرتی۔ جوڑے کبھی والز کی دھن پر چکر کھاتے، کبھی تانگو کی دھن پر جھومتے؛ اور موسیقی، شیریں طور پر بے حجاب اور اداس، اپنی نہ ختم ہونے والی التجاؤں پر اڑی رہتی …
اس پُر شوکت ہجوم میں متعدد قابلِ ذکر ہستیاں تھیں: ایک خشک اور منکسر مزاج بوڑھا سفیر؛ ایک بڑا بھاری لکھ پتی، دراز قامت، ڈاڑھی مونچھ سے بے نیاز، غیر معین عمر کا، جو اپنی پرانی وضع کے ڈریس کوٹ میں رئیس کلیسا نظر آتا تھا؛ ایک مشہور ہسپانوی ادیب بھی تھا، اور ایک بین الاقوامی حسینہ بھی جو ابھی سے کچھ کچھ ڈھل گئی تھی اور اخلاقی اعتبار سے مشتبہ تھی۔ اس ہجوم میں پریمیوں کا ایک پُر نفاست اور نستعلیق جوڑا بھی تھا، جسے ہر کوئی متجسسانہ دیکھتا اور جو اپنی آنند پر پردہ نہ ڈالتا؛ مرد ناچتا تو صرف

اپنی ہی عورت کے ساتھ، صرف اسی کے ساز پر، بڑی مہارت سے، گاتا، اور وہ اتنے دلفریب، اتنے خوش ادا تھے! یہ صرف کپتان ہی کو معلوم تھا کہ جہازی کمپنی نے انھیں ایک معقول مشاہرے پر محبت کا سوانگ بھرنے کے لیے نوکر رکھا تھا اور یہ کہ انھیں کبھی ایک اور کبھی دوسرے دُخانی پر سفر کرتے ہوئے اب ایک مدت ہونے کو آئی تھی۔

جبرالٹر میں دھوپ اور اوائل بہار سے مشابہ موسم سے ہر شخص بشاش ہو گیا۔ ایک نیا مسافر اٹلانٹس پر نمودار ہوا اور اس نے ہر ایک کی دلچسپی کو اکسایا۔ وہ ایک ایشیائی سلطنت کا ولی عہد تھا جو بھیس بدل کر سفر کر رہا تھا؛ بہت چست و چالاک، گو بظاہر لکڑی کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قد پست، چہرہ چوڑا، آنکھیں چھوٹی، جن پر سنہری کمانی کی عینک تھی، اور اپنی لمبی مونچھوں کی وجہ سے، جو کسی مردے کی مونچھوں کی طرح چھدری تھیں، کچھ کچھ ناگوار، وگرنہ دلفریب، سادہ اور منکسر تھا۔

بحرِ روم میں سردی کے تنفس کا دوبارہ احساس ہوا۔ سمندر طوفانی تھے اور مور کی دم کی طرح بوقلموں اور بادِ شمال کے مگن جھکڑوں کی اٹھائی ہوئی موجیں ایک جگمگاتے اور بالکل صاف آسمان کے نیچے اپنی سفید چوٹیاں اچھال رہی تھیں۔ اگلی صبح فلک ماند پڑنے لگا اور افق دھندلا گیا۔ خشکی نزدیک تھی۔ پھر اسخیا اور کاپری نظر آنے لگی، اور اوپیرا بین کی مدد سے نیپلز کو تاکا جا سکتا تھا، جو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ایک غیر واضح فاختئی رنگ کے ڈھیر کے پائیں، شکر کے دانے بکھرے ہوئے ہوں اور جن کے اوپر، بعید پہاڑوں کا ایک برف پوش سلسلہ تھا۔ عرشوں پر بھیڑ بھاڑ تھی۔ بہت سے صاحبان اور خواتین نے ہلکے سمور کوٹ پہن لیے تھے؛ ہمیشہ سرگوشیوں میں بات کرنے والے اور مسکین چینی خدام ——پتلی ٹانگوں والے جوان، جن کی کالی کلوٹی چوٹیاں ایڑیوں تک پہنچتی تھیں اور لڑکیوں جیسی موٹی پلکیں تھیں—— چوخانہ چادریں، بید، مگر مچھ کی کھال کے بیگ اور دستی تھیلے اٹھا کر زینوں کے نیچے لا رہے تھے۔ سان فرانسسکو کے شریف زادے کی لڑکی شہزادے کے قریب کھڑی تھی، جس سے حسنِ اتفاق سے اس کا گزشتہ شام تعارف ہو گیا تھا، جو اس وقت کسی بہت دور کی چیز کو، جسے وہ لڑکی کو اشارے سے دکھا رہا تھا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا سوانگ بھرے اور اسی دوران میں کسی بات کی تشریح کرتے ہوئے، جلد جلد اور سکون سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ دوسرے مردوں کے درمیان لڑکا معلوم ہوتا تھا اور بالکل خوبصورت نہ تھا، اور پھر اس میں کوئی عجیب بات تھی: اس کی عینک، ڈربی

ہیٹ اور کوٹ بے حد عامیانہ تھے لیکن اس کی چھدری مونچھوں کے بالوں میں کچھ گھوڑے کی سی کیفیت تھی اور اس کے ہموار چہرے کی پتلی اور سنولائی کھال ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے قدرے کشیدہ اور روغن شدہ ہو۔ لیکن لڑکی اس کی باتیں سن رہی تھی اور اس کی برانگیختگی اتنی زبردست تھی کہ وہ اس کے الفاظ کے معنی بمشکل سمجھ پاتی تھی؛ اس کا دل ایک ناقابلِ فہم سرخوشی اور ناز کے ساتھ دھڑک رہا تھا، کہ وہ اس کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا ہے، اور کسی سے نہیں۔ اس کی ہر چیز جدا تھی؛ اس کے خشک ہاتھ، اس کی صاف جلد، جس کے نیچے قدیم شاہانہ خون دوڑ رہا تھا، حتیٰ کہ اس کے ہلکے جوتے بھی جدا تھے اور اس کا یورپی لباس بھی، جو سادہ مگر غیر معمولی طور پر ستھرا تھا — ہر چیز میں ایک ناقابلِ تشریح دلربائی پنہاں تھی اور محبت کے خیالوں کو جنم دے رہی تھی۔ اور سان فرانسسکو کا شریف زادہ، بذاتِ خود، ریشمی ہیٹ اوڑھے اور بھورے چرمی ساق پوش چڑھائے، لک کے جوتے پہنے، ایک قریب کھڑی ہوئی مشہور حسینہ پر، جو ایک خوش قامت اور مکلف بلونڈ تھی، بار بار نگاہ ڈال رہا تھا، جس کی آنکھیں پیرس کے جدید ترین فیشن کے مطابق رنگی ہوئی تھیں، اور ایک منا، خمیدہ اور بال جھڑا پالتو کتا اس کے ساتھ تھا، جس سے وہ باتیں کر رہی تھی۔ اور لڑکی نے، ایک طرح کی مبہم الجھن میں، باپ پر توجہ نہ دینے کی کوشش کی۔

تمام متمول امریکنوں کی طرح وہ دورانِ سفر میں بہت فیاضی سے کام لیتا تھا، اور اسے ان لوگوں کی خیر خواہی اور مکمل خلوص پر یقین تھا جو اتنی تندہی سے اسے کھانا پیش کرتے، دن رات خدمت میں حاضر رہتے، اس کی خفیف ترین خواہش کو پہلے سے بھانپ لیتے، اسے گرد و غبار اور ہلڑ سے بچاتے، اس کا سامان اٹھاتے، قلیوں کو آواز دیتے اور سامان ہوٹل تک پہنچا آتے۔ ہر جگہ یہی عالم تھا، اور نیپلز میں بھی یہی ہونا چاہیے تھا۔ اس دوران میں نیپلز پھیلتا اور نزدیک آتا گیا۔ موسیقار، اپنے مجلا سازوں سمیت عرشے پر پہلے ہی سے ٹولی بنائے کھڑے تھے اور یک بیک انھوں نے ایک تربڑ کوچ کی نازاں صداؤں سے سب کو بہرا کر دیا۔ دیو کپتان نے، پوری وردی میں، شہ نشین پر نمودار ہو کر کسی شفیق وثنی صنم کی طرح مسافروں کی طرف ہاتھ ہلایا۔ اور سان فرانسسکو کے شریف زادے کو — جیسا کہ ہر شخص کو — یہ محسوس ہوا کہ کوچ کا باجا، جو مغرور امریکہ کو اتنا عزیز تھا، صرف اسی کے لیے دہاڑ رہا تھا اور جہاز کا کپتان صرف اسی کو خیر و عافیت سے پہنچنے کی مبارکباد دے رہا تھا۔ اور جب، بالآخر، جہاز

Scanned with CamScanner

بندرگاہ میں داخل ہوا اور اس کا تمام، کئی عرشوں والا، اٹالا گودی کے پشتے سے لگ گیا اور جہاز سے اترنے کا تختہ زور شور سے کھڑکھڑانے لگا— تو سنہرے فیتے والی ٹوپیاں پہنے قلیوں کی، جن کے مددگار ساتھ ساتھ تھے، کیسی بھیڑ نے، رنگین پوسٹ کارڈوں کے مٹھے لیے سوکھے ساکھے پھٹیچر آدمیوں اور بھانت کے لڑکوں کے کیسے ہجوم نے، اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے، سان فرانسسکو کے شریف زادے پر دھاوا بولا۔ وہ ان بھک منگوں پر مشفقانہ حقارت سے مسکرایا اور اس ہوٹل کی موٹر کی طرف، جس میں شہزادہ غالباً قیام کرنے والا تھا، قدم بڑھاتے ہوئے وہ زیرِلب کبھی انگریزی اور کبھی اطالوی میں، بڑبڑاتا رہا: ''چلو! جاؤ...''

نیپلز میں زندگی، فی الفور، ایک مقررہ معمول کے مطابق بسر ہونے لگی۔ صبح سویرے ایک اندھیری طعام گاہ میں ناشتہ چنا جاتا، جہاں ایک پتھریلے باغ کے رخ پر کھلنے والے وادریچوں سے سیلی ہوا چلتی رہتی، اور باہر آسمان ابر آلودہ اور بے رونق ہوتا اور برساتی کے دروازے پر رہنماؤں کا ایک ٹھٹ منڈلاتا۔ پھر گرم گلگوں سورج کی اولین مسکراہٹیں رونما ہوتیں اور بلندی پر معلق بالاخانے سے ایک وسیع منظر کھلتا نظر آتا: ویسوویس پیندے تک صبح کے تابندہ بخارات میں لپٹا ہوا؛ کھاڑی کا موتی سا ہلکا تموج، جس میں روپہلی جھلک؛ افق کی لکیر پر کاپری کا لطیف خاکہ، نرم چپچپے پشتے کے کنارے ننھے ننھے گدھے دو پہیوں والی بگھیاں کھینچتے ہوئے، اور بشاش اور سرکشانہ موسیقی کی لے پر کہیں کوچ کرنے والے چھوٹے سپاہیوں کے دستے۔

دن کے پروگرام میں اگلا کام تھا بلند، متعدد کھڑکیوں والی عمارات کے درمیان خلقت سے بھرے، تنگ اور گیلے چھتوں کے نیچے موٹر میں بیٹھ کر دھیرے دھیرے گھومنا۔ اس کے بعد عجائب خانوں کو جانا، جو بے جان طور پر صاف اور ہموار اور خوشگوار طرح سے روشن ہوتے، لیکن جیسے برف کی پھیلائی ہوئی مٹھی روشنی سے منور ہوں؛ پھر گرجاؤں کو جانا، جو سرد اور ہمیشہ یکساں ہوتے، جن سے موم کی بو آتی: ایک پُرشکوہ دروازہ، جس پر بوجھل چرمی پردہ پڑا ہوتا، اور اندر ایک نہایت وسیع خلا، خاموشی، پیراستہ قربان گاہ سے، جس کے پرلے سرے پر وہ کھڑے ہوتے، ہفت شاخہ شمعدانوں کی پرسکون لویں لال روشنی بکھیرتی ہوئیں، اندھیری چوبی چوکیوں میں چھپی ہوئی ایک تنہا، معمر عورت، قدموں تلے قبر کے پھسلواں پتھر اور کسی کی، حکمی طور پر مشہور، ''صلیب سے نزول۔''

ایک بجے سان مارٹینس کے پہاڑ پر لنچ کھایا جاتا، جہاں دوپہر کے وقت منتخب ترین ہستیاں اکٹھی ہوا کرتی تھیں، اور جہاں سان فرانسسکو کے شریف زادے کی بیٹی ایک مرتبہ خوشی کے مارے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی، کیونکہ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے شہزادے کو ایوان میں دیکھا، گو اخباروں کے ذریعے اسے پتا چل گیا تھا کہ وہ وقتی طور پر روم کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ پانچ بجے، ہوٹل کے ایک بجیلے دیوان خانے میں، جہاں قالینوں اور فروزاں آتشدانوں کی وجہ سے شدید گرمی ہوتی، چائے نوش کرنا معمول میں داخل تھا۔ اور پھر ڈنر کی ساعت آتی، اور گھڑیال کی زبردست، بارعب آواز دوبارہ تمام عمارت میں گونجتی، دوبارہ ریشم سرسراتا اور آئینوں میں زینوں پر چڑھنے والی، کھلے گریبانوں کی پوشاکوں میں ملبوس، خواتین کی قطاروں کا عکس پڑتا، اور شاندار محل نما ایوانِ طعام دوبارہ پُرجوش مہمان نوازی کے ساتھ کھل جاتا، موسیقاروں کے جاکٹ دوبارہ چبوترے پر سرخ سرخ دھبے نظر آتے، اور بیروں کی سیاہ شکلیں مہتمم کے گرد جمع ہوتیں، جو غیر معمولی مہارت سے، رکابیوں میں گاڑھا گلابی شوربہ انڈیلتا رہتا۔۔۔ ڈنر کا وقت دن کا نقطۂ اوج تھا، جیسا کہ ہر جگہ ہی ہوتا ہے، لوگ اس کی خاطر اس طرح لباس پہنتے جیسے کسی شادی میں جا رہے ہوں، اور کھانوں، شرابوں، معدنی پانیوں، مٹھائیوں اور پھلوں کے لحاظ سے وہ اتنا وافر ہوتا کہ رات کو گیارہ بجے کے قریب خادمائیں ہر کمرے گرم پانی کی تھیلیاں لے جایا کرتیں۔

اس سال، بہرکیف، دسمبر کا مہینہ بہت سازگار ثابت نہ ہوا۔ جب لوگ دربانوں سے موسم کے متعلق بات کرتے تو وہ بڑے خجل ہوتے، مجرمانہ اپنے کندھے جھٹکتے اور بڑبڑاتے کہ ایسا سال تو انھیں یاد نہ تھا، گو، سچ بات یہ ہے، یہ پہلا سال نہیں تھا کہ انھوں نے اس قسم کے الفاظ زیرِ لب ادا کیے ہوں، لیکن عموماً یہ بات مزید کہتے کہ حالات ہر جگہ بہت خراب تھے: ریویئرا میں غیر مثالی بارشوں اور آندھیوں کا اچانک زور ہو گیا تھا؛ ایتھنز میں برفباری ہو رہی تھی، اِعینا کا دہانہ بھی برف سے اٹ گیا تھا اور رات کو تیزی سے چمکتا تھا؛ اور یہ کہ سیاح خود کو سردی کے دورے سے بچانے کے لیے پالیرمو سے بھاگے جا رہے تھے۔

اس جاڑے میں، صبح کے سورج نے نیپلز کو روز فریب دیا؛ دوپہر کے قریب آسمان لامحالہ بھورا ہو جاتا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی، جو بتدریج تیز اور ٹھس ہوتی جاتی۔ پھر ہوٹل کی برساتی کے تاڑ گیلے

ٹین کے مانند ناگوار طرح ٹپکتے، شہر غیر معمولی طور پر گندہ اور گنجان نظر آتا اور عجائب خانے بہت بیزار کن؛ ربڑ کی برساتیاں، جو ہوا میں پروں کی طرح چپٹی ہو جاتی تھیں، پہننے والے کوچ بانوں کے سگار نا قابل برداشت طور پر بدبودار تھے اور ان کا اپنی پتلی گردنوں والے گھوڑوں کے چستی سے ہنٹر لگانا صریحاً بناوٹی تھا؛ مسافر گاڑیوں کی پٹڑیاں صاف کرنے والوں کے جوتے انتہائی خستہ حالت میں تھے؛ کیچ میں چھپ چھپ کرتی بدشکل اور چھوٹی ٹانگوں والی عورتیں بارش میں کالے کالے بال کھولے پھرتیں، اور کف آلودہ سمندر سے آنے والی سڑتی مچھلیوں کی بھکراند میں گھلی ملی سیلن تو قطعی دل شکن تھی۔ چنانچہ، سان فرانسسکو کے شریف زادے اور اس کی بیوی میں صبح صبح جھگڑے ہونے لگے؛ اور ان کی لڑکی کبھی تو پیلی پڑ جاتی اور اس کے سر میں درد ہونے لگتا، اور کبھی چاق و چوبند ہو کر ہر چیز کے متعلق جوش کا اظہار کرنے لگتی، اور ایسے موقعوں پر خوبصورت اور دلکش معلوم ہوتی۔ دل پذیر تھے وہ نرم اور پُر پیچ احساسات جو اس بے ہنگم آدمی سے ملاقات نے اس کے اندر جگا دیے تھے — وہ آدمی جس کی رگوں میں غیر معمولی خون رواں تھا — کیونکہ، بہر صورت، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون سی شے بالخصوص ایک دوشیزہ کی روح کو چھیڑتی ہے: دولت یا شہرت یا عالی نژادی۔

ہر شخص نے سیاحوں کو یقین دلایا کہ سورنیتو اور کاپری میں حالت بالکل مختلف تھی — وہاں لیموں کے درختوں پر پھول آ رہے تھے؛ وہاں گرمی بھی زیادہ تھی اور دھوپ بھی؛ اخلاق زیادہ پاکیزہ تھے اور شراب میں ملاوٹ کم ہوتی تھی — اور سان فرانسسکو کے خاندان نے اپنے تمام اثاثے سمیت کاپری روانہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے یہ منصوبہ باندھا کہ وہ سورنیتو میں سکونت اختیار کریں گے، لیکن پہلے جزیرے پر جائیں گے، ان پتھروں پر چلیں گے جن پر تبیریوس کے محل استادہ تھے، نیلے مغاک کے افسانوی عجوبے مشاہدہ کریں گے، ابروزیوں کی بیگ بانسریاں سنیں گے، جو کرسمس سے پہلے پورے جزیرے پر گھومتے اور حضرت مریم کے قصیدے گاتے پھرتے ہیں۔

روانگی کے دن — جو سان فرانسسکو کے خاندان کے لیے ایک بہت یادگار دن تھا — سورج صبح کو بھی نمودار نہ ہوا۔ ایک گہرے زمستانی کہرے نے ویسوویس کو عین تلیٹی تک ڈھانپ لیا اور سمندر کے سست تموج پر کسی نیچے بھورے پردے کے مانند آویزاں رہا اور نصف میل سے آگے

Scanned with CamScanner

سمندر قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ کاپری نظروں سے بالکل اوجھل تھا، گویا کہ اس دنیا میں وہ کبھی موجود ہی نہ تھا۔ اور جزیرے کو جانے والی دخانی کشتی اتنی شدت سے غوطے کھا رہی تھی اور اچھل رہی تھی کہ خاندان کے افراد چھوٹے دخانی کے حقیر کیبن میں، چوخانہ اونی چادروں میں ٹانگیں لپیٹے اور مالش کی وجہ سے آنکھیں بند کیے، صوفوں پر چت پڑے تھے۔ زیادہ عمر والی عورت، اپنی دانست میں، سب سے زیادہ تکلیف میں تھی؛ کئی مرتبہ اس کی طبیعت نے مالش کی، اور اسے ایسا لگا جیسے مر رہی ہو، لیکن جہاز کی خادمہ، جو بار بار اس لیے سلفچی لاتی تھی، اور بہت سال سے، گرمیوں اور جاڑوں میں، ان موجوں کے جھٹکے سہتی چلی آئی تھی، جو ہمیشہ مستعد اور ہمیشہ سب پر مہربان رہتی —— وہ محض ہنستی رہی۔ ان کی لڑکی بے انتہا زرد پڑ گئی تھی اور اس نے دانتوں میں لیموں کا قتلہ دبا رکھا تھا۔ شہزادے سے سورنیتو میں، جہاں اس کا کرسمس پر آنے کا ارادہ تھا، غیر متوقع ملاقات کی امید تک اسے خوش نہ کر سکی۔ سان فرانسسکو کے شریف زادے نے، جو بھورا اوورکوٹ اور بڑی ٹوپی پہنے چت لیٹا تھا، راستے بھر زبان نہ کھولی۔ اس کا چہرہ کالا اور مونچھیں سفید ہوتی گئیں، اور اس کا سر بہت زور سے دکھ رہا تھا؛ گزشتہ چند روز سے، خراب موسم کی وجہ سے، وہ شام کو بہت زیادہ شراب پیتا رہا تھا۔

اور بارش کھڑکی کے کھڑکھڑاتے شیشوں سے برابر ٹکراتی رہی، اور پانی وہاں سے ٹپک ٹپک کر صوفوں پر گرتا رہا؛ چنگھاڑتی ہوا مستولوں پر جھپٹتی رہی اور کبھی کبھار، تند تلاطم کی مدد سے، چھوٹے دخانی کو پہلو پر لٹا دیتی اور پھر نچلے حصے میں کوئی شے کھڑکھڑ کرتی ہوئی اِدھر اُدھر لڑھکتی۔

جتنی دیر دخانی کاستیلا اور سورنیتو میں لنگر انداز رہا، کیفیت زیادہ دلکشا ثابت ہوئی؛ لیکن وہاں بھی جہاز بری طرح ڈولتا رہا اور ساحل اپنے تمام کڑاڑوں، باغوں اور صنوبروں، گلابی اور سفید ہوٹلوں اور گھونگھریالی ہریالی سے ڈھکے دھندلے پہاڑوں سمیت اوپر نیچے ہوتا رہا، جیسے جھولے پر دھرا ہو۔ کھویا کشتیاں دخانی کے پہلوؤں سے ٹکراتیں، ملاح اور عرشے کے مسافر گلے پھاڑ پھاڑ کر چلاتے اور کہیں ایک بچہ اس طرح چیختا جیسے اس کے بیچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوئے جا رہے ہوں۔ دروازے میں سے بھیگی ہوا آ رہی تھی اور ہوٹل رائل کا جھنڈا اڑانے والے ڈھلملاتے بجرے سے ایک لونڈا سیاحوں کو مدعو کرتا ہوا، بغیر تھکے چلا رہا تھا: ''کویال! ہوٹل کویال...'' اور سان فرانسسکو کے شریف زادے نے اس بوڑھے آدمی کی طرح، جو وہ تھا، محسوس کیا۔ اور اس نے ان تمام ''رائل'' اور ''ایکسلسیئر''

ہوٹلوں اور ان تمام لہسن کی بو دینے والے، حریص کھٹملوں کے، جنھیں اطالوی کہا جاتا ہے، بارے میں، سوچا تو بیزاری اور خصومت کے ساتھ۔ ایک مرتبہ، دخانی کے ایک قیام کے دوران میں، آنکھیں کھولنے اور صوفے سے آدھا اٹھنے کے بعد اس چٹانی ساحل کے سائے میں، کشتیوں، چیتھڑوں، ٹین کے ڈبوں اور بھورے جالوں کے نزدیک، حقیر اور یکسر پھپھوندے ہوئے پتھریلے کھنڈلوں کا ایک ڈھیر دیکھا، جو پانی کے قریب تلے اوپر بنے تھے — اور جب اسے یاد آیا کہ یہی تو وہ اطالیہ ہے جس سے لطف اٹھانے کے لیے وہ آیا تھا، تو اس نے بڑی نومیدی محسوس کی۔ آخر کار، جھٹپٹے کے وقت، جزیرے کا سیاہ تودہ قریب آتا گیا، جیسے اس کے پیندے میں لال آگوں نے بل کھود دیے ہوں۔ ہوا زیادہ نرم اور گرم اور خوشبودار ہوتی گئی؛ کالے تیل کی طرح لہلہلاتی ہوئی مسکین موجوں پر عرشے کی لالٹینیں بڑے بڑے سنہرے سانپ بہا رہی تھیں... پھر، یکایک، لنگر گڑگڑایا اور چھپاک سے پانی میں ڈوب گیا، فضا کشتی بان کی جھلی چیخ پکار سے معمور ہو گئی — اور فی الفور ہر شخص کے دل کو چین آ گیا۔ کیبن کی برقی روشنیاں اور تیز ہو گئیں اور کھانے پینے، تمباکو نوشی اور چلنے پھرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ دس منٹ بعد سان فرانسسکو کے خاندان نے خود کو ایک بڑی گھاٹ ناؤ میں پایا؛ پندرہ منٹ بعد وہ گودی کے پتھروں پر چل رہے تھے، اور پھر وہ ایک چھوٹی، روشن موٹر میں بیٹھ گئے جو، بھنبھناتی ہوئی، ڈھلان پر چڑھنے لگی اور ساتھ ہی تاکستانی بلیاں، نیم شکستہ سنگی چہار دیواروں اور تر بتر ٹیڑھے میڑھے لیموں کے پیڑ، جن پر کہیں کہیں چھپروں کا سایہ تھا، اپنے جھلملاتے نارنگی رنگ کے اثمار اور گھنے، چمکیلے پتوں سمیت موٹر کی کھلی کھڑکیوں میں نیچے سرکتے نظر آ رہے تھے... برکھا کے بعد اطالیہ کی دھرتی سے سوندھی خوشبو آتی ہے اور اس کے ہر جزیرے کی اپنی بو باس ہے۔

اس شام کو کاپری کا دیپ اندھیرا اور رسمسا تھا لیکن، جیسا کہ دخانی کی آمد پر ہمیشہ ہوتا تھا، اس میں کچھ دیر کے لیے، جا بجا جان اور شگفتگی آ گئی۔ سان فرانسسکو کے شریف زادے کا مناسب طور پر استقبال کرنا جن کا فرض تھا، اُن کی بھیڑ پہاڑی کی چوٹی پر واقع کیبل کار کے اسٹیشن پر پہلے ہی سے موجود تھی۔ باقی ماندہ سیاح بمشکل کسی توجہ کے مستحق تھے۔ وہاں چند ایک روسی تھے جو کاپری میں آباد ہو گئے تھے؛ پریشان وضع، کھوئے کھوئے، اپنے کتابی خیالوں میں محو، عینک لگائے، ڈاڑھی بڑھائے، کپڑے کے اوور کوٹوں کے کالر اٹھائے۔ وہاں گول سروں، لمبی گردنوں، لمبی ٹانگوں والے،

Scanned with CamScanner

تر ولی پوشاکوں میں ملبوس، جرمن جوانوں کی ٹولی بھی تھی، جن کی کمر پر سوتی تھیلے پڑے تھے، جنھیں کسی کی خدمات کی حاجت نہیں ہوتی، جو ہر جگہ چین سے رہ لیتے ہیں اور اخراجات کے معاملے میں کسی طرح سے کشادہ دل نہیں ہوتے۔ سان فرانسسکو کے شریف زادے کو، جو روسیوں اور جرمنوں دونوں سے سکوت آمیزانہ الگ تھلگ تھا، فوراً دیکھ لیا گیا۔ اسے اور اس کی عورتوں کو جلدی جلدی موٹر سے اتارا گیا، ایک آدمی راستہ دکھانے کے لیے ان کے آگے آگے بھاگنے لگا، اور انھیں دوبارہ لڑکوں اور کاپری کی ان ٹھگنی موٹی کسان عورتوں نے گھیر لیا جو متمول مسافروں کے صندوق اور بیگ سر پر رکھ کر لے جاتی ہیں۔ ان کے منے، چوبی پائنچے چھوٹے چوک کے کھڑنجے پر کھڑکتے، جو تقریباً کسی اوپیرا کا چوک معلوم ہو رہا تھا اور اس کے اوپر ایک برقی لالٹین بھیگی ہوا میں ہل رہی تھی۔ بالکوں کی ٹولیاں چڑیوں کی طرح سیٹیاں بجا کر قلابازیاں کھا رہی تھیں، اور جب سان فرانسسکو کا شریف زادہ ان کے درمیان سے گزرا تو یہ سب اسے ایک ناٹکی منظر معلوم ہوا: پہلے وہ ایک طرح کے قرونِ وسطیٰ کے محرابی دروازے اور گھچ پچ مکانوں کے نیچے سے، اور پھر ایک ڈھلواں گونج دار کوچے سے گزرا، جو ہوٹل کے روشنی میں غرق دروازے کی جانب جاتا تھا۔ بائیں طرف ایک تاڑ نے اپنا گچھا یکسار چھتوں سے بلند کر رکھا تھا، اور بہت بلندی پر نیلے ستارے سیاہ آسمان میں روشن تھے اور دوبارہ یہ محسوس ہوا جیسے بحرِ روم میں اپنے پتھر یلے جزیرے پر وہ چھوٹا نمناک اور سنگی شہر سان فرانسسکو کے مہمانوں کی تعظیم کے لیے بیدار ہوا تھا؛ جیسے انھی کی خاطر ہوٹل کا مالک اتنا خوش اور تبسم پاش تھا؛ جیسے چینی گھڑیال، جس نے ان کے پیش کمرے میں قدم دھرتے ہی تمام منزلوں پر ڈنر کی منادی کر دی تھی، صرف انھی کا منتظر تھا...

مالک نے، جو ایک خوش وضع جوان آدمی تھا، شائستہ اور پُر نفاست کورنش کے ساتھ مہمانوں کا استقبال کیا اور ایک لمحے کو سان فرانسسکو کے شریف زادے کو چونکا دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سان فرانسسکو کے شریف زادے کو یکلخت یاد آ گیا کہ گزشتہ رات، اس کی نیند میں خلل انداز ہونے والے دیگر پراگندہ خوابوں کے ساتھ، اس نے اسی آدمی کو دیکھا تھا۔ اس کا خواب ہوٹل کے مالک سے ہو بہو مشابہ تھا: وہی چہرہ، ویسے ہی چمکیلے اور بڑی احتیاط سے بنے ہوئے بال، اور اس نے وہی فراک کوٹ مع گول پشواز پہن رکھا تھا۔ حیران ہو کر، وہ ایک لمحے کے لیے قریب قریب ٹھٹک گیا۔ لیکن اس کے

Scanned with CamScanner

دل میں چونکہ اس چیز کا جسے تصوف کہتے ہیں، رائی برابر وجود بھی نہ تھا، اس کا استعجاب فوراً ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہوٹل کی غلام گردش سے گزرتے ہوے، اس نے مزاحاً خواب اور حقیقت کے اس عجیب انطباق کا اپنی بیوی اور بیٹی سے ذکر کیا۔ فقط اس کی لڑکی نے گھبرا کر اس پر نظر ڈالی، آرزو نے یکایک اس کا دل مسوس دیا اور اس پراسرار اور تاریک جزیرے پر تنہائی کا ایسا شدید احساس اس پر غالب آ گیا کہ وہ تقریباً رو پڑی۔ لیکن، ہمیشہ کی طرح، اس نے باپ سے اپنے احساس کے متعلق کچھ نہ کہا۔

ایک بلند مرتبہ شخصیت — کوئی شاہ سیزدہم، جس نے پورے تین ہفتے کاپری پر گزارے تھے — ابھی ابھی جزیرے سے رخصت ہوا تھا اور سان فرانسسکو سے وارد مہمانوں کو ان کمروں میں ٹھہرا دیا گیا جن میں وہ مقیم تھا، اور سب سے حسین اور پربین خادمہ، جو کہ بلجیم کی تھی، ان پر مامور کر دی گئی، جس کی گات سما کچے نے چست اور چھریری بنا دی تھی اور کلف لگی ٹوپی چھوٹے دندانے دار تاج سے مشابہ تھی؛ اور انھیں یہ عنایتِ خاص حاصل ہوئی کہ ہوٹل کا سب سے خوش وضع اور جسیم باوردی ملازم، جو سانولا، لال آنکھوں والا صقلیوی تھا، اور سب سے پھرتیلا بیرا، پست قد اور تگڑا لوبجی، جو بلا کا لطیفہ گو تھا اور زندگی میں بہت سے کام کر چکا تھا، ان کی خدمت میں حاضر رہیں۔ پھر ہوٹل کے مہتمم نے، جو فرانسیسی تھا، امریکی شریف زادے کے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ وہ یہ دریافت کرنے آیا تھا کہ صاحب اور بیگمات ڈنر تناول فرمائیں گی یا نہیں اور اگر تناول فرمائیں گی، جس کے بارے میں اسے شبہ نہ تھا، تو یہ اطلاع دینے کہ اس وقت کھانے پر جھینگا مچھلی، بریاں بیف، اسفراج، منال وغیرہ موجود تھے۔

سان فرانسسکو کے شریف زادے کے پیروں تلے فرش ابھی تک ہل رہا تھا — واہیات اطالوی دخانی نے اس کی طبیعت اتنی بگاڑ دی تھی — تاہم اس نے آہستگی سے، گو بے ڈھنگی طرح، اس کھڑکی کو بند کیا جو مہتمم کے داخل ہونے پر کھٹ سے کھل گئی تھی اور دور باورچی خانے اور باغ کے گیلے پھولوں کی باس اندر لا رہی تھی، اور آہستہ، واضح آواز میں جواب دیا کہ وہ کھانا کھائیں گے، ان کی میز دروازے سے پرے ہٹ کر رکھی جانی چاہیے، اور وہ مقامی شراب اور شیمپین، جو معتدل طور پر روکھی اور بس یونہی سی ٹھنڈی ہو، پییں گے۔ مہتمم نے مختلف الحان میں مہمان کے الفاظ پر صاد کیا، جس کے معنی، بہرحال، صرف یہ تھے: اس میں کوئی شبہ ہے، نہ ہو سکتا ہے، کہ سان فرانسسکو کے شریف

Scanned with CamScanner

زادے کی خواہشیں صائب ہیں، اور ہر کام اس کے الفاظ کے عین مطابق کیا جائے گا۔ آخر کار اس نے سر جھکایا اور ملائمت سے دریافت کیا: ''بس، جناب؟''

اور جواب میں ایک آہستہ ''ہاں'' سن کر اس نے مزید کہا کہ آج گیوپے اور کارمیلا، جن سے تمام اطالیہ اور ''سیاحوں کا تمام جہان'' آشنا تھا، ان کے یہاں ڈیوڑھی میں تارنتیلا ناچیں گے۔

''میں نے مصور پوسٹ کارڈوں پر کارمیلا کو دیکھا ہے،'' سان فرانسسکو کے شریف زادے نے ایسے لہجے میں کہا جس سے کسی بات کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ ''اور یہ گیوپے، یہ اس کا شوہر ہے؟''

''رشتے کا بھائی ہے، جناب'' مہتمم نے جواب دیا۔

سان فرانسسکو کا شریف زادہ، بظاہر کسی بات پر غور کرتا ہوا، ذرا دیر کو اٹکا، لیکن کچھ نہ بولا اور پھر اس نے مہتمم کو سر کے اشارے سے رخصت کر دیا۔

پھر اس نے، گویا کسی شادی کے لیے، تیاریاں شروع کیں: اس نے تمام برقی قمقمے جلا دیے اور آئینوں کو روشنی کے عکسوں اور فرنیچر کی چمک سے معمور کر دیا اور صندوق کھولے؛ اس نے منہ ہاتھ دھونا اور شیو کرنا شروع کیا؛ اور اس کی گھنٹی کی آواز منٹ منٹ بعد غلام گردش میں سنائی دیتی تھی، جس میں اس کی بیوی اور بیٹی کے کمروں سے آنے والی بے قرار طلبیاں مخلوط ہو رہی تھیں۔ لوئیجی نے، جو سرخ پیش بند پہنے ہوئے تھا، اس اطمینان کے ساتھ جو جسیم آدمیوں کا خاصا ہوتا ہے، خادماؤں کو، جو کھپرے کی بالٹیاں لیے لپکی جا رہی تھیں، منہ چڑا چڑا کر اتنا ہنسایا کہ ان کے آنسو نکل آئے۔ وہ قلابازیاں کھاتا ہوا دروازے تک پہنچا اور انگلیوں کے جوڑوں سے دستک دے کر بناوٹی کم ہمتی اور ایسی خوشامد آمیزی سے، جسے وہ احمقانہ رنگ دینا چاہتا تھا، پوچھنے لگا:

''ہا سوناتا، سنیورے؟'' (گھنٹی آپ نے بجائی تھی، جناب؟)

اور دروازے کے پیچھے سے ایک ہلکی، کرخت، اہانت آمیز طور پر خلیق آواز نے جواب دیا، ''ہاں، اندر آؤ۔''

سان فرانسسکو کے شریف زادے نے اس شام کو، جو اس کے لیے دائماً یادگار تھی، کیا سوچا اور کیا محسوس کیا؟ صاف کہہ دینا چاہیے کہ کوئی غیر معمولی بات قطعاً نہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز بہت آسان نظر آتی ہے۔ اگر وہ دل میں کوئی عمیق جذبہ، کوئی پیش آگاہی، کہ کچھ ہونے والا

ہے، محسوس بھی کرتا تو یہی سوچتا کہ وہ اتنی جلدی، کم از کم فوراً واقع نہ ہوگا۔ مزید برآں، جیسا کہ روگ دور ہونے کے بعد عموماً ہوتا ہے، اسے بہت بھوک لگ رہی تھی اور وہ حقیقی مسرت کے ساتھ شوربے کے پہلے چمچے اور شراب کے پہلے گھونٹ کا امیدوار تھا۔ لہٰذا لباس پہننے کے معہودہ عمل کو اس نے ایسی برانگیختگی کے عالم میں انجام دیا جس میں سوچ بچار کا کوئی موقع نہ تھا۔

شیو کرنے، ہاتھ منہ دھونے اور چند نقلی دانت چابکدستی سے اپنی اپنی جگہ لگانے کے بعد اس نے، آئینے کے روبرو کھڑے ہوکر، اپنے بچے کھچے موتیوں جیسے رنگ کے بال تر کر کے اپنی گندمی زرد چندیا پر جما لیے۔ پھر اس نے، کچھ کھینچا تانی کے بعد دودھ جیسے ریشم کی ایک چست زیر قمیص پہنی جو اس کے ادھیڑ، بگڑے بدن پر، جس کی کمر بسیار خوری کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی، تنگ تھی؛ اور خشک پیروں میں لک کے رقصی جوتے اور کالی ریشمی جرابیں پہنیں۔ دوزانو بیٹھ کر اس نے اپنی سیاہ پتلون ٹھیک کی اور سخت کالر کے نیچے اگلے بٹن کو ٹھونسنے کا پُر اذیت کام شروع کیا۔ اس کے قدموں تلے فرش اب بھی ہل رہا تھا، اس کی انگلیوں کے سرے بری طرح دُکھ رہے تھے اور بٹن کبھی کبھی کنٹھ کے نیچے کے گڑھے کی پچپچی کھال میں زور سے چبھ جاتا تھا، لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور آخر — جب اس کی آنکھیں اس زور آزمائی کی وجہ سے چمکنے لگیں اور گردن کو بھینچنے والے تنگ کالر سے چہرہ نیلا پڑ گیا — مشکلات پر قابو پا ہی لیا، اور تھکن سے بالکل چور ہوکر وہ دریچوں کے درمیان لگے ہوئے آئینے کے سامنے بیٹھ گیا، اس کی صورت کے عکس کی تمام آئینوں میں تکرار ہوتی رہی۔

"یہ بلا کا ہے!" وہ اپنا مضبوط، گنجا سر جھکا کر اور یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتے ہوئے کہ بلا کا تھا کیا، بڑبڑایا۔ پھر ایک محتاط اور معہودہ حرکت کے ساتھ، اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کا، جن کے جوڑوں میں گٹھیا سے گھٹے پڑے ہوئے تھے، اور ان کے بڑے، محدب اور بادامی ناخنوں کا جائزہ لیا اور یقین کے ساتھ دہرایا: "یہ بلا کا ہے!"

لیکن یہاں دوسرے گھڑیال کی گمک دار آواز، جیسے کسی دیوتی معبد میں، تمام گھر میں گونج گئی اور جلدی سے اٹھنے کے بعد، سان فرانسسکو کے شریف زادے نے ٹائی کو کالر پر اور بھی تنگ اور چست کر لیا اور توند کو ایک تنگ واسکٹ کی مدد سے سنبھالا، ڈنر کوٹ پہنا، کف ٹھیک کیے اور آخری دفعہ آئینے میں اپنا معائنہ کیا۔۔۔ اسے خیال آیا: یہ دہکتی ہوئی آنکھوں والی کارمیلا، جو کسی دوغلی کی طرح

چمپئی تھی، اور خیرہ کن لباس پہنتی تھی جس میں نارنجی رنگ کا پلا بھاری تھا، ضرور غیر معمولی رقاصہ ہو گی؛ اور اپنے کمرے سے خوش خوش نکل کر، قالین پر چلتا ہوا، بیوی کے کمرے تک گیا اور بلند آواز میں پوچھنے لگا کہ کیا وہ دیر سے آئیں گی۔

''پانچ منٹ میں، ابا،'' ایک لڑکیوں جیسی آواز نے خوش دلی سے اور شادمانہ جواب دیا۔ ''میں بالوں میں کنگھی کر رہی ہوں۔''

''بہت بہتر،'' سان فرانسسکو کے شریف زادے نے جواب دیا۔

اور لڑکی کے شانوں پر پریشان حیرت انگیز بالوں کے متعلق سوچتا ہوا وہ، کتب خانے کی تلاش میں، دھیرے دھیرے غلام گردشوں اور زینوں سے، جن پر سرخ مخملیں قالین بچھے ہوئے تھے، گزرتا گیا۔ جو خدام اسے ملتے وہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاتے اور وہ ان کے پاس سے ایسے گزر جاتا جیسے انھیں دیکھا ہی نہیں۔ ضعیفی کی وجہ سے خمیدہ ایک معمر خاتون، جسے ڈنر کو دیر ہو گئی تھی، جس کے بال دودھ کی طرح سفید تھے، لیکن گلا کھلا ہوا تھا، ہلکا بھورا ریشمی لباس پہنے، پوری رفتار سے اڑی جا رہی تھی، لیکن وہ ایک مضحک، مرغیوں جیسے انداز سے، مٹک مٹک کر چل رہی تھی اور وہ بڑی آسانی سے اس سے آگے نکل گیا۔ کمرۂ طعام کے شیشے کے دروازے کے سامنے، جہاں مہمانوں نے ابھی سے جمع ہو کر کھانا پینا شروع کر دیا تھا، وہ ایک میز کے پاس رکا جو دیا سلائیوں کے بکسوں اور مصری سگریٹوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی، اور ایک بڑا نیلا سگار اٹھا کر میز پر تین لیرے ڈال دیے۔ زمستانی برآمدے میں اس نے کھلے دریچے سے جھانکا۔ دھیمی ہوا کی رو اندھیرے سے اس تک پہنچی؛ دور پرے پرانے تاڑ کی پھننگ سامنے پھیلی نظر آئی، جس کی ٹہنیاں ستاروں کے درمیان پسری ہوئی تھیں اور دیو پیکر نظر آ رہی تھیں؛ اور سمندر کا بعید اور یکساں شور کان میں پڑا۔ آرام دہ اور پرسکون کتب خانے میں گول رو پہلے کمانچے کا چشمہ لگائے ایک دیوانی، متحیر آنکھوں والا جرمن کھڑا ایک اخبار کے سرسراتے صفحے پلٹ رہا تھا۔ اس پر سرد مہرانہ نظر ڈالنے کے بعد سان فرانسسکو کا شریف زادہ ایک ہرے ٹوپ سے ڈھکے لیمپ کے نزدیک گہری چرمی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور بینی گیر چشمہ لگا کر، کالر کی وجہ سے، جو اس کا گلا دبا رہا تھا، سر جھٹکتے ہوئے، خود کو ایک اخبار کے پیچھے چھپا لیا۔ اس نے چند سرخیوں پر نظر ڈالی، لامتناہی بلقانی جنگ کی بابت چند سطور پڑھیں اور ایک معہودہ جنبش سے صفحہ

Scanned with CamScanner

الٹا۔ یکا یک سطریں ایک شیشہ آسا چمک سے جگمگا اٹھیں، اس کی گردن کی رگیں پھول گئیں، آنکھیں ابل پڑی، بینی گیر ناک سے گر گیا... وہ آگے کو جھپٹا، اس نے ہوا نگلنی چاہی اور ایک وحشیانہ، کھڑکھڑاتا شور کیا؛ اس کا نچلا جبڑا ڈھلک گیا، ڈھلک کر کندھے سے آلگا اور کانپنے لگا، قمیص کا سامنے کا حصہ پھول گیا اور، سارا بدن تڑپتا ہوا، ایڑیاں قالین میں الجھتی ہوئیں، آہستہ آہستہ ایک غیر مرئی دشمن سے بے جگرانہ کشمکش کرتا ہوا، فرش پر آ رہا۔

اگر وہ جرمن کتب خانے میں موجود نہ ہوتا تو اس ہولناک سانحے کو بڑی صفائی اور تعجیل سے دبا دیا جاتا۔ وہ سان فرانسسکو کے شریف زادے کو ترت پھرت کسی دور گوشے میں لے جاتے — اور کسی مہمان کو اس واقعے کی خبر نہ ہوتی۔ لیکن جرمن کتب خانے سے چیخیں مارتا ہوا برآمد ہوا اور اس نے تمام ہوٹل میں کھلبلی ڈال دی اور بہت سے لوگ، کرسیاں الٹتے ہوئے، کھانے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعض کا رنگ فق ہو گیا، وہ غلام گردشوں کے راستے کتب خانے کی طرف دوڑے اور یہ سوال، جسے کئی زبانوں میں پوچھا جا رہا تھا، سنا گیا: ''کیا ہے، کیا بات ہو گئی؟'' اور کوئی اس سوال کا جواب نہ دے سکا، کوئی کچھ نہ سمجھا، کیونکہ آج تک انسانوں کو سب سے زیادہ تعجب موت پر ہوتا ہے اور اس پر یقین کرنے سے وہ سب سے زیادہ قطعی طور پر انکار کرتے ہیں۔ ہوٹل کا مالک دوڑ دوڑ کر ایک کے بعد دوسرے مہمان کے پاس جا رہا تھا اور جو لوگ بھاگ رہے تھے انھیں روکنے اور یہ کہہ کر عاجلانہ یقین دلا کر مطمئن کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی بات نہ تھی، بالکل معمولی سا معاملہ تھا، بے ہوشی کا ذرا سا دورہ جو سان فرانسسکو کے ایک شریف زادے کو پڑ گیا تھا۔ لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی اور بہت سوں نے دیکھا کہ باوردی ملازم اور بیروں نے کس طرح شریف زادے کی ٹائی، کالر، واسکٹ، شام کا شکن آلودہ کوٹ اور — کسی واضح وجہ کے بغیر — اس کے سیاہ ریشم میں ملبوس پیروں سے رقصی جوتے تک اتار پھینکے۔ اور وہ تڑپتا ہی رہا۔ وہ ہٹ دھرمی سے موت سے کشمکش کرتا رہا۔ وہ اس دشمن سے ہار نہ ماننا چاہتا تھا جو اس پر اتنے غیر متوقع اور ناشائستہ طور پر حملہ آور ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر جھٹکا، کسی گلو گرفتہ کے مانند خرخراتی آوازیں نکالیں اور کسی مدہوش کی طرح پتلیاں چڑھا لیں۔ جب اسے جلدی جلدی کمرہ نمبر تینتالیس میں لا کر — جو زیریں غلام گردش کے سرے پر سب سے چھوٹا، بدترین، سب سے مرطوب اور سرد ترین کمرہ تھا — بستر پر ڈال دیا گیا، تو اس کی لڑکی بھاگی ہوئی آئی،

Scanned with CamScanner

اس کے بال کندھوں پر پریشان، ڈریسنگ گون کے حاشیے کھلے ہوئے اور برہنہ چھاتیاں سماکچے کی وجہ سے اوپر کو اٹھی ہوئیں۔ پھر اس کی بیوی آئی، چوڑی چکلی اور بھاری، جس نے ڈنر کا تقریباً سارا لباس پہن لیا تھا اور اس کا منھ دہشت کے مارے کھلا ہوا تھا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر ہوٹل کی فضا دوبارہ بخوبی سنور گئی، لیکن وہ شام ناقابلِ تلافی طور پر خراب ہو چکی تھی۔ کچھ سیاحوں نے کمرۂ طعام میں آ کر کھانا ختم کیا، لیکن وہ چپ چاپ رہے اور یہ عیاں تھا کہ انھوں نے حادثے کو ذاتی توہین تصور کیا ہے۔ اور مالک، بے بس اور مناسب جھلاہٹ کے مارے کندھے اچکاتا اور ایک ایسے آدمی کی طرح محسوس کرتا ہوا جسے بغیر کسی گناہ کے ظلم کا نشانہ بنایا گیا ہو، ایک مہمان سے دوسرے مہمان کے پاس جا کر ان سب کو یہ یقین دلا رہا تھا کہ وہ بہت اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ''یہ کتنا ناخوشگوار ہے،'' اور وعدہ کر رہا تھا کہ اس مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے ان تمام ''تدبیروں سے کام لوں گا جو میرے اختیار میں ہیں۔'' اس کے باوجود تارنتیلا کو ملتوی کرنا ضروری سمجھا گیا۔ غیر ضروری برقی قمقمے گل کر دیے گئے، بیشتر مہمان بیئر خانے چلے گئے اور ہوٹل میں اتنا سناٹا ہو گیا کہ پیش کمرے میں رکھی ہوئی گھڑی کی ٹک ٹک صاف سنی جا سکتی تھی، جہاں ایک تنہا طوطا اپنے پنجرے میں کلبلاتا اور پنجوں سے بالائی چکس کو انتہائی مہمل طریقے سے پکڑ کر سونے کی کوشش کرتا ہوا، اپنے تاثر سے خالی انداز میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

سان فرانسسکو کا شریف زادہ ایک سستے آہنی پلنگ پر، کھردرے اونی کمبلوں کے نیچے، دراز تھا۔ چھت میں جڑے ایک واحد گیس فروز کی مدھم جوت اس پر پڑ رہی تھی۔ اس کے سینے اور سرد ماتھے پر برف کی تھیلی پھیری جا رہی تھی۔ اس کا سیاہ اور ابھی سے بے جان چہرہ بتدریج ٹھنڈا پڑتا گیا؛ اس کے سونے بھرے دانتوں کی جھلملاہٹ سے روشن منھ سے ادا ہونے والا کرخت، گھرّاتا شور دھیرے دھیرے ہلکا ہوتا گیا۔ ان انوکھی آوازوں کو سان فرانسسکو کا شریف زادہ نہیں نکال رہا تھا — وہ تو اب تھا ہی نہیں؛ کوئی اور ایسا کر رہا تھا۔ اس کی بیوی اور بیٹی ڈاکٹر اور نوکر کھڑے ہوئے اسے سرد مہرانہ گھور رہے تھے۔ یکایک وہ بات، جس کی انھیں توقع اور ڈر تھا، پیش آ گئی: خرخراہٹ کی آواز تھم گئی اور آہستہ آہستہ، ہر شخص کی نظروں کے سامنے، مردہ آدمی کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی اور اس کے نقوش باریک تر اور زیادہ تر نورانی ہوتے گئے؛ ایک ایسے حسن کی بدولت حسین، جو اس پر پھبتا

Scanned with CamScanner

تھا، جس سے اس نے مدتوں پہلو بچایا تھا...

مالک اندر آیا۔ ''ختم ہو گیا ہے،'' ڈاکٹر نے زیرِلب اس سے کہا۔ مالک نے بے اعتنائی سے کندھے جھٹکے۔ معمر عورت، جس کے رخساروں پر آنسو دھیرے دھیرے بہہ رہے تھے، اس کے نزدیک آئی اور ڈرتے ڈرتے بولی کہ اب متوفی کو اس کے کمرے میں لے جانا چاہیے۔

''ارے نہیں، مادام!'' مالک نے خلیقانہ، لیکن کسی ملاطفت کے بغیر اور انگریزی کی بجائے فرانسیسی میں، جواب دیا۔ اسے اس حقیر رقم سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی جو سان فرانسسکو سے آنے والے مہمان اب اس کے خزانچی کو ادا کر سکتے تھے۔ ''یہ بالکل ناممکن ہے،'' اس نے کہا اور بطور توضیح مزید عرض کیا کہ یہ ہوٹل اس کی نظر میں بہت قیمتی تھا اور اگر اس نے مادام کی خواہش پوری کر دی تو یہ بات تمام کاپری میں مشہور ہو جائے گی اور سیاح وہاں آنا چھوڑ دیں گے۔

لڑکی، جو اسے عجیب طرح سے دیکھ رہی تھی، بیٹھ گئی اور منہ میں رومال رکھ کر رونے لگی۔ اس کی ماں کے آنسو فوراً خشک ہو گئے اور چہرہ تمتما اٹھا۔ اس نے، اپنی زبان بولتے ہوئے، آواز بلند کی اور مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ اسے ابھی تک یہ احساس نہ ہوا تھا کہ وہ اپنا وقار بالکل کھو چکی ہے۔ مالک نے، شائستہ وقار کے ساتھ، اس کی بات کاٹ دی: ''اگر مادام کو اس ہوٹل کا دستور پسند نہیں تو وہ اسے یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔'' اور اس نے قطعی طور پر سنا دیا کہ میت اسی دن، صبح کے وقت، ہوٹل سے چلی جانی چاہیے۔ پولیس کو مطلع کر دیا گیا ہے اور ایک گماشتہ فوراً آئے گا اور تمام ضروری کارروائیوں سے نبٹ لے گا۔ مادام پوچھتی ہیں: کیا یہ ممکن ہے کہ کاپری میں اور کچھ نہیں تو ایک سادہ تابوت ہی مل جائے؟ بدقسمتی سے یہ ممکن نہیں، اور جہاں تک تیار کروانے کا تعلق ہے، اتنا وقت نہیں ہوگا۔ اس مسئلے کو کسی اور ہی طرح حل کرنا پڑے گا۔۔۔ مثال کے طور پر، اس کے پاس انگریزی سوڈا واٹر بڑے، مستطیل بکسوں میں آتا ہے۔۔۔ کسی ایسے بکس میں سے خانے نکالے جا سکتے ہیں...

رات کے وقت تمام ہوٹل سو گیا۔ ایک بیرے نے نمبر تینتالیس کی کھڑکی کھول دی — وہ باغ کے ایک گوشے پر کھلتی تھی جہاں ایک بلند سنگی دیوار کے سائے میں، جس پر ٹوٹی کانچ جڑی ہوئی تھی، کیلے کا ایک روگی درخت کھڑا تھا — بجلی کی روشنی بجھائی، دروازہ مقفل کیا اور چلا گیا۔ متوفی اندھیرے میں تنہا رہ گیا۔ نیلے ستاروں نے کالے آسمان سے نیچے اس کی طرف دیکھا۔ دیوار میں جھینگر نے اپنا

Scanned with CamScanner

غمگین، نچنت راگ شروع کر دیا۔ دھندلی سی روشن غلام گردش میں دو نوکرانیاں کھڑکی کی چوکھٹ پر بیٹھی کچھ درست کر رہی تھیں۔ پھر لوبجی، بازو پر کپڑوں کا ڈھیر ڈالے، چپل پہنے، وہاں آیا۔

''اتنی جلدی!'' اس نے غلام گردش کے سرے پر واقع ہولناک دروازے پر آنکھیں جما کر نائکی سرگوشی میں پوچھا، جیسے بڑا فکر مند ہو، اور اسی سمت میں اپنا خالی ہاتھ ہلا کر آہستہ سے پکارا: ''چلا گیا!'' جیسے کسی ریل گاڑی کو جاتے دیکھ رہا ہو — اور نوکرانیوں نے، بے صدا ہنسی کے مارے دم بستہ ہو کر، ایک دوسرے کے کندھوں پر سر ٹیک دیے۔

پھر پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا، وہ بھاگ کر دروازے تک گیا، اسے ہلکے سے کھٹکھٹایا اور اپنا کان لگا کر گھٹے گھٹے لہجے میں انتہائی خوشامدانہ انداز سے پوچھا: ''حضور نے بلایا؟''

اور اپنا گلا سکیڑ کر اور نچلا جبڑا آگے کو بڑھا کر اس نے خود ہی، گویا دروازے کی دوسری طرف سے پچھی کھنچی کرخت اور اداس آواز میں جواب دیا، ''ہاں، اندر آؤ...''

صبح کے وقت، جب کمرہ نمبر تینتالیس میں کھڑکی کے شیشے سفید ہو گئے اور کیلے کے درخت کے پتوں میں سیلی ہوا سرسرائی، جب صبح کا پھیکا نیلا آسمان نمودار ہو کر کاپری پر تن گیا اور سورج نے اطالیہ کے دور افتادہ کوہساروں کے پیچھے سے طلوع ہو کر، مونتے سولارو کی پاک اور صاف طور پر کشیدہ چوٹی کو سنہرا رنگ دیا، جب راج، جو جزیرے پر سیاحوں کے لیے پگڈنڈیوں کی مرمت کرتے تھے، اپنے کام پر روانہ ہوئے، تو ایک مستطیل بکس کمرہ نمبر تینتالیس میں لایا گیا۔ جلد ہی وہ بہت بھاری ہو گیا اور نائب دربان کے گھٹنوں کو اذیت ناک طور پر دبانے لگا، جو اسے ایک گھوڑے کی گاڑی پر رکھوا کر ڈھلانوں پر، سنگی چہار دیواریوں اور انگوری باغوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی ساحل تک جانے والی سفید سڑک پر جا رہا تھا۔ بسیار نوشی کی وجہ سے گاڑی بان کا سر ڈکھ رہا تھا — وہ سرخ آنکھوں والا بیمار سا آدمی تھا اور چھوٹی آستینوں والا پرانا کوٹ اور گھسے گھسائے جوتے پہنے ہوئے تھا؛ رات بھر اس نے بھٹیار خانے میں جوا کھیلا تھا — اور وہ اپنے چست چھوٹے گھوڑے پر برابر ہنٹر برسا رہا تھا۔ صقلیوی رواج کے مطابق، جانور سامانِ آرائش سے بری طرح لدا ہوا تھا: لگام پر، جو رنگین اونی جھالر سے مزین تھی، ہر قسم کی گھنٹیاں ٹھنٹھنا رہی تھیں؛ اونچی زین کے حاشیوں پر بھی گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں؛ اور ایک دو فٹ لمبا پَر، گھوڑے کی تراشیدہ ایال میں جڑا، اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ گاڑی بان خاموش

Scanned with CamScanner

بیٹھا رہا۔ وہ اپنی خرد ماغی اور بدکاریوں سے اور اس وجہ سے بددل تھا کہ کل رات تانبے کے وہ تمام سکے جوئے میں ہار گیا تھا جن سے اس کی جیبیں پُر تھیں — پورے چار لیرے اور چالیس سینتے سیمی، نہ کم نہ زیادہ۔ لیکن ایسی صبح کو، جب ہوا اتنی تازہ ہو، اور سمندر قریب ہی پھیلا ہو اور آسمان ایک صبح گاہی سکون کی وجہ سے پرسکون ہو، تو سر کا درد جلدی دور ہو جاتا ہے اور آدمی پھر سے بے فکر محسوس کرتا ہے۔ مزید برآں، گاڑی بان اس غیر متوقع کمائی سے قدرے بشاش ہو گیا تھا جو اسے سان فرانسسکو کے شریف زادے سے، جو اس کے پس پشت اپنا مردہ سر بکس کی چادروں سے ٹکرا رہا تھا، حاصل ہوئی تھی۔ بڑے سے کھٹمل سے مشابہ چھوٹا دخانی بہت نیچے، نیپلز کی کھاڑی کو لبریز کرنے والی نرم اور چمکیلی نیلاہٹ پر کھڑا، سیٹی بجا کر روانگی کا اعلان کر رہا تھا — اور سیٹی کی آوازیں بہت تیزی سے گونجتی ہوئی پورے کاپری میں پھیل گئیں۔ جزیرے کا ہر موڑ، ہر چٹان اور پتھر اتنا واضح نظر آ رہا تھا، جیسے آسمان اور زمین کے درمیان نام کو ہوا نہ ہو۔ گودی کے قریب میر دربان نے گاڑی بان کو آلیا۔ وہ سان فرانسسکو کے شریف زادے کی بیوی اور بیٹی کو موٹر میں لا رہا تھا۔ ان کے چہرے پیلے تھے اور آنکھیں شب بیداری اور اشکباری کی وجہ سے اندر کو دھنس گئی تھیں۔ دس منٹ بعد چھوٹا دخانی پانی کو چھیڑتا ہوا پھر سورنیتو اور کاستیلیا مارے کی طرف احتیاط سے سفر کر رہا تھا اور امریکی خاندان کو ہمیشہ کے لیے کاپری سے دور لے جا رہا تھا... اس اثنا میں جزیرے کو اپنا امن اور چین واپس مل گیا۔

دو ہزار سال ہوئے اس جزیرے پر ایک آدمی رہتا تھا، جو خود اپنی ہی بہیمانہ اور نجس حرکات میں سراسر الجھ گیا تھا۔ جب کسی نامعلوم وجہ سے وہ لاکھوں انسانوں پر غاصبانہ حاکم ہو گیا اور اس اقتدار کی لغویت سے اس نے خود کو ششدر پایا تو، اس ڈر کے مارے کہ کہیں کوئی اسے بے خبری میں مار نہ ڈالے، اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوئیں جن کی غیر انسانیت کی کوئی انتہا نہ تھی؛ اور انسانیت نے ہمیشہ اسے یاد رکھا ہے اور وہ لوگ جو، مجموعی طور پر، اب دنیا پر اسی کی طرح ناقابل فہم اور، لازماً، ظالمانہ راج کرتے ہیں، دنیا کے کونے کونے سے اس پتھریلے مکان کے آثار دیکھنے آتے ہیں جو اس کا مسکن تھا اور جزیرے کی ایک سب سے عمودی چٹان پر واقع ہے۔ اس حیرت ناک صبح کو سیاح، جو کاپری عین اسی مقصد سے آئے تھے، ابھی مختلف ہوٹلوں میں محوِ خواب تھے، لیکن سرخ زینوں والے چھوٹے گدھے، جن کے لمبے لمبے کان تھے، ابھی سے ہوٹلوں کی ڈیوڑھیوں پر لائے جا رہے تھے۔ امریکن

Scanned with CamScanner

اور جرمن مرد، عورتیں، بوڑھے اور جوان، بیدار ہو کر اور جی کھول کر ناشتہ کرنے کے بعد، ان گدھوں پر سوار ہونے والے تھے، اور کاپری کی بوڑھی فقیرنیاں، نسیلے ہاتھوں میں لاٹھیاں لے کر، ان کے پیچھے پیچھے پتھریلی، کوہساری لیکوں پر مونتے تے بیریا کی چوٹی تک دوڑنے والی تھیں۔ سان فرانسسکو کے معمر مُردے کو، جس نے سیاحوں کے ساتھ جانے کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن اس کی بجائے انھیں موت کی یاد دلا کر ڈرا دیا تھا، بذریعۂ نیپلز بھیجا بھی جا چکا تھا اور، اس بات سے مطمئن ہو کر، سیاح غافل سو رہے تھے اور جزیرے پر خاموشی کا راج تھا۔ چھوٹے سے چوک میں سبزی اور مچھلی منڈی کے سوا اس چھوٹے شہر کی دکانیں ہنوز بند تھیں۔ ان معمولی آدمیوں میں جو چوک میں اپنا کام نمٹا رہے تھے، لورینزو نامی قدآور بوڑھا ملاح اور بے فکر متوالا، جو کبھی خوبصورت آدمی تھا، تمام اطالیہ میں مشہور تھا اور متعدد بار مصوروں کے لیے ماڈل بنا تھا، ہمیشہ کی طرح، کاہلانہ کھڑا تھا۔ وہ دو بڑی جھینگا مچھلیاں لا کر، جنھیں اس نے رات کو پکڑا تھا، اونے پونے داموں بیچ بھی چکا تھا اور وہ دون کالدو کے پیش بند میں، جو اس ہوٹل کا خانساماں تھا جس میں سان فرانسسکو سے آنے والا خاندان ٹھہرا تھا، سرسرا رہی تھیں — اور اب لورینزو اطمینان سے، شاہانہ انداز میں کھڑے ہو کر، سورج چھپنے تک، اپنے چیتھڑوں، اپنے مٹی کے پائپ جس میں سرکنڈے کی لمبی نال تھی اور اپنی سرخ اونی ٹوپی کی، جو ایک کان کی طرف جھکی ہوئی تھی، نمائش کر سکتا تھا۔ اس اثنا میں، مونتے سولارے کی ڈھلانوں کے درمیان، آناکاپری سے آنے والے دو اَبروزّی پہاڑی، قدیم فنیقی سڑک سے نیچے آ رہے تھے جو ایک دیو پیکر زینے کی شکل میں چٹانوں میں تراشی گئی تھی۔ ایک کے پاس چرمی چادر کے نیچے ایک بیگ بانسری تھی — بکری کی بڑی سی کھال جس میں دو بانسریاں تھیں؛ اور دوسرے کے پاس چوبی بانسری کی قسم کی کوئی شے تھی۔ وہ چل رہے تھے اور تمام علاقہ، شادمان اور حسین اور دھوپیلا، ان کے نیچے پھیلا ہوا تھا: جزیرے کے پتھریلے شانے، جو ان کے قدموں تلے تھے، وہ افسانوی نیل جس میں جزیرہ تیر رہا تھا، مغربی جانب، درخشاں آفتاب کے نیچے، صبح کے چمکیلے بخارات، اور اطالیہ کے پہاڑوں کے مرتعش انبار، قریب بھی اور دور بھی، جن کے حسن کو بیان کرنے سے انسانی زبان قاصر ہے... بیچ راستے میں وہ ہلکے پڑ گئے۔ سڑک پر سایہ فگن، مونتے سولارے کی سنگی دیوار کے ایک غار میں، قدسی دوشیزہ، سراپا تجلی، سورج کی شوکت اور تابش میں رنگی کھڑی تھی۔ اس کی برف کے مانند سفید پیرس پلاسٹر کی پوشاک

اور شاہانہ تاج کا رنگ سنہرا ہو گیا تھا اور اس کی آسمان کی طرف، اپنے سہ بارہ سعادت یافتہ فرزند کے جادواں اور مسعود مسکن کی طرف، اٹھی ہوئی نگاہوں میں ترحم اور انکسار تھا۔ انھوں نے اپنے سر برہنہ کر دیے، بانسریوں کو ہونٹوں سے لگایا اور بے لاگ اور منکسرانہ مسرور حمد و ثنا جاری ہو گئی۔ سورج اور صبح اور خود اُس کی ثنا جو اس پاپی اور سندر دنیا میں دکھ اٹھانے والوں کی معصوم شفیعہ ہے، اور اُس کی ثنا بھی جو دور افتادہ یہودیہ میں بیچ چوبانوں کی کٹیا میں، بیت اللحم کے غار میں، مریم کے بطن سے پیدا ہوا۔

اور سان فرانسسکو کے متوفی شریف زادے کا یہ ہے کہ وہ وطن جا رہا تھا، نئی دنیا کے کناروں کی جانب، جہاں ایک قبر اس کی منتظر تھی۔ بہت ذلتیں اٹھانے اور بہت انسانی بے اعتنائیاں جھیلنے، ایک ہفتے بھر ایک بندرگاہ کے گودام سے دوسری کے گودام تک بھٹکنے کے بعد، آخرش اسے اُسی شہرۂ آفاق جہاز پر جگہ ملی جو، اتنا مختصر عرصہ ہوا، اس قدر دھوم دھام سے اس خاندان کو پرانی دنیا لایا تھا۔ لیکن اب اسے لوگوں کی نظروں سے چھپایا گیا: ایک تارکول پھرے تابوت میں رکھ کر اسے دخانی کے سیاہ گودام کی تہہ میں اتار دیا گیا، اور جہاز دوبارہ اپنے طویل بحری سفر پر روانہ ہو گیا۔ رات کے وقت وہ کاپری کے پاس سے گزرا اور جزیرے سے اسے دیکھنے والوں کو، اس کی روشنیاں دھیرے دھیرے تاریک سمندر میں اوجھل ہوتی ہوئیں، وہ بے انتہا اداس معلوم ہوا، لیکن وہاں، اس وسیع دخانی پر، اس کے رخشندگی اور سنگ مرمر سے چمکتے ہوئے منور ایوانوں میں، حسبِ معمول، ایک پر شور جلسۂ رقص بپا تھا۔

دوسری اور تیسری رات کو پھر ناچ ہوا۔ اس وقت وہ بیچ سمندر میں تھے اور سمندر پر ایک خشمناک طوفان آ رہا تھا، جو کسی تکفینی تودے کے مانند گرج کر ماتمی روپہلے جھاگ کی جھالر لگی عظیم موجیں لڑھکا رہا تھا۔ ابلیس، جس نے جبرالٹر کی چٹان سے، جو دو دنیاؤں کا حجری باب ہے، جہاز کو رات اور طوفان میں غائب ہوتے دیکھا، برف کی آڑ میں جہاز کی بے شمار آتشیں آنکھوں کو بمشکل شناخت کر سکا۔ ابلیس چٹان جتنا بڑا تھا، لیکن جہاز اس سے عظیم تر تھا، ایک کئی منزلوں اور کئی چمنیوں والا دیو، جسے پرانا دل رکھنے والے نئے انسان کے تکبر نے خلق کیا تھا۔ برفانی اندھکار جہاز کے ساز و سامان اور چوڑی گردنوں والے دُودکشوں کو، جو برف سے سفید تھے، بری طرح دھنکتا رہا، لیکن جہاز کی حشمت، ہیبت اور ثابت قدمی میں فرق نہ آیا۔ اس کے بلند ترین عرشے پر، برفانی گردباد میں

Scanned with CamScanner

گھرا ہوا، ایک آرام دہ اور مدھم مدھم روشن کیبن تنہا استادہ تھا، جہاں سے جہاز کا نیم بیدار جسیم کپتان، جو کسی وحشی صنم سے مشابہ تھا، جہاز کے تمام طول وعرض پر حکومت کر رہا تھا۔ اس نے سائرن کے طوفان سے گھٹے ہوئے بھیانک گریے اور غضب ناک کلکاریوں کو سنا، لیکن اس چیز کی قربت نے جو دیوار کے پیچھے اور بالآخر اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی، اس کے خطرات کو رفع کر دیا۔ اس عظیم، زرہ پوش کیبن کے خیال سے اس کی ڈھارس بندھ گئی، جو وقتاً فوقتاً ایک فلزاتی خود والے آدمی کے گرد بھڑکنے اور پھٹنے والی پر اسرار گڑ گڑاتی صداؤں اور نیلگوں آگوں کی خشک چڑ چڑاہٹ سے معمور ہو جاتا تھا اور وہ آدمی بے چینی سے ان جہازوں کی غیر واضح آوازیں سن رہا تھا، جو صدہا میل دور سے اسے پکار رہے تھے۔ بالکل تہہ میں اٹلانٹس کے زیرِ آب رحم میں، منکیوں اور مختلف دوسری مشینوں کے عظیم انبار، جن کے فولادی اجزا پر پھیکی چمک تھی، بھاپ سے خرخرا کر گرم پانی اور تیل ٹپکا رہے تھے: یہاں وہ، جہنمی بھٹیوں سے پھکتا ہوا، جناتی مطبخ تھا جہاں جہاز کی حرکت کی تولید کی جا رہی تھی: یہیں وہ، اپنے ارتکاز کے باعث ہولناک، قوتیں کھول رہی تھیں جنھیں جہاز کے پیندے کی طرف اور اس لامتناہی گول سرنگ میں ارسال کیا جا رہا تھا، جو بجلی سے روشن تھی اور کسی دو آسا توپ کی نال معلوم ہوتی تھی، جس میں آہستہ آہستہ ایک غدار دُھرا، ایسی پابندیِ اوقات اور ایقان سے جو انسانی روح کو کچل ڈالتا ہے، اپنے چکنے نشیمن میں چکر کھا رہا تھا، جیسے کوئی جیتی جاگتی بلا اپنے بھٹ میں دراز ہو۔ اور اٹلانٹس کے وسطی حصے، اس کے گرم، پُرتکلف حجلوں، طعام خانوں اور ایوانوں کا یہ حال ہے کہ وہ روشنی اور مسرت بکھیر رہے تھے، خوش پوشاک بکواسی ہجوم سے بارونق تھے، تازہ پھولوں کی خوشبو سے معمور تھے: اور تاروالے باجوں کے آرکسٹرا سے گونج رہے تھے، اور روشنیوں کی اس شوکت، ریشموں، ہیروں اور برہنہ نسوانی شانوں کے درمیان کرائے کے پریمیوں کا وہی چھریرا، لچکیلا جوڑا دوبارہ اذیت ناک طور پر گھومتا، بل کھاتا اور بعض مرتبہ لوٹن ہوتے ہوئے ٹکراتا: وہ عاصیانہ باحجاب اور قبول صورت لڑکی، جس کی پلکیں جھکی جھکی تھیں اور بال معصوم انداز میں کٹے ہوئے تھے: یہ ایک لمبا نوجوان، پاؤڈر سے پیلا، جس کے بال کالے تھے اور اور سر پر چپکے ہوئے معلوم ہوتے تھے، جس نے انتہائی نفیس لک کے جوتے اور ایک تنگ، لمبے دامن والا ڈریس کوٹ پہن رکھا تھا — جو جونک سے مشابہ حسین آدمی۔ اور کسی کو پتا نہ تھا کہ بے حجابانہ غمگین موسیقی کی دھن پر خود کو ایک بناوٹی سعادت آمیز تعذیب سے اذیت

پہنچانے سے وہ دونوں مدتوں سے بیزار تھے؛ نہ ہی کسی کو یہ پتا تھا کہ ان کے قدموں تلے، بہت نیچے، گودام کی بالکل تہہ میں، سمندر، تاریکی اور طوفان سے بڑے جوش و خروش سے کشمکش کرنے والے جہاز کے اندھیرے اور گھمسیلے پوٹے میں کیا تھا...

❁❁

Scanned with CamScanner

ڈورس لیسنگ

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمن

بوڑھا سردار مشلانگا

وہ اچھے برس تھے، جب وہ اپنے باپ کے فارم پر جھاڑ بن میں ڈانواں ڈول پھرتی تھی۔ یہ فارم بھی، ان تمام فارموں کی طرح جو گوروں کی ملکیت تھے، زیادہ تر اُفتادہ پڑا تھا۔ بس کہیں کہیں کھیتی کے چھوٹے چھوٹے قطعے اس میں مخل تھے۔ ان قطعوں کے درمیان کیا تھا: درخت، لمبی چھدری گھاس، جھانکڑ، تھوہر اور برساتی کھالے، گھاس اور زمین سے ابلی ہوئی چٹانیں اور جھانکڑ اور وہیں کہیں بڑھ کر باہر کو ابھر آنے والی ایک سل کی سل، جسے مدتوں پہلے، اتنے پرانے وقتوں میں جن کا تصور بھی ممکن نہیں، افریقہ کی تپتی دھرتی میں سے اگل دیا تھا؛ جسے دھوپ اور ہوا دونوں نے، جو خلا اور جھاڑ بن کے اتنے ہزاروں میل طے کر کے وہاں تک پہنچی تھیں، اتنا مانجھ ڈالا تھا کہ اس پر چھوٹے چھوٹے گڑھے اور انگلیوں کی چھاپ جیسے لچھے بن گئے تھے — اور یہی سل ایک چھوٹی سی لڑکی کا بوجھ اٹھائے ہوئے، جس کی آنکھوں کو بید کے درختوں سے گھرے ایک پیلے دریا اور ایک پیلے، چمکیلے قلعے کے سوا کچھ سجھائی نہ دیتا تھا: ایک چھوٹی سی لڑکی، یہ گاتی ہوئی:

اُڑ کے باہر دور چلی گئی ساری بنائی
پورے آئینے میں تیڑ بڑی سی آئی [1]

مکئی کے ڈنٹھلوں کی وہ ہری بھری غلام گردشیں جن کے پتے بہت اوپر کہیں کیتھیڈرلوں کی

---

[1] یہ دو مصرعے ٹینی سن کی نظم ''دی لیڈی آف شیلاٹ'' کے ہیں۔ (مترجم۔)

Scanned with CamScanner

طرح محرابیں بناتے ہوے، جن میں دھوپ کا نسا جال بچھا، اور قدموں تلے کٹی ہوئی لال مٹی؛ اور جب وہ مکئی کے ڈنٹھلوں کو ہاتھوں سے ہٹا کر راستہ بناتی ہوئی چلتی تو ستاروں جیسے لال پھولوں والی وچ ویڈ کی نازک جھاڑ کسی کالی کبڑی صورت کو لا حاضر کرتی جو ٹرّا ٹرّا کر بری فال منھ سے نکالتی۔ کوئی شمالی جادوگرنی، شمال کے ٹھٹھرے جنگلوں میں پلی ہوئی، مکئی کے کھیتوں کے بیچ اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی اور خود مکئی کے کھیت، اسے بلوط کے درختوں کی گٹھیلی جڑوں کے درمیان چھوڑ چھاڑ، دھندلا کر فقرّ و ہو جاتے۔ گالاسی اجلی اجلی برف ڈھیروں گرتی اور درختوں کے گنجان تنوں کے درمیان لکڑہارے کا جلایا ہوا الاؤ یوں لگتا جیسے کوئی لال دہکتی ہوئی آ وُ آدر۔

جس سفید فام بچی نے آنکھیں کھولتے ہی دھوپ میں رچے کسی منظر کو، کسی روکھے سوکھے اور متشدد منظر کو، تجسس کی نظر سے دیکھا ہو، اس کے بارے میں یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس منظر کو اس نے اپنا مان کر قبول کر لیا ہوگا، مساسا نامی درختوں اور کانٹوں بھرے رُوکھوں سے مانوس ہو چکی ہو؛ یہ محسوس کرتی ہوگی کہ اس کا لہو موسموں کے جھونٹوں سے پینگ ملائے، آزادانہ گردش کر رہا ہے۔

یہ بچی کبھی نہ دیکھ سکی کہ مساسا نامی درخت اور کٹیلے رُوکھ اصل میں کیسے ہیں۔ اس کی کتابوں میں بدیسی پریوں کی کہانیاں درج تھیں، اس کے دریا دھیرے دھیرے اور امن چین سے بہتے تھے اور اسے پتا تھا کہ ابر یا بلوط کے پتے کیسے ہوتے ہیں، انگلستان کی ندیوں میں بسنے والے ننھے منے جانداروں کے کیا کیا نام ہیں، جبکہ ویلٹ [2] کے لفظ سے اجنبیت ٹپکتی تھی، حالانکہ ویلٹ کے سوا اسے کچھ یاد نہ تھا۔

اسی وجہ سے، سال ہا سال تک، اسے ویلٹ ہی غیر حقیقی معلوم ہوتا رہا؛ وہاں کا سورج بدیسی سورج تھا اور ہوا ایک عجیب زبان بولتی تھی۔

فارم پر جو کالے رہتے تھے، وہ بھی اتنے ہی دور پرے تھے جتنے کہ درخت اور چٹانیں۔ وہ ایک گچھ پچ ڈھیر تھے جو آپس میں گھلتا ملتا، بکھرتا اور اکٹھا ہوتا رہتا تھا، جیسے وہ مینڈکوں کے بچے ہوں، بے چہرہ؛ جو صرف اس لیے جی رہے تھے کہ خدمت بجا لائیں، ''جی حضور'' کہیں، تنخواہ لیں اور چلتے بنیں۔ وہ موسم بہ موسم ادلتے بدلتے رہتے۔ آج اس فارم پر ہیں، کل اگلے فارم پر جا نکلے؛ اپنی

[2] وسیع و عریض میدان جہاں گھاس ہی گھاس ہو اور درخت خال خال ہوں۔ (مترجم۔)

Scanned with CamScanner

بدیسی ضرورتوں کے تحت، جنھیں سمجھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، مارے مارے پھرتے۔ وہ شاید سینکڑوں میل شمال یا مشرق سے چل کر آتے۔ چند ماہ ٹھہر کر کہیں آگے چلے جاتے۔ کہاں؟ شاید جوہانس برگ کی سونے کی افسانوی کانوں تک بھی جا نکلتے ہوں، جہاں افریقہ کے اِس حصے کی بہ نسبت تنخواہ کہیں بہتر تھی۔ یہاں تو انھیں بس چند شلنگ فی ماہ اور دن بھر میں دو بار مٹھی بھر مکئی کا آٹا نصیب ہوتا تھا۔

بچی کو سکھایا گیا تھا کہ کالے تو ہوتے ہی خدمت گزاری کے لیے ہیں۔ اگر اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گر جاتی تو گھر میں نوکر سو سو گز دور سے اسے اٹھانے کے لیے دوڑ پڑتے۔ اس کے ہم سن کالے بچے تک اسے ''نکوسی کاس'' یعنی سردارنی کہتے۔

بعد میں جب اس کا تجسس اتنا بڑھ گیا کہ فارم میں سما نہ سکتا تھا، تو وہ اپنی بغل میں بندوق داب، دو کتے ساتھ لیے، ہر روز ٹوبے ٹوبے، ٹلے ٹلے، میلوں مارا مار کرتی پھرتی۔ کتے اور بندوق خوف کو پاس نہ آنے دیتے، ڈھال کا کام کرتے۔ ان کے ہوتے اسے کبھی ڈر نہ لگتا۔

اگر کچے راستوں پر آدھے میل پرے بھی کوئی مقامی نظر آ جاتا تو کتے اسے کھدیڑ کر کسی درخت پر چڑھنے پر اس طرح مجبور کر دیتے، جیسے وہ پرندہ ہو۔ اگر وہ (اپنی گنوارو بولی میں جو بجائے خود اڑنگ بڑنگ تھی) گلہ شکوہ کرتا تو اس کی بات کو سوے ادب سمجھا جاتا۔ اگر موڈ اچھا ہوا تو اس کی بات سن کر قہقہہ لگا دیا، ورنہ درخت پر چڑھے برافروختہ آدمی پر بمشکل اچٹتی سی نظر ڈال کر اپنی راہ لی۔

گورے بچے شاذ و نادر ہی ایک دوسرے سے ملتے۔ ایسے موقعوں پر جب ان کی ملاقات ہوتی تو وہ کسی آتے جاتے مقامی کو، دل بہلاوے کے لیے، آواز دے کر بلا لیتے تاکہ اسے الو بنا سکیں۔ وہ اس پر کتے چھوڑ دیتے اور اس کا دوڑنا بھاگنا دیکھتے۔ وہ کسی چھوٹے کالے بچے کو اس طرح ستاتے جیسے وہ کوئی پلا ہو؛ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ کسی کتے کو یہ محسوس کیے بغیر پتھر یا ٹہنیاں نہیں مار سکتے تھے کہ وہ ظلم کر رہے ہیں۔

اور آگے چل کر بچی کے ذہن میں چند سوال وارد ہوئے؛ اور چونکہ ان کے جوابوں کو قبول کرنا آسان نہ تھا، اس لیے انھیں اور بھی گھمنڈی طرزِ عمل اپنا کر خاموش کر دیا گیا۔

گھر کے اندر باہر کام کرنے والے کالوں کو اپنا دوست تصور کرنا تک ناممکن تھا، کیونکہ اگر وہ ان میں سے کسی سے بات کرنے لگتی تو اس کی ماں پریشان ہو کر دوڑی آتی: ''چلو یہاں سے!

مقامیوں کو ہرگز منہ نہیں لگاتے۔"

خطرے کا، کسی ناگوار بات کا، دل میں بیٹھا ہوا یہی وہ احساس تھا جس کی وجہ سے اگر کوئی نوکر انگریزی بولتے ہوئے کچھ غلطی کر بیٹھتا یا کسی حکم کو سمجھنے سے قاصر رہتا تو بھونڈے انداز میں قہقہہ مار کر ہنسنا آسان ہو جاتا — قہقہے کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو خوف ہے، خود اپنے آپ سے خائف رہتی ہے۔

ایک شام، جب میں کوئی چودہ برس کی تھی، میں مکئی کے کھیت کے کنارے کنارے چلی جا رہی تھی۔ کھیت میں نیا نیا ہل چلا تھا، اس لیے مٹی کے بڑے بڑے لال ڈھیلے تر و تازہ نظر آ رہے تھے اور پرے واقع ٹوبے تک اتھل پتھل ہو کر یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے کوئی موج خیز سرخ سمندر۔ یہ وہ چپ چاپ اور ہمہ تن گوش ساعت تھی جب چڑیاں ایک درخت سے دوسرے درخت تک لمبے لمبے اداس چہچہے دوڑاتی ہیں اور زمین اور آسمان اور پتوں کے تمام رنگ گہرے اور سنہرے ہوتے ہیں۔ رائفل میری بغل میں تھی اور کتے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔

سامنے، شاید کوئی دو سو گز پرے، دیمک کے ایک برجی نما چھتے کے برابر میں تین افریقیوں کی ٹولی نظر پڑی۔ میں نے سیٹی بجا کر کتوں کو اپنے دامن میں بلا لیا، رائفل کو ہاتھ میں ہلانے جلانے لگی اور آگے بڑھی۔ میں منتظر تھی کہ مجھے راہ دینے کے لیے وہ احتراماً پگڈنڈی سے ہٹ کر ایک طرف ہو جائیں، لیکن وہ یکساں رفتار سے قدم اٹھاتے چلے آئے اور کتے منہ اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے کہ انھیں پیچھا کرنے کا حکم ملے۔ مجھ پر غصہ چڑھ گیا۔ مقامی، اور ہم میں سے کسی کو آتا دیکھتے ہی راستہ چھوڑ کر نہ ہٹے، یہ "ڈھٹائی" تھی۔

آگے آگے ایک بوڑھا جھکا جھکا چل رہا تھا — اپنا بوجھ لاٹھی پر ڈالے، سر کے بال کچھ ملگجے کچھ سفید، گہرے لال رنگ کا کمبل کندھوں پر چادر کی طرح پڑا ہوا۔ اس کے پیچھے دو نوجوان چلے آ رہے تھے، جنھوں نے برتن بھانڈوں، بلموں، کلھاڑیوں کی پوٹیں اٹھا رکھی تھیں۔

یہ کوئی عام طور پر نظر آنے والی ٹولی نہ تھی۔ یہ ایسے مقامی نہ تھے جو نوکری کی تلاش میں نکلے ہوں۔ ان کی وضع قطع سے وقار ٹپکتا تھا، ایسی کیفیت مترشح تھی جیسے وہ کچھ ٹھان کر چپ چاپ چلے جا رہے ہوں۔ یہ ان کا وقار ہی تھا جس نے میری زبان تھام لی۔ میں غراتے کتوں سے دھیمی آواز میں

باتیں کرتی ہوئی رسان سے چلتی گئی، یہاں تک کہ میرے اور ان کے درمیان دس قدم کا فاصلہ رہ گیا۔تب وہ بوڑھا آدمی رکا،اس نے کمبل کو اپنے گرد اور اچھی طرح لپیٹ لیا۔

''صبیر ،نکوسی کاس!'' وہ بولا، کہ دن کا کوئی وقت بھی ہو، سلام کرتے ہوئے یہی کہا جاتا تھا۔

''صبح بخیر،''میں نے کہا۔''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''میری آواز قدرے درشت تھی۔

بوڑھے نے اپنی بولی میں کچھ کہا، پھر نوجوانوں میں سے ایک شائستگی سے آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر انگریزی بولتے ہوئے کہنے لگا:''میرا سردار دریا پار اپنے بھائی بندوں سے ملنے جا رہا ہے۔''

سردار ہے! میں نے سوچا، اور اس تفاخر کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی جس کی بدولت وہ بوڑھا میرے سامنے اس طرح کھڑا تھا جیسے میرا ہم رتبہ ہو—ہم رتبہ سے بھی زیادہ، کیونکہ وہ اخلاق سے پیش آ رہا تھا، اور میں اخلاق کا ثبوت نہیں دے رہی تھی۔

بوڑھے نے پھر کچھ کہا۔اپنا وقار کسی آبائی لباس کی طرح زیب تن کیے وہ پہلے کی طرح اب بھی دس قدم دور کھڑا تھا، آزو بازو اس کے حالی موالی تھے اور اس نے میری طرف دیکھنے کی بجائے (ایسا کرنا بدتمیزی میں شامل ہوتا) اپنی نظر میرے سر کے اوپر کہیں درختوں پر جما رکھی تھی۔

''تم باس جارڈن کے فارم والی چھوٹی نکوسی کاس ہو؟''

''ٹھیک کہتے ہو،''میں نے کہا۔

''شاید تمھارے والد کو یاد نہ ہو،'' ترجمان نے بوڑھے کی طرف سے کہا''لیکن ایک دفعہ کچھ بکریوں کا چکر تھا۔ مجھے یاد ہے، میں نے تمھیں دیکھا تھا، جب تم اتنی سی تھیں۔ . . ''نوجوان اپنا ہاتھ گھٹنے کے برابر لے آیا اور مسکرایا۔

ہم سب مسکرا دیے۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''یہ سردار مشلا نگا ہیں،''نوجوان نے بتایا۔

''میں ابا کو بتاؤں گی کہ میری تم سے ملاقات ہوئی تھی،''میں نے کہا۔

بوڑھے نے کہا،''تمھارے والد کو میرا سلام پہنچے، چھوٹی نکوسی کاس۔''

Scanned with CamScanner

''صبح بخیر،'' میں نے شائستگی سے کہا۔ شائستگی مجھ پر گراں گزر رہی تھی، کہ مجھے اس کی عادت نہ تھی۔

''مصیر، چھوٹی نکوسی کاس،'' بوڑھے نے کہا اور مجھے راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہو گیا۔

میں بندوق کو بے ڈھنگے پن سے لٹکائے پاس سے گزر گئی۔ کتے بُو لیتے اور غراتے رہے کہ انھیں اپنے دل پسند مشغلے یعنی مقامیوں کے پیچھے اس طرح دوڑ پڑنے سے باز رکھا گیا تھا جیسے وہ آدمی نہیں، جانور ہوں۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ایک پرانے سیاح کی کتاب میں یہ الفاظ میری نظر پڑے: ''سردار مشلا نگا کا ملک۔'' عبارت اس طرح تھی: ''ہماری منزلِ مقصود سردار مشلا نگا کا ملک تھا، جو دریا کے شمال میں واقع ہے، اور ہم چاہتے تھے کہ اس علاقے میں سردار سے سونا کھوجنے کی اجازت لی جائے۔''

ایک سفید فام لڑکی کے لیے، جسے یہ تربیت دے کر پالا گیا تھا کہ تمام مقامیوں کو استعمال کی چیز سمجھنا چاہیے، ''سردار سے اجازت لی جائے'' کے الفاظ اس قدر عجیب و غریب تھے کہ ان سے وہ سوال اس کے ذہن میں پھر عود کر آئے جنھیں دبا کر نہ رکھا جا سکتا تھا۔ وہ سوال آہستہ آہستہ میرے ذہن میں اونٹتے رہے۔

ایک اور دفعہ ایسا ہوا کہ ایک بوڑھا کھوجنہارا فارم پر آ نکلا۔ ایسے کھوجنہارے آج بھی اپنے ہتھوڑے، تنبو اور چٹانوں کے چُورے سے سونا پھٹکنے کی پراتیں اٹھائے، افریقہ میں سونے کی ایسی پرتوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جن کا کوئی والی وارث نہ ہو۔ کھوجنہارے نے پرانے وقتوں کا ذکر کرتے ہوئے پھر وہی الفاظ استعمال کیے: ''یہ بوڑھے سردار کا ملک تھا،'' وہ بولا۔ ''پرے کے ان پہاڑوں سے لے کر اِدھر ٹھیک دریا تک پھیلا ہوا تھا، سینکڑوں میل لمبا چوڑا ملک۔'' اس کے نزدیک ہمارے ضلعے کا یہی نام تھا: ''بوڑھے سردار کا ملک۔'' ضلعے کا ہم نے جو نام رکھا تھا وہ اس نے نہیں لیا— ایک نیا نام، جس سے اس بات کا کوئی اشارہ نہ ملتا تھا کہ کسی کی ملکیت ہتھیالی گئی ہے۔

جیسے جیسے میں نے اُس زمانے کے بارے میں مزید کتابیں پڑھیں جب افریقہ کے اس حصے میں گوروں کے داخلے کی اجازت عام ہو گئی تھی، اور اس بات کو بہت سے بہت پچاس سال سے زیادہ

Scanned with CamScanner

کیا ہوے ہوں گے، مجھے پتا چلتا گیا کہ بوڑھا سردار مشلا نگا مشہور شخصیت رہ چکا تھا، جس کے نام سے سب سیاح اور کھوجہارے واقف تھے۔ لیکن اس وقت تو وہ جوان ہوگا؛ یا شاید وہ اس کے والد یا چچا تایا کا ذکر کرتے تھے ـــــ یہ مجھے کبھی معلوم نہ ہوسکا۔

اس برس کئی بار فارم کے اس حصے میں میری اس کی ملاقات ہوئی، جہاں سے دیہات آنے جانے والے مقامی گزرتے تھے۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ بڑے لال کھیت کے ساتھ سے گزرنے والی ڈگر، جہاں چڑیاں چہکتی رہتی تھیں، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے والوں کا بندھا ٹکا رستہ تھا۔ شاید میں اسی امید پر وہاں منڈلاتی رہتی تھی کہ اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ اس کی طرف سے خوش آمدید کہا جانا اور تسلیمات کا تبادلہ اُن سوالوں کا جواب معلوم ہوتا تھا جنھوں نے مجھے دق کر رکھا تھا۔

میں جلد ہی ایک مختلف جذبے کے تحت بندوق لیے گھومنے لگی۔ میں نے بندوق کو اپنی ڈھارس بندھانے کے لیے نہیں، بلکہ ایسا شکار مارنے کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا جو کھانے کی میز کی زینت بن سکے، اور اب کتوں نے بھی زیادہ تمیزداری سیکھ لی۔ جب میں کسی مقامی کو اپنی طرف آتے دیکھتی تو ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے، خیر خیریت پوچھتے۔ اور آہستہ آہستہ وہ دوسرا زمینی منظر میرے ذہن سے دھندلا گیا اور میرے پاؤں افریقی دھرتی پر براہِ راست پڑنے لگے، مجھے درختوں اور پہاڑیوں کی شکلیں صاف صاف دکھائی دینے لگیں، اور کالے آدمی گویا پیچھے ہٹتے ہٹتے میری زندگی سے باہر چلے گئے۔ یہ ایسا تھا جیسے میں ایک طرف ہٹ کے کھڑی ہوگئی ہوں، تاکہ زمینی منظر اور انسانوں کا کوئی آہستہ رو، گہرا تعلق رکھنے والا، ناچ دیکھ سکوں، ایک بہت پرانا ناچ، جس کے مطابق گت بھرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

لیکن، میں نے سوچا، یہ میری میراث بھی ہے۔ میں یہیں پلی بڑھی ہوں؛ یہ میرا ملک بھی ہے اور کالوں کا ملک بھی ہے؛ یہاں ہم دونوں کے واسطے بہتیری کی گنجائش ہے اور ایک دوسرے کو کھڑنجوں اور سڑکوں سے کہنی مار مار کر ہٹانے کی ضرورت نہیں۔

ایسا لگتا تھا کہ ضرورت بس اس بات کی تھی کہ اس احترام کو جو میں نے بوڑھے سردار مشلا نگا سے گفتگو کرتے وقت محسوس کیا تھا، عام کر دیا جائے، گوروں کالوں دونوں کو ایک دوسرے سے نرمی سے ملنے دیا جائے، اس طرح کہ باہمی اختلافات کے بارے میں رواداری سے کام لیں۔ یہ بالکل

Scanned with CamScanner

آسان معلوم ہوتا تھا۔

پھر ایک دن ایک نئی بات ہوئی۔ ہمارے گھر میں ملازموں کے طور پر ہمیشہ تین مقامی کام کرتے تھے: باورچی، گھر کا کام کاج کرنے والا، مالی۔ یہ ملازم بھی فارم پر کام کرنے والے دوسرے مقامیوں کی طرح ٹک کر نہیں رہتے تھے۔ چند مہینے کام کیا، پھر کسی نئی ملازمت کی تلاش میں نکل گئے یا اپنے گھر کی راہ لی۔ انھیں یا تو ''اچھا'' مقامی سمجھا جاتا تھا یا ''برا''، جس سے مراد تھی کہ ملازموں کے طور پر ان کا رویہ کیسا ہے؟ وہ سست ہیں یا چست، فرمانبردار ہیں یا گستاخ؟ اگر گھر والوں کی طبیعت پر بشاشت غالب ہوتی تو یہ کہا جاتا: ''ان سکیٹھو کالے جنگلیوں سے اور توقع ہی کیا رکھی جائے؟'' اگر ہمارا مزاج برہم ہوتا تو ہم لوگ کہتے: ''یہ ملعون حبشی! یہ نہ ہوں تو ہم زیادہ چین سے رہیں۔''

ایک دن ایک گورا پولیس مین آیا جو ضلعے کے راؤنڈ پر نکلا ہوا تھا، اور ہنس کر کہنے لگا: ''آپ کو پتا ہے کہ آپ کے باورچی خانے میں ایک اہم شخصیت موجود ہے؟''

''کیا؟'' میری امی جھلا کر بول پڑیں۔ ''کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''ایک سردار کا لڑکا۔'' پولیس مین کو یہ بات دل لگی معلوم ہو رہی تھی۔ ''جب بوڑھا بابا چل بسے گا تو قبیلے پر یہی لڑکا راج کرے گا۔''

''اس کے حق میں بہتر ہوگا کہ میرے سامنے سردار کا بیٹا بننے کی کوشش نہ کرے،'' میری امی نے کہا۔

جب پولیس مین چلا گیا تو ہم نے اپنے باورچی کو اور نظر سے دیکھا۔ وہ کام اچھا کر لیتا تھا لیکن ہفتے اتوار کی چھٹی کے دوران میں شراب بہت پی جاتا تھا۔ ہمارے لیے اس کی بس یہی پہچان تھی۔

وہ قد آور جوان تھا۔ جلد بہت سیاہ، جیسے پالش کی ہوئی سیاہ دھات، گھنگھریالے اگتے ہوئے کالے بالوں میں گوروں کے فیشن کے مطابق ایک طرف کو مانگ نکلی ہوئی اور اس میں اسٹور سے خریدا ہوا دھات کا کنگھا اڑسا ہوا، بہت شائستہ، بہت الگ تھلگ، حکم کی تعمیل کرنے میں بہت پھرتیلا۔ اب، جبکہ حقیقت ہم پر عیاں ہو چکی تھی، ہم نے کہنا شروع کر دیا: ''ظاہر ہے جی، صاف پتا چل رہا ہے۔ عالی نسبی کبھی چھپی نہیں رہ سکتی۔''

اب چونکہ میری امی کو اس کے حسب نسب اور آئندہ منصب کا پتا چل گیا تھا، انھوں نے اس

کے ساتھ سختی کا رویہ اپنا لیا تھا۔ کبھی کبھی جب انھیں غصہ آ جاتا تو وہ کہتیں، ''ابھی تم سردار نہیں بنے ہو، پتا بھی ہے؟'' اور وہ بہت نرمی سے نظر جھکا کر انھیں جواب دیتا، ''ہاں، نکوسی کازی۔''

ایک سہ پہر اس نے معمول کے مطابق نصف دن کی چھٹی لینے کے بجائے پورے دن کی چھٹی مانگی تاکہ اگلے اتوار گھر جا سکے۔

''تم ایک دن میں گھر کیسے پہنچ سکتے ہو؟''

''اپنی سائیکل پر مجھے آدھا گھنٹہ لگے گا،'' اس نے سمجھایا۔

میں دیکھتی رہی کہ وہ کس سمت میں گیا ہے؛ اور اگلے روز میں اس کا گاؤں تلاش کرنے چل دی۔ میں سمجھ گئی تھی کہ وہ لازماً سردار مشلا نگا کا جانشین ہوگا۔ کوئی دوسرا گاؤں ہمارے فارم کے اتنے قریب نہ تھا۔

اس طرف ہمارے فارم کی حدوں سے پرے کا علاقہ میرے لیے نیا تھا۔ میں انجانی پگڈنڈیوں پر چلتی، ٹیلوں میوں کے پاس سے گزرتی گئی، جو اب تک دھندلے افق کا حصہ تھے، دوری کی وجہ سے دھندلائے ہوئے نظر آتے تھے۔ یہ سرکاری زمین تھی، جس پر گوروں نے کبھی کھیتی باڑی نہیں کی تھی۔ پہلے پہل تو میں سمجھ نہ سکی کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ صرف ایک حد بندی کو پار کرتے ہی کسی بالکل تازہ وضع کے زمینی منظر میں جا نکلنے کا احساس ہو رہا ہے۔ یہ ایک سرسبز عریض وادی تھی جہاں ایک چھوٹی سی ندی جگمگا رہی تھی اور شوخ رنگ کے جل پنچھی سیٹھوں کے اوپر جھپٹتے پھر رہے تھے۔ گھاس گھنی تھی اور میری پنڈلیوں کو ملائم لگ رہی تھی۔ درخت اونچے اونچے اور سڈول تھے۔

میں اپنے فارم سے مانوس تھی جہاں سینکڑوں ایکڑ پر پھیلی، بارشوں سے کٹی پھٹی کھردری زمین نے جو درخت اگائے تھے، انھیں کان بھٹیوں میں جلانے کے لیے کاٹ ڈالا گیا تھا اور وہ کھڑ تنک اور مڑے تڑے ہو کر رہ گئے تھے؛ جہاں مویشیوں نے گھاس کو روند کر زمین پر بچھا دیا تھا اور اپنے پیچھے ایک دوسری کو کاٹتی ان گنت لکیریں چھوڑ گئے تھے، جو ہر برسات میں بارشوں کی مار سے گہری ہو ہو کر کھائیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھیں۔

اس علاقے کو اچھوتا چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہاں بس یا تو کھوجہاروں کا گزر ہوتا تھا، جو اپنی آوارہ گردیوں کے دوران میں ادھر آ نکلتے اور کدال چلا کر، چٹانوں کی سطح سے چند چنگاریاں اڑا کر، چلے

جاتے؛ یا مہاجر مقامیوں کا، جو اپنے گزرنے کے ثبوت کے طور پر شاید کسی درخت کے تنے پر، جس کی اوٹ میں وہ رات کے اول وقت آگ جلاتے، آنچ کا کالا داغ چھوڑ جاتے۔

وہاں بہت خاموشی تھی۔ ایک گرم صبح جس میں کبوتر بیٹھی بیٹھی آواز میں غٹرغوں کر رہے تھے، دوپہر کے سائے غف اور دبیز پھیلے ہوئے تھے، ان کے درمیان دھوپ بھری شفاف بسنتی جگہیں، اور ساری عریض سرسبز پارک نما وادی میں میرے سوا آدم نہ آدم زاد۔

میں ایک کھٹ بڑھئی کی لے میں ڈوبی تیز کھٹ کھٹ سنتی جا رہی تھی کہ آہستہ آہستہ یوں لگا جیسے ایک یخ احساس میری بیچ کمر سے اٹھ کر کندھوں تک پھیلتا جا رہا ہے، بھینچ ڈالنے والے تشنج کے ساتھ جو جھرجھری کے مانند تھا، اور میرے بالوں کی جڑوں میں ایک جھنجھنانے والی کیفیت پیدا ہوئی اور میرے جسم کی جلد پر دوڑتی چلی گئی، جس کے بعد میرا جسم ٹھنڈا پڑ گیا اور رونگٹے کھڑے ہو گئے، حالانکہ میں پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔ بخار؟ میں نے سوچا۔ پھر بے چینی سے مڑ کر پیچھے نظر ڈالی اور یکایک مجھے پتا چلا کہ یہ تو خوف ہے۔ یہ غیر معمولی بات تھی، بلکہ باعثِ ندامت بھی۔ یہ ایک نیا خوف تھا۔ اتنے برسوں میں اس علاقے میں تن تنہا گھومتی پھرتی رہی تھی اور مجھے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی گھبراہٹ محسوس نہیں ہوئی تھی؛ شروع میں تو اس لیے محسوس نہیں ہوئی کہ مجھے رائفل اور کتوں کا سہارا حاصل تھا، بعدازاں اس لیے کہ میں نے ان افریقیوں کے ساتھ جن سے میرا سابقہ پڑ سکتا تھا، بے تکلف دوستانہ پن سے پیش آنا سیکھ لیا تھا۔

میں نے اس احساس کے بارے میں پڑھا تھا کہ کس طرح افریقہ کا بڑاپن اور سناٹا، قدیم دھوپ کے زیرِ اثر، گاڑھا ہوتے ہوتے ذہن میں مشکّل ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ چڑیوں کے چہچہوں تک سے ہول آنے لگتا ہے اور چٹانوں اور درختوں سے ایک جان لیوا روح باہر آ جاتی ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، جیسے وہاں سے صرف گزر جانا ہی کسی پرانی اور خبیث چیز کو اشتعال دلانے کے لیے کافی ہو، کوئی تیرہ و تار، مہیب اور آگ بگولہ شے جو شاید اچانک الف ہو کر پیچھے سے وار کر دے۔ آپس میں گھتے ہوئے درختوں کے جھنڈوں پر نظر پڑتی ہے اور ان جانوروں کی شکلوں کا خیال آنے لگتا ہے جو شاید وہاں دبکے بیٹھے ہوں۔ دھیرے دھیرے بہتی ندی پر نظر پڑتی ہے، جو ٹوبے ٹوبے نیچے اترتی جاتی ہے، جہاں رات کو سانبھر پانی پینے آتے ہیں، مگرمچھ ابھرتے ہیں اور انھیں نرم

نرم تھوتھنیوں سے دبوچ کر زیرِ آب غاروں میں گھسیٹ لے جاتے ہیں۔

ڈر مجھ میں حلول کر گیا۔ مجھے پتا چلا کہ میں جو چکر پہ چکر کھاتی چل رہی ہوں تو صرف اس لیے کہ وہ بے شکل ڈراوا جو میرے پیچھے لگا ہوا تھا، کہیں ہاتھ بڑھا کر مجھے پکڑ نہ لے۔ میں ٹیلوں کی صفوں پر اچٹتی نظر ڈالتی رہی جو، مختلف زاویے سے دیکھے جانے کے سبب، ہر قدم کے ساتھ شکل بدلتے معلوم ہوتے تھے؛ یہاں تک کہ جانے پہچانے نشاناتِ راہ کا بھی کچھ ٹھیک نہ تھا، چنانچہ اس بڑے پہاڑ پر بھی، جو اُس وقت سے میری دنیا پر پہرہ دے رہا تھا جب سے مجھے دنیا کا وقوف ہوا تھا، دامن کی پہاڑیوں میں ایک ایسی دھوپیلی وادی نظر آ رہی تھی جو میرے لیے انجانی تھی۔ مجھے کچھ پتا نہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ میں راستہ بھول گئی تھی۔ دہشت نے مجھے جکڑ لیا۔ مجھے پتا چلا کہ میں پھرکی کی طرح چکر کھا رہی ہوں۔ پریشان ہو کر کبھی اُس درخت کو تکتی، کبھی اِس درخت کو؛ اوپر آنکھیں نچا کر سورج کو دیکھتی جو ترچھا کر مشرق کے مقابل آ گیا تھا اور غروب کی اداس پیلی روشنی بکھیر رہا تھا۔ یقیناً کئی گھنٹے گزر گئے ہوں گے! میں نے اپنی گھڑی دیکھی تو پتا چلا کہ بے معنی دہشت کا یہ عالم شاید دس منٹ باقی رہا تھا۔

بات یہ تھی کہ یہ کیفیت بے معنی تھی۔ میں گھر سے دس میل دور بھی نہ تھی۔ مجھے صرف اتنا کرنا تھا کہ جدھر سے آئی تھی، وادی میں الٹے پاؤں اسی طرف چلی جاتی اور اپنے فارم کی باڑ کے سامنے جا پہنچتی۔ دور، اکا دکا پہاڑیوں کے دامن کی اونچ نیچ میں، ایک پڑوسی کے مکان کی چھت چمک رہی تھی؛ دو گھنٹے پیدل چل کر وہاں تک پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ اسی طرح کا خوف تھا جو رات کو کتے کے بدن میں اینٹھن پیدا کر دیتا ہے اور اسے پورے چاند پر بھونکنے پر مجبور کرتا ہے۔ جو کچھ میں سوچ یا محسوس کر رہی تھی، اس سے اس خوف کا بالکل کوئی تعلق نہ تھا، میں زیادہ فکر مند اس بارے میں تھی کہ میں جسمانی احساس کے بجائے خود اس خوف کا شکار ہو سکتی تھی۔ میں، دودِلے پن میں مبتلا، خود اپنے سنسناتے اعصاب پر نگاہ رکھے، اور ایک گھناؤنے تفنن کے ساتھ دائیں بائیں نظر ڈالتے ہوئے، دھیمی پڑ کے، مستعدی سے آگے بڑھتی گئی۔ میں نے خود کو دیدہ و دانستہ اس گاؤں کے متعلق ادھیڑ بن میں مصروف کر لیا اور یہ بھی سوچنے لگی کہ جب میں اس میں قدم رکھ چکوں گی تو کیا کروں گی — بشرطے کہ میں اسے ڈھونڈ نکالوں، جو مشکوک معلوم ہوتا تھا، کیونکہ میں بے مقصد چلتی جا رہی تھی اور وہ

Scanned with CamScanner

گاؤں جھاڑ بن کے ان لکھوکھا ایکڑوں میں، جو میرے سامنے پھیلے تھے، کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت جب میرے ذہن پر گاؤں چھایا ہوا تھا، میں نے محسوس کیا کہ خوف میں ایک نئی کیفیت کا اضافہ ہو گیا ہے —— تنہائی۔ اب الگ تھلگ رہ جانے کا ایسا ہول مجھ میں آ سمایا کہ قدم اٹھانا دو بھر ہو گیا۔ اور اگر ایک چھوٹی سی چڑھائی کی ٹکر پر پہنچ کر مجھے گاؤں سامنے اپنے نیچے نظر نہ آ جاتا تو میں مڑ جاتی اور گھر کی راہ لیتی۔ وہ درختوں کے درمیان ایک کھلی جگہ میں چھپر پڑے جھونپڑوں کا جھرمٹ تھا۔ وہیں پہ مکئی اور حلوہ کدوؤں اور باجرے کے صاف ستھرے قطعات تھے اور فاصلے پر چند درختوں کے نیچے مویشی چر رہے تھے۔ جھونپڑوں کے درمیان مرغیاں مٹی کریدتی ہوئیں، گھاس پر کتے پڑے سوتے ہوئے اور دریا کی ایک معاون ندی کے پرے، جو گاؤں کے گرد اس طرح تھی جیسے کوئی گھیرے میں لینے والا بازو؛ ایک سرا ابھارے ملے کے بالائی حصے پر بکریاں یوں نظر آ رہی تھیں جیسے کوئی منقش حاشیہ کھچا ہو۔

جب میں قریب پہنچی تو دیکھا کہ دیواروں پر پیلے اور لال اور گیروے گارے کے نقش و نگار بنا کر جھونپڑوں کو بڑے پیار سے آراستہ کیا گیا ہے اور چھپر، بٹی ہوئی پرال کی مدد سے، اپنی اپنی جگہ بندھے ہیں۔

وہ ہمارے فارم کے کمپاؤنڈ جیسا بالکل بھی نہیں تھا جو ایک غلیظ جگہ تھی، بے غوری کا شکار، آتے جاتوں کا وقتی بسیرا، جن کی وہاں کوئی جڑیں نہیں تھیں۔

اب میری سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اور کیا کیا جائے۔ میں نے ایک چھوٹے کالے بچے کو آواز دی جو گلے میں پڑی نیلے منکوں کی لڑیوں کے سوا بالکل ننگا تھا اور ایک لٹھے پر بیٹھا تار لگی ہوئی تو مڑی بجا رہا تھا۔ میں نے کہا، ''سردار کو بتا دو کہ میں آئی ہوں۔''

بچے نے اپنا انگوٹھا منھ میں اڑس لیا اور شرمیلے انداز میں ٹکر ٹکر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں منٹوں وہاں گویا کسی ویران گاؤں کے کنارے کھڑی رہی۔ کبھی ایک قدم آگے ہو جاتی، کبھی ایک قدم پیچھے، یہاں تک کہ بچہ اُدھر سے سٹک لیا اور چند عورتیں آ ٹپکیں۔ وہ چمکیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں، ان کے کانوں میں اور بانہوں پر پیتل دمک رہا تھا۔ وہ بھی چپ چاپ کھڑی مجھے گھورتی رہیں۔ پھر آپس میں بتیانے لگیں۔

Scanned with CamScanner

میں نے پھر کہا، ''کیا میں سردار مشلا نگا سے مل سکتی ہوں؟'' میں نے دیکھا کہ نام ان کے پلے پڑ گیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ میں کیا چاہتی ہوں — یہ تو خود میں بھی نہ سمجھ پا رہی تھی۔

آخر کار میں ان کے درمیان سے ہو کر گزر گئی اور چلتے چلتے جھونپڑوں سے آگے پہنچی تو ایک بڑے اور سایہ دار درخت کے نیچے ایک جگہ نظر آئی جہاں سے جھاڑ جھنکاڑ ہٹا دیا گیا تھا۔ وہاں کوئی درجن بھر بوڑھے زمین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

سردار مشلا نگا درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ہاتھ میں تونبی تھی جس سے وہ گھونٹ بھر تا رہا تھا۔ جب اس نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے کا ایک پٹھا بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا اور میں دیکھ سکتی تھی کہ وہ خوش نہیں ہے۔ شاید وہ بھی اسی حجاب میں مبتلا تھا جس کی میں آپ شکار تھی، یعنی موقعے کی مناسبت سے آدابِ ملاقات کے صحیح پیرائے تلاش کرنے کی اہلیت نہ رکھنے پر شرمساری۔ مجھ سے خود میرے اپنے فارم پر مل لینا اور بات تھی، لیکن یہاں مجھے نہیں آنا چاہیے تھا۔

میں کس بات کی توقع لے کر آئی تھی؟ میں معاشرتی سطح پر ان میں گھل مل نہ سکتی تھی — ایسا تو کبھی سننے میں بھی نہ آیا تھا۔ یہی کیا کم معیوب تھا کہ میں، ایک گوری لڑکی، ویلٹ میں کسی گورے مرد کی طرح اکیلی پھر رہی تھی؛ اور وہ بھی جھاڑ بن کے اس حصے میں جہاں آنے جانے کا حق صرف سرکاری افسروں کو حاصل تھا۔

ایک بار پھر میں، احمقانہ طور پر مسکراتی ہوئی، رک کر وہاں کھڑی ہو گئی، جبکہ میرے پیچھے چمکیلے کپڑوں میں ملبوس، چائیں چائیں کرتی عورتوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ ان کے چہرے تجسس اور اشتیاق کے مارے چوکنے تھے۔ اور میرے سامنے بوڑھے آدمی بیٹھے تھے، ان کے چہرے بوڑھے، جھرّیائے ہوئے، ان کی آنکھیں احتیاط کا پہلو لیے، بے نیاز۔ یہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کا گاؤں تھا؛ یہاں تک کہ وہ دونوں نوجوان بھی، جو سردار کے پاس گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے، وہ نہیں تھے جنھیں میں نے پہلے اس کے ساتھ دیکھا تھا۔ نوجوان تو سب وہاں سے گوروں کے فارموں پر اور کانوں میں کام کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اور سردار مجبور تھا کہ اپنے حاضر باشوں کے لیے ان رشتے داروں پر تکیہ کرے جو عارضی طور پر چھٹی لے کر آئے ہوئے ہوں۔

''چھوٹی گوری نکوسی کا س گھر سے دور ہے،'' بالآخر بڑے میاں نے خیال ظاہر کیا۔

Scanned with CamScanner

''ہاں،'' میں نے اتفاق کیا۔ ''گھر دور ہے۔'' میں کہنا چاہتی تھی: ''میں آپ کے پاس دوستانہ ملاقات کی غرض سے حاضر ہوئی ہوں، سردار مشلا نگا۔'' میں یہ نہ کہہ سکی۔ شاید اس وقت تک میں اس شدید لاچار آرزو میں مبتلا ہو چکی تھی کہ کاش میں ان مردوں اور عورتوں سے، بطور انسانوں کے، جان پہچان پیدا کر سکوں، کاش وہ مجھے دوست کے طور پر قبول کر لیں؛ لیکن سچ یہ ہے کہ میں تجسس کے جذبے کے تحت گھر سے چلی تھی۔ میں اس گاؤں کو دیکھنا چاہتی تھی جس پر ایک نہ ایک دن ہمارے باورچی نے، اس خود کو لیے دیے رہنے والے اور فرمانبردار نوجوان نے، راج کرنا تھا، جو اتوار کی اتوار شراب پی کر دھت ہو جاتا تھا۔

''نکوسی جارڈن کی بیٹی کا آنا سر آنکھوں پر،'' سردار مشلا نگا نے کہا۔

''آپ کا شکریہ،'' میں بولی، اور مجھے سوجھا ہی نہیں کہ آگے کیا کہوں۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی تو مکھیاں اڑ اڑ کر آئیں اور میرے سر کے چاروں طرف بھن بھن کرنے لگیں۔ اس ہرے گھنے درخت میں، جس نے اپنی شاخیں بوڑھوں پر پھیلا رکھی تھیں، ہوا نے ذرا سی کروٹ لی۔

''صبح بخیر،'' آخر میں نے کہا۔ ''اب مجھے اپنے گھر واپس جانا چاہیے۔''

''مسیر، چھوٹی نکوسی کا س،'' سردار مشلا نگا نے کہا۔

میں اس بے اعتنا گاؤں کو پیچھے چھوڑ کر چلتی گئی۔ میں نے چڑھائی عبور کی، گھور گھور کر دیکھتی عنبریں آنکھوں والی بکریوں کے پاس سے گزری۔ پھر ڈھلان پر سے نیچے اترتی ہوئی، جہاں قدآور، شاہانہ درخت کھڑے تھے، اس عظیم زرخیز ہری بھری وادی میں جا پہنچی جہاں دریا بل پہ بل کھاتا بہہ رہا تھا اور کبوتر اپنی غٹرغوں کی زبانی بھرپور حاصل خیزیوں کی کہانیاں سنا رہے تھے اور کٹھ پھوڑے کی دھیمی دھیمی کھٹ کھٹ جاری تھی۔

خوف غائب ہو چکا تھا۔ تنہائی اینٹھ کر ہٹیلی رواقیت میں بدل گئی تھی۔ اب زمینی منظر میں ایک بے طور سی دشمنی تھی، ایک سرد مہر، کٹھور، ترش رو، کسی سے زیر نہ ہو سکنے والی کیفیت جو میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، کسی دیوار کی طرح مضبوط، دھویں کی طرح ہاتھ نہ آنے والی۔ لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے کہہ رہی ہو: تم یہاں ایک غارت گر کے مانند چل رہی ہو۔ میں خالی دل کے ساتھ آہستہ چلتی

Scanned with CamScanner

ہوئی گھر لوٹی۔ میں جان گئی تھی کہ اگر یہ آدمی کے اختیار میں نہیں کہ وہ کسی ملک کو کتے کی طرح اپنے پیچھے دوڑا سکے، تو جذبے کے کسی سہل وفور کے عالم میں مسکرا کر ماضی کو یہ کہتے ہوئے چھٹی دینا بھی ممکن نہیں کہ ''یہ میرے اختیار میں نہ تھا، میں خود بھی ظلم رسیدہ ہوں۔''

میں نے سردار مشلا نگا کو بس ایک مرتبہ اور دیکھا۔

ایک رات میرے والد کی لمبی چوڑی لال زمین کو چھوٹے تیکھے کھروں نے پامال کر دیا اور پتا یہ چلا کہ قصوروار بکریاں سردار مشلا نگا کے گاؤں سے آئی تھیں۔ ایسا ایک دفعہ پہلے بھی، برسوں پہلے، ہوا تھا۔

میرے والد نے تمام بکریاں ضبط کر لیں۔ پھر انھوں نے بوڑھے سردار کو پیغام بھیجا کہ اگر اسے اپنی بکریاں واپس چاہییں تو پہلے نقصان کا ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔

ایک شام سورج ڈوبتے وقت وہ ہمارے گھر آ پہنچا۔ وہ اب بہت بوڑھا اور خمیدہ کمر نظر آ رہا تھا۔ ایک بڑی سی لاٹھی کا سہارا لیے، اپنے شاہانہ انداز میں اوڑھے گئے کمبل کے نیچے یوں قدم اٹھاتا ہوا جیسے اس کا جسم اکڑ گیا ہو۔ میرے والد مکان کی سیڑھیوں کے آگے بچھی ہوئی اپنی بڑی کرسی پر جا بیٹھے۔ بوڑھا ان کے سامنے زمین پر احتیاط سے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے دائیں بائیں دو نوجوان تھے۔

احتا بحثی طویل اور تکلیف دہ ثابت ہوئی؛ کچھ اس وجہ سے کہ جو نوجوان ترجمانی کر رہا تھا اس کی انگریزی خراب تھی، اور کچھ اس وجہ سے کہ میرے والد مقامی بولی نہیں بول سکتے تھے۔ انھیں صرف ٹوٹی پھوٹی گوراشاہی بانٹو آتی تھی۔

میرے والد کے نقطۂ نظر سے فصل کو کم از کم دو سو پاؤنڈ مالیت کا نقصان پہنچا تھا۔ انھیں پتا تھا کہ وہ یہ رقم بوڑھے سے حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ بکریاں اپنے پاس رکھنے میں وہ حق بجانب ہیں۔ جہاں تک بوڑھے سردار کا تعلق ہے، وہ طیش میں آ کر بار بار یہ دہراتا رہا: ''بیس بکریاں! میرے لوگ بیس بکریاں نہیں گنوا سکتے۔ ہم نکوسی جارڈن کی طرح امیر نہیں ہیں کہ ایک ہی دفعہ میں بیس بکریوں کو گنوا دیں۔''

میرے والد خود کو امیر نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ بہت غریب ہیں۔ انھوں نے

Scanned with CamScanner

جواباً تیز تیز اور غصیلی گفتگو کی اور کہا کہ جو نقصان ہوا ہے وہ ان کے لیے بہت معنی رکھتا ہے، اور یہ کہ وہ بکریاں ضبط کر لینے میں حق بجانب ہیں۔

آخر کار گرما گرمی اتنی بڑھ گئی کہ سردار کے لڑکے یعنی باورچی کو باورچی خانے سے بلانا پڑا تا کہ وہ ترجمانی کے فرائض انجام دے سکے، اور اب میرے والد فر فر انگریزی میں بات کرنے لگے اور ہمارا باورچی جھٹ پٹ ترجمہ کرتا گیا تا کہ بڑے میاں سمجھ جائیں کہ میرے والد کتنے زیادہ ناراض ہیں۔ نوجوان آدمی آنکھیں جھکائے، کسی جذبے کا اظہار کیے بغیر، میکانکی انداز میں بولتا گیا، لیکن کندھوں کی مخاصمانہ اور غیر آرام دہ وضع سے یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ اپنی حیثیت کے بارے میں کیا محسوس کر رہا ہے۔

اب سورج کا غروب اپنے آخری دموں پر تھا، آسمان رنگوں کی ابتری تھا، چڑیاں اپنے آخری ترانے گا رہی تھیں اور مویشی، پرامن انداز میں ڈکراتے ہوئے، ہمارے سامنے سے گزر کر سائبان سے ڈھکے باڑوں کی طرف رات بسر کرنے جا رہے تھے۔ یہ وہ ساعت تھی جب افریقہ کا حسن اپنے عروج پر ہوتا ہے؛ اور یہاں یہ قابلِ رحم، بدنما منظر تھا، جس سے کسی کا بھی کچھ بھلا نہ ہو رہا تھا۔

آخر میرے والد نے حتمی طور پر کہا: ''میں اس بارے میں بحث نہیں کروں گا۔ بکریاں میرے پاس رہیں گی۔''

بوڑھے سردار نے اپنی بولی میں چمک کر جواب دیا، ''اس کا مطلب ہے کہ جب کھر سا آئے گی تو میرے لوگ فاقے کریں گے۔''

''تو پھر پولیس کے پاس چلے جاؤ،'' میرے والد نے کہا، اور فتح مند نظر آئے۔

ظاہر ہے، اور کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔

بوڑھا سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا، اس کے ہاتھ جھریائے گھٹنوں پر بیچارگی کے عالم میں لٹکے ہوئے تھے۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا، نوجوانوں نے اسے سہارا دیا اور وہ میرے والد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑے بے لوچ انداز میں ایک بار پھر بات کی اور منہ موڑ لیا۔ پھر اپنے گاؤں کا رخ کیا۔

''اس نے کیا کہا؟'' میرے والد نے نوجوان سے پوچھا، جو بے اطمینانی سے ہنسا اور ان سے

آنکھیں چار کرنے سے کتراتا رہا۔

''اس نے کیا کہا؟'' میرے والد نے اصرار کیا۔

ہمارا باورچی تن کر سیدھا اور خاموش کھڑا ہو گیا، اس کی بھنویں تن گئیں۔ پھر وہ بولا: ''میرا باپ کہتا ہے، یہ ساری زمین، جسے تم اپنی زمین کہتے ہو، اس کی زمین ہے اور ہمارے لوگوں کی ملکیت ہے۔''

یہ بیان دے کر وہ اپنے باپ کے پیچھے پیچھے جھاڑ بن میں چلا گیا اور ہم نے اسے دوبارہ کبھی نہ دیکھا۔

ہمارا اگلا باورچی نیاسالینڈ سے آنے والا ایک تارکِ وطن تھا، جسے کسی بڑے مرتبے پر فائز ہونے کی کوئی توقعات نہ تھیں۔

اگلی بار جب پولیس مین اپنے راؤنڈ پر آیا تو اسے یہ قصہ سنایا گیا۔ اس نے اس بارے میں کہا، ''اس گاؤں کو وہاں ہونے کا کوئی حق نہیں۔ اسے مدتوں پہلے وہاں سے ہٹا دینا چاہیے تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے اس بارے میں کوئی کارروائی کیوں نہیں کی۔ میں اگلے ہفتے مقامی لوگوں کے کمشنر سے بات کروں گا۔ مجھے خیر سے اتوار کو ٹینس کھیلنے اُدھر جانا ہے۔''

کچھ عرصے بعد ہمارے سننے میں آیا کہ سردار مشلا نگا اور اس کے قبیلے کو دو سو میل مشرق، مقامی لوگوں کے لیے ایک موزوں محفوظ علاقے میں، منتقل کر دیا گیا ہے۔ سرکاری زمین کو جلد ہی سفید فام آبادکاری کی غرض سے کھول دیا جانے والا تھا۔

میں تقریباً ایک سال بعد گاؤں کو دوبارہ دیکھنے گئی۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ جہاں جھونپڑے تھے، وہاں اب لال گارے کی ڈھیریاں تھیں، جن پر بوسیدہ پیال کی لمبی لمبی دھجیاں پڑی تھیں اور دیمک کی بنائی ہوئی سرخ گیلریاں رگوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ حلوا کدو کی بیلوں نے جھاڑیوں میں، درختوں کے نچلے ٹہنوں پر، ہر طرف دھوم مچا رکھی تھی، یہاں تک کہ کدو بڑی بڑی سنہری گیندوں کی شکل میں قدموں میں لڑھک اور سروں پر لٹک رہے تھے۔ یہ حلوا کدوؤں کا جشن تھا۔ جھاڑیاں بڑھ بڑھ کر جگہ گھیرتی جا رہی تھیں، نئی نئی اگنے والی گھاس غضب کی سبز تھی۔

جس خوش نصیب آبادکار کو یہ زور گھنی گرم وادی الاٹ ہو گئی تو وہ اچانک دیکھے گا (بشرطے کہ

Scanned with CamScanner

وہ اس خاص حصے کو کاشت کرنا پسند کرے) کہ مکئی کے کھیتوں کے بیچوں بیچ پودے بڑھ کر پندرہ پندرہ فٹ اونچے ہو گئے ہیں اور بھٹوں کا بوجھ ڈنٹھلوں کو کھینچ کر جھکائے دے رہا ہے، اور حیران ہو گا کہ زرخیزی کی کون سی غیر متوقع پرت اس کے ہاتھ لگ گئی ہے۔

❁❁

اینا کیون (Anna Kevin) کے والدین امیر انگریز تھے۔اینا 1901 میں پیدا ہوئی۔اس نے دو بار شادی کی لیکن دونوں مرتبہ نباہ کی کوئی صورت نہ نکلی۔ابتدا میں اس نے روایتی انداز کے ناول لکھے لیکن بعد میں اپنے لیے ایسا اسلوب وضع کیا جو منفرد بھی ہے اور پُرکارانہ بھی۔ ہیروئن کی لت اسے 1926 میں پڑی۔اس سے 'اک گونہ بےخودی' درکار نہ تھی۔اینا پر گہری بےکیفی طاری رہتی تھی۔اس وقت کے طبی حلقے اس طرح کی بےکیفی یا ڈپریشن کو بیماری تصور نہ کرتے تھے۔اینا اپنا علاج خود کرنے کی کوشش کرتی رہی جس میں اسے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔بار بار ذہنی امراض میں مبتلا رہنے سے اس کے جینے اور لکھنے کے اسلوب دونوں ہی بدل گئے۔ہم اس کے فکشن میں ایسے فرد کے کرب سے دوچار ہوتے ہیں جو مسلسل تشویش، تجسس اور تنہائی کے نرغے میں ہے اور اپنی شناخت کے بارے میں متذبذب ہے۔ان سلسلہ وار واہموں کو تراش خراش کر فکشن میں ڈھالنا، یہی اینا کیون کا کمال ہے۔خلوت پسند اینا باصلاحیت مصور اور انٹیریر ڈیکوریٹر بھی تھی۔1968 میں فوت ہوئی۔

ایوان بونین (Ivan Bunin) (1870۔1953) روسی ناول نگار/افسانہ نگار۔1917 کے انقلاب سے پہلے وہ کافی مشہور ہو چکا تھا۔انقلاب کا سخت مخالف تھا۔اس لیے روس چھوڑ کر چلا آیا اور جلاوطنی کی زندگی کا بیشتر حصہ فرانس میں گزارا۔ادب کا نوبیل انعام حاصل کر چکا ہے۔

ڈورس لیسنگ (Dorris Lessing) (پیدائش 1919) کرمان شاہ، ایران، میں پیدا ہوئی اور جنوبی رہوڈیشیا (موجودہ زمبابوے) میں ایک زرعی فارم پر پلی بڑھی۔پھر انگلستان چلی گئی۔بطور ناول نگار اس کا مقام بہت بلند ہے۔افسانے بھی متاثر کن ہیں۔ادب کا نوبیل انعام جیت چکی ہے۔

— محمد سلیم الرحمٰن

علی اکبر ناطق کی کہانیاں اس سے پہلے آج کے دو شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اس نئے، عمدہ اور فعال کہانی کار کی مزید چھ کہانیاں اس شمارے کے اگلے صفحات میں شائع کی جا رہی ہیں تاکہ پڑھنے والے اس کی پیش رفت سے واقف رہ سکیں۔ ان میں سے چند کہانیاں دوسرے رسالوں میں بھی الگ الگ چھپ چکی ہیں، لیکن یہاں انھیں اس خیال سے شامل کیا جا رہا ہے کہ ان کا مجموعی تاثر سامنے آ سکے۔

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

معمار کے ہاتھ

''حاجی صاحب، ان بچوں کو تعلیم دینا میرے بس میں نہیں، کوئی اور بندوبست کر لیجیے،'' اس نے بیزاری سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا، آپ سے بڑھ کر اور کیا بندوبست ہوگا؟'' حاجی الطاف شرمندگی سے بولا۔ ''ان کمبختوں کی تعلیم کے لیے میں نے شہر کا کوئی بھلا آدمی نہیں چھوڑا۔ مگر ہر کوئی بمشکل ایک مہینہ پورا کرتا ہے۔ سوچا تھا، تم فارغ پھرتے ہو، شریف گھر کے، پڑھے لکھے ہو، کچھ نہ کچھ کر گزرو گے۔ جب تک کوئی ڈھنگ کا کام نہ ملے، ان کو تعلیم دے دو۔''

''حاجی صاحب، آپ کی سب باتیں ٹھیک، مگر یہ آپ کے پوتے مجھ سے ڈرتے نہیں اور سبق پر بھی کان نہیں دھرتے۔ میں ایسے ہی اپنا اور ان کا وقت ضائع کروں گا۔ پھر سارا دن مزدوری کرنے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ شام کو یہ مصیبت نہیں اٹھتی۔'' وہ ڈیوڑھی سے باہر نکلتے ہوئے رکا۔ ''اگر آپ کو مجھ سے واقعی ہی ہمدردی ہے تو میری ملازمت کے لیے کچھ اور بندوبست کرا دیجیے۔ یہ بچے تو مجھ سے نہیں پڑھائے جاتے۔''

''چلو کوئی بات نہیں،'' حاجی کہنے لگا، ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تو مزدوری کرتا ہی بوڑھا ہو جائے اور ساری عمر مسجدوں کے مینار بنانے میں ہی گزار دے۔''

''تو پھر کیا کروں؟'' اس نے جواب دیا۔

''ایک کام کر، تُو میرے بیٹوں کے پاس چلا جا،'' حاجی الطاف نے اس کا کندھا تھپتھپاتے

Scanned with CamScanner

ہوئے کہا۔ ’’وہاں جلد ہی خدا کوئی بہتر صورت پیدا کر دے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے، لیکن ابا سے پوچھ کر بتاؤں گا،‘‘ اس نے چلتے ہوئے کہا۔

اصغر کو باپ کے ساتھ مزدوری کرتے ہوئے اب پورے پندرہ سال ہو گئے تھے۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر پہلے اچھی طرح سے جائزہ لیا کہ آیا وہ تر ہو چکی ہے، کیونکہ دیوار ذرا سی بھی خشک ہو تو اس پر پلستر کرنا عذاب ہو جاتا ہے۔ ہاتھ لگانے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ ابھی دیوار پلستر کرنے کے قابل نہیں۔ اصغر نے مزدور کو مزید پانی پھینکنے کا کہا اور پھر اپنے باپ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا، جو پلستر شدہ دیوار پر آرائشی ٹائلیں چپکا رہا تھا۔ ٹائلوں کا کام بہ نسبت پلستر کے آسان تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ کام کو اس طرح آپس میں بانٹ لیتے کہ سخت کام وہ اپنے ذمے لے لیتا اور قدرے آسان اپنے باپ کے حوالے کر دیتا۔ اصغر نے دیکھا کہ اس کے باپ کے ہاتھ ٹائل لگاتے ہوئے کانپ رہے تھے۔ وہ اس کی سفید ریش کو غور سے دیکھنے لگا جس میں سیمنٹ کے چھینٹے سیاہ مٹی کی طرح چمٹے ہوئے تھے اور چہرے کی ہڈیاں کچھ زیادہ ہی ابھر آئی تھیں۔ یہ دیکھ کر اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس کا باپ اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اس عمر میں اسے کام نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ایک ہنر مند راج گیر تھا۔ شہر کی تقریباً تمام نئی مسجدوں کی تعمیر انھیں کے ہاتھوں ہوئی۔ باپ کے ساتھ اتنا عرصہ کام کرنے سے اس نے وہ تمام ہنر سیکھ لیا تھا۔

کچھ دیر چپکے سے اپنے باپ کو کام کرتے دیکھتا رہا، پھر اچانک اس نے حاجی الطاف سے ہونے والی کل شام کی گفتگو من وعن سنا دی۔

بات سننے کے بعد اس کے باپ نے کرنڈی تغاری میں رکھتے ہوئے کہا، ’’بیٹا، آگے تمھاری مرضی لیکن ایک بات میں تم سے کہے دیتا ہوں کہ آج کل عربوں میں سوائے ذلالت کے کچھ نہیں۔ تیرے سامنے میں تین سال کویت میں رہ آیا، لیکن یہ کرنڈی اور تیسی ہاتھ سے نہ چُھٹی۔ رہی حاجی الطاف کے بیٹوں کی بات، تو اس کا جواب یہ ہے کہ تاجر اور سنیارے میں ’کھال جائے مال نہ جائے‘ والی بات ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں وہ تیرے یار نہ بنیں گے۔‘‘

اصغر نے تحمل سے باپ کی نصیحت کو سنا۔ لیکن اب وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

Scanned with CamScanner

جدہ ایر پورٹ پر اترتے ہی وہ امیگریشن کے کاؤنٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ امیگریشن کے پانچ کاؤنٹر تھے جن پر عملہ موجود نہیں تھا۔ وہ پہلے کاؤنٹر پر لگی ہوئی قطار میں دوسرے نمبر پر کھڑا تھا۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ ہر قطار میں سو سو آدمی جمع ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں احرام باندھے ہوئے لوگوں کا ایک بڑا گروہ بھی آ گیا جن کے ہاتھوں میں تسبیح اور لمبی داڑھیوں کے ساتھ سر منڈے ہوئے تھے۔ امیگریشن ہال میں ان کے دیر سے پہنچنے کا سبب شاید یہ تھا کہ وہ جہاز سے نیچے اتر کر ایک دوسرے کا انتظار کرتے رہے۔ ان سے ایک عجیب قسم کی بُو آ رہی تھی۔ اصغر نے سوچا، اگر وہ زیادہ دیر ان کے ساتھ کھڑا رہا تو اسے قے آ جائے گی۔ وہ ڈرتے ڈرتے بولا:

"باباجی، آپ پیچھے قطار میں کھڑے ہوں، اس لیے کہ ہم پہلے سے کھڑے ہیں۔"

"بے فکر رہو بیٹا،" احرام والا بولا، "اپنی باری پر ہی پاسپورٹ چیک کروائیں گے۔ ہم جانتے ہیں۔ عمرہ کرنے آئے ہیں، کبھی بے انصافی نہیں کرتے۔"

لیکن جیسے ہی عملے نے کام شروع کیا، احرام والوں نے ایک دم ہلہ بول دیا، قطار میں کھڑے تمام لوگوں کو ایک طرف دھکیل کر آگے ہو گئے۔ اس کشمکش میں اصغر آخر میں جا پہنچا۔ ایک گھنٹے کی ذہنی اذیت کے بعد جیسے ہی اگلے بوتھ پر گیا، کچھ شُرطوں نے اسے گھیر لیا اور پاسپورٹ چھین کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ وہ حیران تھا کہ اب کیا معاملہ ہے؟ اتنے میں شُرطے نے کہا، "الا حاجی، خمسون ریال۔"

"لیکن اتنے تو میرے پاس نہیں،" اس نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں جواب دیا۔

"تو پھر سیدھے مکہ چلو۔ آپ کا ویزا عمرے کا ہے۔ پاسپورٹ آپ کو مکہ میں ملے گا۔ دوسرے کسی شہر میں جانے کی اجازت نہیں،" شُرطے نے کہا۔

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایک تو اس کے پاس احرام نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی ہوٹل میں قیام کر سکے۔ اس کا ارادہ عمرہ کرنے کا تو تھا، مگر پہلے جدہ میں حاجی الطاف کے بیٹوں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ چلتے وقت ان کو فون کر کے اطلاع کر دی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ وہ ایر پورٹ پر لینے آ جائیں گے۔ لیکن اب یہ ایک نئی مصیبت کھڑی ہو چکی تھی۔ اس کے پاس صرف سو ریال تھے۔ کافی دیر معاملے کی نزاکت پر غور کرنے کے بعد اس نے شُرطے سے کہا: "کچھ کم نہیں ہو سکتے؟"

''پچاس ریال دو، ورنہ سیدھے مکہ چلو،'' شُرطہ نہایت بے رحمی سے بولا۔

آخر بے چارگی سے اس نے پچاس ریال شُرطے کے ہاتھ میں دیے اور پاسپورٹ لے کر جس قدر جلد ہو سکتا تھا امیگریشن ہال سے باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس پر ٹیکسی والے ٹوٹ پڑے، مگر وہ ہر ایک کے پاس سے بے نیاز گزر گیا۔ وہ جانتا تھا کہ حاجی الطاف کے بیٹے اسے لینے کے لیے آئے ہیں۔ باہر آکر بڑی دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا، ہر طرف دیکھا، لیکن اسے وہ نظر نہ آئے۔ آخر تنگ آکر ٹیلی فون بوتھ سے انھیں فون کیا تو پتا چلا کہ وہ گھر سے ہی نہیں نکلے تھے۔ البتہ انھوں نے پتا لکھوا دیا اور کہا، ٹیکسی کروا کر خود آجاؤ۔

بیگ کاندھے سے لٹکائے فون بوتھ سے باہر آکر وہ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھتے ہی ایک ٹیکسی والا فوراً بھانپ گیا اور آگے بڑھ کر بولا،'' جناب، پاکستان سے آئے ہو؟''

''جی،'' اس نے کہا۔

''کہاں جاؤ گے؟'' ٹیکسی ڈرائیور نے پوچھا۔

''بنی مالک،'' اور کاغذ پر لکھا ہوا پتا اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کاغذ دیکھ کر واپس کر دیا اور دروازہ کھول کر بیٹھنے کو کہا۔

''پہلے بتاؤ، کیا لو گے؟'' وہ جھجکتے ہوئے ٹیکسی کی طرف بڑھا۔

''بھائی، تم اپنے پاکستان سے آئے ہو، اس لیے چالیس ریال میں پہنچا دوں گا۔''

''چالیس ریال تو بہت زیادہ ہیں۔'' وہ ایک دم پیچھے ہٹا۔

''پھر آپ کیا دو گے؟''

''بیس ریال۔''

''نہ میاں، بیس ریال تو بہت کم ہیں،'' ڈرائیور نے صاف اردو میں جواب دیا۔'' یہاں سے جدہ شہر بہت فاصلے پر ہے، اور پھر بنی مالک تو اس سے بھی آگے ہے۔''

بیگ دوبارہ کاندھے سے لٹکا کر وہ ٹیکسیوں کے حلقے سے باہر نکل کر سوچنے لگا، کیوں نہ شہر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر کسی سے لفٹ لے لے۔ اس طرح پیسے بھی بچ جائیں گے۔ وہ

سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا رہا، یہاں تک کہ ایر پورٹ کافی پیچھے رہ گیا۔ سڑک کے دونوں طرف کھجور کے جھنڈ تھے۔ اس نے اپنا بیگ ایک کھجور کے تنے کے ساتھ رکھ دیا اور چاند کی روشنی میں کھجوروں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا۔ رات کے پچھلے پہر دور تک پھیلے صحرا میں کھجور کے درختوں سے چھن کر گرتی چاندنی اسے ایک عجیب طلسمات میں لے گئی۔ پکی ہوئی کھجوریں بڑی تعداد میں ریت پر اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ اصغر نے جھک کر ایک کھجور اٹھائی اور کھالی۔ کھجور اتنی میٹھی تھی کہ کبھی ایسی لذت نہ ملی تھی۔ وہ چاند کی روشنی میں اور کھجوریں چن چن کر کھانے لگا۔ ہوا سے ہلتے ہوئے کھجوروں کے پتے اس پر سحر طاری کر رہے تھے۔ جب دور سے کسی کار کی روشنی دیکھتا، فوراً سڑک پر آ کر ہاتھ کا اشارہ کر دیتا، مگر کار فرّاٹے سے گزر جاتی۔ اسے کار کے گزرنے پر کوئی افسوس نہ ہوتا، اس لیے کہ کھجوریں کھانے میں کافی مزہ آ رہا تھا۔ کوئی ایک گھنٹے تک وہ کھجوروں کے جھنڈ میں پھرتا رہا۔ بہت سی کھجوریں چن کر اس نے اپنے بیگ میں بھی ڈال لیں۔ اسی دوران صبح کی اذان ہو گئی۔ اذان سنتے ہی وہ دوبارہ سڑک پر آ گیا اور واپس ایر پورٹ کی طرف چل پڑا۔ اب وہ کھجوروں سے اکتا چکا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد شہر پہنچ جائے۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہاں کوئی لفٹ نہیں دے گا کیونکہ وہ پاکستان کو پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ لہٰذا ٹیکسی سٹینڈ پر واپس آ گیا۔

عصر کے وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایر کنڈیشنر نے کمرہ اس قدر ٹھنڈا کر دیا تھا کہ اسے سردی محسوس ہونے لگی۔ ایسے کمرے میں سونے کا آج پہلا اتفاق تھا۔ اصغر نے محسوس کیا جیسے جسم اکڑ گیا ہو۔ وہ کمرے سے باہر آیا تو گرم ہوا نے منہ جلا کے رکھ دیا۔ ایسی ہواؤں کا سامنا اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ خیر، وضو کر کے دوبارہ کمرے میں آیا اور عصر کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ دیر دعائیں مانگتا رہا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کبھی نماز قضا نہیں کرے گا، اور جیسے ہی کام پر لگ گیا، فوراً گھر اطلاع دے گا۔

وہ یہ سوچ کر لطف لینے لگا کہ جن جگہوں کا تاریخ کی کتابوں اور اساطیر کے حوالوں میں ذکر پڑھتا آیا ہے، کل انھیں عین اپنی آنکھوں کے سامنے پائے گا۔ انھی خیالات میں گم شام کے وقت حاجی ناصر کے ساتھ جدہ کی گلیوں میں پھرتا رہا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہزاروں پاکستانی،

Scanned with CamScanner

ہندوستانی اور بنگالی گھومتے پھرتے ہیں۔ بعضوں نے بڑی بڑی ہوٹلیں، ریستوران اور دوسرے کاروبار چلا رکھے ہیں۔ کچھ ایسے بھی نظر آئے جو مانگتے پھرتے تھے۔ وہ ایک جگہ پہنچے جہاں بہت سے ہندوستانی لڑکے، گروہ کے گروہ، کھڑے تھے۔ اس کے پوچھنے پر حاجی ناصر نے بتایا، یہ لڑکے اسی طرح چوراہوں میں کھڑے ہو کر عربیوں کو بلیو فلمیں بیچتے ہیں۔ کچھ لڑکے خود بھی ساتھ بک جاتے ہیں۔ گلی کوچے اور بازار دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے تھے کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ اذان کے ساتھ ہی دکانوں کے شٹر دھڑا دھڑ بند ہونے لگے۔ ریستورانوں کے دروازوں پر وقفۂ نماز کے بورڈ ابھر آئے۔ ہزاروں طرح کی مخلوقات اپنی جیبوں سے ٹوپیاں نکالتے ہوئے مسجدوں کی طرف بھاگی۔ کوئی ذی روح اس وقت سستی نہیں دکھا رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی انھی میں شامل ہو گئے۔

رات اس نے انتہائی بے چینی میں کاٹی۔ حرم کی زیارت کے شوق میں نیند اڑ گئی تھی۔ وہ یہ سوچتا رہا کہ کتنے ایسے بدنصیب ہیں جو کروڑوں روپے کے ہوتے ہوئے بھی حجازِ مقدس کی زیارت سے محروم ہیں۔ انھی خیالات میں خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ وہ جلدی سے اٹھا، غسل کیا اور احرام باندھ لیا۔ حاجی ناصر نے اسے تین سو ریال اور عمرے کے لیے احرام ادھار دے دیا تھا۔ وہ دس ریال کرائے پر ایک ٹیکسی میں سوار ہو گیا جس میں تین آدمی پہلے بھی موجود تھے۔ ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اس نے بے چینی کے ساتھ ڈرائیور سے سوال کیا، ''میاں، حرم کتنے فاصلے پر ہو گا؟''

''ایک گھنٹے میں پہنچ جائیں گے،'' ڈرائیور نے جواب دیا۔

''کعبے کا رقبہ کتنا ہو گا؟'' اصغر نے دوبارہ پوچھا۔

''مافی معلوم یا اخی،'' ڈرائیور نے نہایت سفّاکی سے کہا۔

ڈرائیور کے اس دوٹوک جواب سے وہ دبک کر بیٹھ گیا اور سیٹ کے ساتھ سر لگا کر بڑے انہماک سے سڑک کے دوطرفہ خشک پہاڑوں اور ریگستانوں کو دیکھنے لگا۔ کبھی پہاڑ کے دامن میں کوئی ہٹ نظر آتا اور پیچھے گزر جاتا، کبھی ہوا کا بگولا ریت اڑاتا ہوا آسمانوں کی طرف اٹھ جاتا۔ وہ دل میں گمان کرتا، شاید ان رستوں پر بھی پیغمبر اسلام گزرے ہوں۔ اگرچہ ٹیکسی کی رفتار بہت زیادہ تھی لیکن اسے یہ سفر بڑا طویل لگا۔ وقت گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر اس نے اپنا دماغ تاریخ کے چودہ سو سال پرانے جھمیلوں میں مصروف کر لیا۔ رسولِ پاک کی دعوتِ عام، ابو طالب کی حمایت،

Scanned with CamScanner

ہجرت، جنگِ بدر، احد، خندق وہ انھی سوچوں میں گم تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے اسے یہ کہہ کر چونکا دیا، ''بھائی اترو، حرم آ گیا۔'' یہ سن کر وہ جلدی سے کپڑوں کا بیگ سمیٹ کر باہر نکل آیا۔ سامنے حرم کا مشرقی دروازہ ایک طلسماتی ہیبت سے اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

وہ کھنچتا ہوا آگے بڑھا۔ نسل نسل کے کالے گورے لوگ بغیر اجنبیت کے گھوم رہے تھے۔ ہزاروں کبوتر بے خطر اڑتے اور دوڑتے پھرتے تھے۔ اگرچہ گیارہ کا عمل تھا مگر دھوپ کے باوجود اسے گرمی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ حرم کے اندر داخل ہوا، نفل پڑھے اور مناسکِ عمرہ میں مشغول ہو گیا۔ کعبے کی دیوار کے ساتھ ساتھ اللھم لبیک کہتے ہوئے طواف کیا۔ اگرچہ ہجوم بہت زیادہ تھا لیکن اس نے ہر طوف پر حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ پھر صفا و مروہ کی سعی کی۔ صفا پہاڑی پر سفید لباس میں پریوں کے جھرمٹ اسے اپنی طرف کھینچتے رہے، مگر آج وہ اس قسم کے کسی جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ سعی کرنے کے بعد دوبارہ کعبے کے پاس آ گیا۔ پھر اچانک اس نے مقامِ ابراہیم کو بوسہ دیا تو پاس کھڑے ایک شُرطے نے اس کے کاندھوں پر چھڑی دے ماری۔

''لا، لا، حاجی، ہذا الشرک۔''

''انا العالم،'' اصغر نے جواب دیا۔

''لا، لا، انت الجاہل،'' شرطہ چیخ کر بولا اور چھڑی دوبارہ پیٹ میں چبھو دی۔

اسے شُرطے پر غصہ تو بہت آیا لیکن نظرانداز کرتے ہوئے دوبارہ عبادت میں مشغول ہو گیا۔ عبادت کرنے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنا تصور تاریخ سے جوڑے رکھا تاکہ کعبے کی زیارت کا صحیح لطف آئے، اور حرم کی ہر اس چیز کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جس کے بارے میں اس نے کچھ بھی پڑھ سن رکھا تھا۔ بڑی دیر تک غلافِ کعبہ پکڑے ہوئے دعائیں مانگتا رہا۔ تمام دن حرم میں گزار کر شام سے کچھ پہلے باہر نکل آیا۔

عمرے سے فارغ ہو کر وہ کچھ دوسرے مقامات بھی دیکھنا چاہتا تھا، لیکن تھکاوٹ کی وجہ سے اس نے انھیں کل پر ٹال دیا اور ایک کھلے میدان میں بیگ سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ یہ جگہ ابوطالب کے گھر کے پاس کوہِ ابوقبیس کے پہلو میں تھی۔ وہاں اس جیسے دوسرے کئی لوگ سو رہے تھے جو ہوٹل میں رہنے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ نیند کا غلبہ اس قدر زیادہ تھا کہ اسے کچھ خبر نہ رہی، حتیٰ کہ ایک شُرطے

نے اذانِ صبح کے وقت اسے ٹھوکر مار کر اٹھایا۔
نماز پڑھتے ہی وہ مکہ کے کوچوں میں نکل گیا۔ گلیاں اور سڑکیں انتہائی صاف پتھر لگا کر پختہ کی گئی تھیں۔ پھرتا پھراتا اور پوچھتا ہوا مقامِ حجون پر گیا۔ یہاں خاندانِ رسالت اور بنی ہاشم کی قبریں تھیں۔ ظہر تک اس نے کئی مقامات کی زیارت کر لی اور مسجدِ حرام میں آ کر نمازِ ظہر ادا کی۔ پھر اس کا یہ روزانہ کا معمول بن گیا۔ صبح پیدل نکل جاتا، مکہ کی وادی میں گھومتا پھرتا اور سہ پہر سے پہلے واپس آ جاتا۔

آج اس کا مکہ میں آٹھواں دن تھا۔ کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے بھی ایک سو چالیس ریال خرچ ہو چکے تھے۔ اس نے سوچا، اب اسے جلد مدینہ چلے جانا چاہیے اور وہاں کی زیارت کے بعد فوراً کام پر لگ جانا چاہیے۔
تیس ریال کا ٹکٹ لے کر وہ بس میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک پندرہ سولہ سال کا سیاہ فام لڑکا دو بچیوں کے ساتھ سوار ہوا۔ غالباً وہ دونوں اس کی چھوٹی بہنیں تھیں۔ تینوں اگرچہ کالے تھے لیکن نین نقش میں ایک کشش اور معصومیت ضرور تھی۔ دونوں لڑکیاں ایک سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ لڑکے نے چاروں طرف ایک نگاہ ماری، پھر اصغر کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کچھ ہی دیر میں بس چلی تو سیاہ فام لڑکے نے سکوت توڑا۔
''ما اسمک؟''
''اسمی علی اصغر۔''
''میرا نام عبداللہ ہے،'' سیاہ فام لڑکے نے کہا اور اس کے بعد مختلف ممالک کی کرنسی نکال کر دکھانے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ہر ملک میں دوست موجود ہیں، امریکہ، یورپ، افریقہ، عراق، شام، ہندوستان اور ایران میں۔
''کیا پاکستانی کوئی دوست نہیں؟'' اصغر نے پوچھا۔
''لا، لا بکل باکستانی حرامی بکل سارق،'' وہ ایک دم بگڑ کر بولا۔ ''لا واحد رفیقی من باکستان۔''
یہ سن کر اصغر کا رنگ اڑ گیا اور اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔

Scanned with CamScanner

چند ثانیے اسی خاموشی میں گزرے تھے کہ لڑکا پھر بولا۔ ''وأنتَ مِن الایران؟''

''لم ولکن مِن الباکستان،'' اصغر نے روکھے انداز میں جواب دیا۔

سیاہ فام لڑکے کو ایک دم جھٹکا سا لگا۔ غلطی سے وہ اسے گورے رنگ اور تیکھے نقوش کی وجہ سے ایرانی سمجھے ہوئے تھا۔ اس کے بعد مکمل سکوت چھا گیا۔

مدینہ میں آج اس کا پانچواں دن تھا۔ مسجد نبوی، احد، خندق اور ہر اس جگہ کی اس نے زیارت کی جس کے بارے میں اسے کچھ بھی علم تھا۔ وہ رات دن مدینے کے کھلے بازاروں اور صاف ستھری سڑکوں پر پھرتا اور مضافات میں موجود کھجوروں کے باغوں کی سیر کو نکل جاتا۔ اسے مدینے کے مغرب میں عقیق کی زمین روزانہ عصر کے بعد اپنی طرف کھینچ لیتی، جہاں کھجوروں کی سرسبز و شاداب وادی میں سورج کا نظارہ کرتا، جو آسمان پر اڑتی چھوٹی چھوٹی بدلیوں کو سرخ و سنہری قبائیں پہنا کر شام ڈھلے ہی خشک پہاڑیوں کے اس پار چھپ جاتا تھا۔ حرمِ رسول کے سامنے کھڑے ہو کر بڑی دیر تک درود و سلام پڑھتا۔ اسے ان بدبخت ایرانیوں پر تعجب تھا جو کپڑے کے تھیلوں میں اپنے جوتے ڈال کر مسجد میں لیے پھرتے اور مسجد کی بے حُرمتی کرتے تھے۔

آج وہ چاہتا تھا کہ جی بھر کر مدینے کو دیکھ لے، پھر کبھی آنا نصیب ہو یا نہ ہو۔ اسی احساس سے وہ مسجدِ نبویؐ اور مدینے کی تمام زیارات کرنے کے بعد مغربی حصے کی سیر کے لیے نکل گیا۔ ابھی ایک فرلانگ طے کیا تھا کہ اسے ایک زیرِ تعمیر پلازا نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ اس میں داخل ہو گیا اور سوچا، اگر اسے یہاں بطور راج گیر کام مل جائے تو کیا اچھا ہو۔ اس طرح وہ مسلسل مدینے میں رہ سکے گا، زیارات کے علاوہ روزی بھی کما سکے گا۔ یہ سوچتے ہی اسے ایک مسرت کا احساس ہوا۔ اصغر نے سپروائزر کا نام پوچھ کر اسے اپنا مدعا بیان کیا۔

''کیا کر سکتے ہو؟'' سپروائزر نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''راج گیری کا تمام کام کر لوں گا،'' اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

''ویزا عمرے کا لائے ہو کیا؟'' سپروائزر نے دوسرا سوال کیا۔

''ویزا تو عمرے کا ہے، لیکن اگر آپ کام پر لگا لیں گے تو آہستہ آہستہ کام کرنے کا پرمٹ بھی

بن جائے گا۔"

"اچھا، اس دیوار کو ایک فٹ تک تعمیر کر کے دکھاؤ۔" سپروائزر نے تقریباً دس فٹ لمبی زیرِ تعمیر دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اس نے کام ملنے کی امید میں تیزی سے آگے بڑھ کر اوزار پکڑے اور ایک ماہر کاریگر کی طرح دیوار تعمیر کرنے لگا، حتیٰ کہ کچھ ہی دیر میں ڈیڑھ فٹ دیوار اوپر اٹھا دی، جسے دیکھ کر سپروائزر کی آنکھیں کھل گئیں۔ نمازِ مغرب کے بعد سپروائزر نے اسے کھانا کھلایا اور بتایا کہ وہ بھی گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے۔ دس سال پہلے سعودی عرب آیا تھا۔ اس وقت سے مختلف شہروں میں کام کرتا رہا۔ لیکن پچھلے پانچ سال سے اب وہ مدینے ہی میں ہے۔ سپروائزر نے بتایا کہ وہ بھی پہلے راج گیری کرتا تھا، مگر اقبال صاحب کی مہربانی سے اب اس کی جان اس کام سے چھوٹ گئی۔ "کل جمعہ ہے، پرسوں آجاؤ۔ میں اقبال صاحب سے بات کر کے آپ کو رکھ لوں گا۔"

"یہ اقبال صاحب کون ہیں؟" اصغر نے پوچھا۔

"وہ انجینئر ہیں۔ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کئی کام انھی کی نگرانی میں ہوئے ہیں۔"

"تو ابھی کام پر کیوں نہیں لگا لیتے؟" اصغر بے چینی سے بولا۔

"بھائی، یہاں بہت خطرہ ہے۔ یہ جو شرطے گھومتے پھرتے ہیں، یہ تین تین دفعہ چیک کرتے ہیں کہ کوئی آدمی بغیر پرمٹ کے کام پر تو نہیں لگا۔ انجینئر صاحب کسی سے بات کریں گے، اس کے بعد آپ کو کام دیں گے۔"

عشا کے بعد وہ واپس مسجدِ نبوی کے صحن میں آگیا اور خوش تھا کہ روضۂ رسول کی برکت سے اسے جلد کام مل جائے گا۔

اب اصغر کے پاس کل پچاس ریال تھے۔ اس نے خیال کیا اگر دو تین دن میں کام مل جائے تو وہ جدہ نہیں جائے گا، یہیں رہے گا، اور صبح و شام روضۂ رسول کی زیارت کرے گا۔ اس خیال سے وہ جھوم سا گیا اور اپنے جوتے مسجدِ نبوی کے دروازے پر اتار کر اندر چلا گیا۔ دیر تک حرمِ نبی کے پاس بیٹھا رہا۔ رات دس بجے انتظامیہ نے جب مسجدِ نبوی تمام لوگوں سے خالی کروائی تو وہ بھی باہر نکل آیا اور جوتے ڈھونڈنے لگا، مگر ہزار کوشش کے باوجود جوتے نہ ملے۔

رات اس نے ننگے پاؤں ہی گزاری۔ وہ ایک پلازے کی دیوار کے ساتھ کپڑوں کا بیگ سر کے نیچے رکھ کر سو گیا۔ دوسرے دن صبح کی اذان کے ساتھ جاگ گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے پاس ہی ایک لڑکا بیٹھا ہوا نظر آیا۔ دونوں مسجد میں آئے۔ نماز سے فارغ ہو کر باتیں کرنے لگے۔

''کہاں کے رہنے والے ہو؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''اوکاڑہ سے آیا ہوں،'' اصغر نے جواب دیا۔

''کوئی کام ملا؟''

''ابھی نہیں۔ کسی نے وعدہ ضرور کیا ہے۔ اور تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''میں راولپنڈی کے ایک قصبے راجہ جنگ کا ہوں۔ میرا نام نوید ہے۔ دو سال سے یہاں ہوں۔ آج کل کوئی کام بھی نہیں اور پیسہ بھی ختم ہو چکا ہے۔ رات تمھیں سوتے ہوئے دیکھا تو سوچا، پاکستانی ہے، دوستی ہو جائے گی۔ ویسے کیا کر سکتے ہو؟''

اصغر نے کہا، ''ٹائل، پلستر، پینٹنگ، شیشے کا کام اور معماری جیسا ہر کام کر لیتا ہوں۔''

نوید کہنے لگا، ''احد پہاڑ کے دوسری طرف ایک بستی ہے۔ وہاں ایک بنگالی میرا دوست ہے۔ وہ بھی معماری کا کام کرتا ہے۔ اگر کام کرنا چاہو تو میں تمھیں اس کے پاس چھوڑ آتا ہوں۔ میرا خود بھی اسی کے ساتھ مزدوری کرنے کا ارادہ ہے۔ دوسری سہولت یہ کہ شُرطوں کا اِدھر نام و نشان بھی نہیں۔''

صبح دس بجے سے پہلے وہ احد کی بستی میں پہنچ چکے تھے۔ ناشتہ اور ٹیکسی کا کرایہ دینے کے بعد اس کے پاس صرف پندرہ ریال بچ گئے تھے۔ بنگالی گھر پر نہیں تھا، اس لیے شام تک اس کا انتظار کرنا پڑا۔ اصغر نے چاہا کہ چھوٹے موٹے جوتے خرید لے تاکہ ننگے پاؤں کی خجالت سے بچے۔ وہ دونوں اس بستی کے ایک چھوٹے بازار میں گئے، مگر کوشش کے باوجود انھیں ایسا کوئی جوتا نظر نہ آیا جس کی قیمت پچیس ریال سے کم ہوتی۔ پتھریلی زمین تانبے کی طرح تپ رہی تھی۔ پاؤں زمین پر نہیں پڑتا تھا۔ سورج جیسے جیسے بلند ہو رہا تھا، تپش سر کو پہنچنے لگی۔ دہکتے کنکر تلوؤں کو کاٹتے ہوئے اندر گھس جاتے۔ آخر وہ دونوں ایک کھجور کے سائے میں بیٹھ گئے۔ سہ پہر کے وقت اس نے نوید کو پانچ ریال دیے کہ ہوٹل سے کھانا لے آئے، اس لیے کہ اب وہ ننگے پاؤں ہوٹل تک نہیں جا سکتا تھا۔ نوید کھانا

لایا تو وہ کھانا کھا کر وہیں پر لیٹ گئے، حتیٰ کہ شام ہو گئی۔

''میں آپ کو پچاس ریال فی یوم مزدوری دیا کروں گا۔'' بنگالی نے پان کی رال منھ سے گراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، کھانے اور رہائش کا تم سے کچھ نہیں لیا جائے گا۔ کام اگر ستھرا نہ کرو گے تو مزدوری کاٹ لی جائے گی۔ اور چھٹی کے روز کا کھانا تم اپنی جیب سے کھاؤ گے۔ اگر منظور ہے تو ٹھیک، ورنہ تمھاری مرضی۔ اور ہاں، ایک بات بتاؤں، تمھیں کام پر لگانے کا خطرہ میں اپنی ذمہ داری پہ لے رہا ہوں۔''

بنگالی کی باتوں کے دوران وہ کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ چٹائی، بستر، کھانے کے برتن جو نہایت گندے تھے، اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ ان سے ایک عجیب قسم کی الجھن ہو رہی تھی۔ کمرے کی ہر شے، بنگالی سمیت، اتنی گندی اور بدبودار تھی کہ اسے کراہت ہونے لگی اور جی اوبنے لگا۔ خاص کر جب بنگالی بات کرتا، پان سے آلودہ کالے سیاہ دانت اسے ایک خوف میں مبتلا کر دیتے۔ لہٰذا وہ بجائے بنگالی کی شرائط پر کان دھرنے کے اسی بات پر غور کرتا رہا کہ یہاں رات کیسے کاٹی جائے۔

صبح ہوتے ہی اس نے نوید کو جگایا اور وہ بغیر بتائے چل دیے۔ ٹیکسی کا کرایہ نہ تھا، لہٰذا بجائے پہاڑ کا چکر کاٹنے کے انھوں نے فیصلہ کیا کہ پہاڑ پر چڑھ کر دوسری طرف اتر جاتے ہیں، اس طرح جلد ہی میدانِ احد میں پہنچ جائیں گے۔ پھر وہاں سے مسجدِ نبوی تین کلومیٹر پر ہی تو ہے۔ لیکن جب وہ کافی اونچا چڑھ گئے تو انھوں نے محسوس کیا کہ کام جتنا آسان سمجھ رہے تھے، کچھ ایسا سہل بھی نہیں۔ رفتہ رفتہ سورج کی شعاؤں نے خشک پتھروں کو اس طرح تپا دیا کہ پاؤں رکھنا عذاب ہو گیا۔ اُدھر پہاڑ تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ ایک چٹان ختم ہوتی تو سامنے دوسری آ موجود ہوتی۔ اصغر کے پاؤں میں چھالے پڑ چکے تھے۔ جلن کی شدت تکلیف دے رہی تھی۔ خدا خدا کر کے دو بجے سہ پہر وہ چوٹی پر پہنچے، لیکن اب اترنا چڑھنے سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ ہر طرف بکھرے ہوئے نوکدار گرم پتھر اور کنکر دیکھ کر اس کا دل سہم گیا۔ چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تو بہت تھیں لیکن سایہ نام کو نہیں تھا۔ اس پر ستم یہ کہ پیاس اور دھوپ کی شدت نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آخر اس نے نوید سے کہا، ''بھائی، میں تو اب نہیں چل سکتا۔'' اور ایک چھوٹی سی غار میں ڈھیر ہو گیا جس کے پاس ہی ببول کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں

تھیں۔ کافی دیر لیٹے رہنے کے بعد درد کی ایک شدید لہر سے، جو اس کے پاؤں سے اٹھی، اصغر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا جو اب سوج چکے تھے۔ دور سے مغرب کی اذان کی آواز آ رہی تھی۔ سامنے مسجدِ نبوی کے مینار بھی صاف دکھائی دیتے تھے۔ وہ مسلسل چار گھنٹے سوئے تھے۔ مگر اب بھوک اور پیاس اپنا کام دکھانے لگی۔ چاند مشرق کی طرف سے ابھر آیا تھا۔ انھوں نے دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ پتھروں میں گرمی قدرے کم ہو چکی تھی۔ خشک پہاڑوں کے سکوت میں نرم ہواؤں کا لمس بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے پھوٹ بہے تھے جن سے اب خون بہنے لگا تھا، لیکن پہاڑ کے اوپر چاند کے سائے میں وہ اپنا سفر ملتوی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مسلسل چلتے رہے، لیکن کہاں تک؟ بھوک اور پیاس کی وجہ سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ آخر گیارہ بجے کے قریب وہ ایک جگہ پھر لیٹ گئے۔ اصغر کے پاؤں اب اس قدر چھلنی ہو چکے تھے کہ جس پتھر پر رکھتا، وہ رنگین ہو جاتا۔ درد کی ٹیسیں شدت اختیار کر چکی تھیں۔ جس کی وجہ سے اس پر غشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

آنکھ کھلی تو اصغر نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ شبنم کے قطروں سے چہرہ بھیگ چکا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر کی لیکن نوید وہاں نظر نہ آیا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد آواز دی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ اصغر نے اٹھ کر چلنے کا ارادہ کیا لیکن جیسے ہی بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا، اسے ایک دھچکا سا لگا۔ کپڑوں والا بیگ وہاں موجود نہیں تھا، جس میں اس کا پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات بھی تھے۔ پھر غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ جیب میں چلا گیا، لیکن وہ بھی خالی تھی۔ نوید اس کا بیگ اور پانچ ریال کی پونجی لے کر جا چکا تھا۔

بہر حال وہ خدا کا نام لے کر چل پڑا۔ گرتا پڑتا، تین گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد پہاڑ سے نیچے اترا۔ پیاس کی وجہ سے جان نکلی جا رہی تھی۔ اس نے پانی کے لیے بے چین ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اچانک ایک لوہے کا ڈرم نظر آیا۔ قریب ہی بکریوں کا ایک باڑا تھا۔ باڑے میں سوکھی گھاس کے گٹھے پڑے ہوئے تھے، جنھیں بکریاں کڑ کڑ کر کے کھا رہی تھیں۔ اصغر نے بے تابی سے ڈرم میں ہاتھ ڈالا اور بکریوں کا استعمال شدہ پانی اوک سے حلق میں انڈیل لیا۔ پانی اتنا گرم تھا کہ وہ سینے کو چیرتا ہوا

Scanned with CamScanner

معدے میں اتر گیا جہاں جا کر اس نے مزید آگ لگا دی۔ آنکھیں ابلنے لگیں۔ خیر کسی نہ کسی طرح سے اصغر نے میدانِ احد کا رخ کیا۔ اپنے تمام حواس کو مجتمع کرتے ہوئے، جس قدر ہو سکتا تھا تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کی۔ میدان کے قریب پہنچا تو سامنے والے گھر کے دروازے پر ایک دس بارہ سال کا لڑکا نظر آیا۔ وہ جلدی سے دیوار کے سائے میں گر گیا اور بچے کو اشارے سے پانی کے لیے کہا۔ ٹھنڈے پانی سے پیٹ بھر کر اس کی جان میں جان آئی۔ ابھی وہ لڑکے کو کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس نے اندر ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

بالآخر نقاہت اور کمزوری کے ساتھ وہ زخمی پاؤں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسجدِ امیر حمزہ میں داخل ہو گیا اور منہ پر اچھی طرح سے پانی کے چھینٹے مارے۔ پھر دیوار کے ساتھ بیٹھ کر پاؤں کو سہلانے لگا۔ بھوک نے اب اسے بے بس کر دیا تھا۔ لیکن کسی سے مانگنے کی نوبت آج تک نہ آئی تھی۔ وہ جلد کسی نہ کسی طرح کھانے کا بندوبست کرنا چاہتا تھا، مگر ننگے اور زخمی پیروں کے ساتھ دھوپ میں نکلنے کے تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سوجے ہوئے پیروں سے خون ابھی تک رس رہا تھا۔ وہ اسی تذبذب میں تھا کہ کیا کرے، کہ اتنے میں عصر کی اذان ہو گئی۔ لوگ نماز کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں ایک انوکھا خیال بجلی کی طرح کوندا۔ وہ جلدی سے لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا، ایک عربی نہایت نفیس لباس میں آیا اور اپنے جوتے مسجد کے دروازے کی بیرونی چوکھٹ پر اتار کر اندر داخل ہو گیا۔ جوتے بہت عمدہ چمڑے کے تھے۔ عربی کے مسجد میں داخل ہوتے ہی اصغر جوتے پہن کر تیزی سے مڑا لیکن دروازے کے پاس کھڑے چوکیدار نے اسے پکڑ لیا اور ''سارق! سارق!'' کی آواز بلند کر دی۔ تمام لوگ دوڑے آئے، جیسے اچانک کوئی تماشا لگ جائے۔ کسی نے تھپڑ اور کسی نے لات ماری۔ عربی نے بڑھ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ دو لوگوں نے مل کر مشکیں کس دیں۔ وہ سب اسے عربی میں نہ جانے کیا کیا سوال پوچھتے رہے، جن کا وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ بلکہ بھوک سے نڈھال ہونے کی وجہ سے اب وہ کچھ سُن بھی نہیں رہا تھا۔

''جنابِ عالی، میری آنکھوں کے سامنے اس بدبخت نے شریف نمازی کے جوتے چرائے

Scanned with CamScanner

ہیں۔ یہ دونوں عادل گواہ اور ان کے علاوہ دوسرے بھی کئی لوگ موقعے پر موجود تھے،'' چوکیدار شرعی عدالت میں گواہی دیتے ہوئے بولا۔ چوکیدار کے بعد شاہدین نے باری باری گواہی دی۔

''لیکن ملزم کو صفائی کا موقع ضرور ملنا چاہیے،'' قاضی نے ترجمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ترجمان کے تین بار پوچھنے پر بھی وہ آنکھیں بند کیے کھڑا رہا۔ دراصل اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کانوں میں فقط سائیں سائیں کی آواز آ رہی تھی، بلکہ اسے اب یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کو یہاں کس لیے لایا گیا ہے۔

ملزم کی خاموشی اور خستگی کی وجہ سے قاضی کو یقین ہو گیا کہ وہ ایک عادی مجرم اور پیشہ ور چور ہے۔ بالآخر عدل اور شرعی قانون کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے قاضی نے اپنا فیصلہ سنا دیا، جسے مجرم کے علاوہ تمام لوگوں نے سنا اور تحسین کی۔

صبح کی اذان کے بعد جب اسے ہاتھ کاٹنے کے لیے بندی خانے سے باہر لایا گیا تو وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ ایک ماہر کاریگر ہے، حتیٰ کہ اسے اپنے بوڑھے باپ کی شکل بھی یاد نہ رہی تھی۔

❊❊

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

شہابو خلیفہ کا شک

سیالکوٹ سے پیر مست کی روانگی کی خبر کیا آئی، پورے علاقے میں میلے کا سماں بندھ گیا۔ پچھلے برس کا شکار لوگ کیسے بھول جاتے؟ نگاہوں میں پیر مست کے کتے اور اُن کی طرّاریاں پھرنے لگیں۔ گھر آنگنوں اور چوراہوں میں کتوں کے تذکرے چھڑ گئے۔ جہاں دو لوگ اکٹھے ہوئے، پیر مست کے کتے زیرِ بحث آئے۔ عصر کے بعد تو لڑکے بالوں سے لے کر بڑے بوڑھوں کی ٹولیاں جگہ جگہ اسی ذکر سے روشن ہو جاتیں۔

''میاں کتے کیا ہیں، چیتے ہیں چیتے۔ یوں ایک قدم اٹھا اور پندرہ گز سمیٹ لیے،'' ایک بولا۔

''لو اور سنو! بھائی، وہ تو چلتی پھرتی موتیں ہیں۔ چیتا بچارا کیا جانے کہ شکار کیسے کرتے ہیں؟ پچھلے سال تُو نے دیکھا نہیں،؟ پیر مست کے کالے نے ٹیلے سے اُترتے ہی خرگوش پر کیسی جھپٹ ماری،'' دوسرا کہنے لگا۔

''ہاں! واہ بھئی، مزہ آ گیا تھا۔ ایسی اونچی چھلانگ! میاں خدا جھوٹ نہ کہوائے، کالا پانچ منٹ تک تو ہوا میں ہی رہا، پھر جو ایک پنجہ دیا، خرگوش بچارا بیس بھو مالیاں کھا گیا۔ اور ابھی حواس مختل ہی تھے کہ آنتیں چیتل کے منہ میں تھیں۔ بس جی، جہاں چیتل اور کالا پہنچ گئے، پھر وہاں ملک الموت کی عزت تو خاک میں گئی؛'' دلاور بول اٹھا۔ ''بچارا ہر دفعہ منہ کی کھاتا ہے کہ شکار کی جان اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی کتے نکال لیتے ہیں۔''

غرض جدھر سے گزرتے، پیر مست اور اس کے دونوں کتوں، کالے اور چیتل، کی گفتگو ہو رہی

ہوتی۔ ایک دفعہ تو اسی گفتگو میں بحث اور پھر سر پھٹول تک بات جا پہنچی۔ ہوا یہ کہ خیر محمد بھنگ پیے ہوئے تھا، اور اسی ترنگ میں اس نے کہیں شاہ دین کے فائٹر کی تعریف کر دی۔ اب بھلا یہ کوئی موقع تھا فائٹر کا نام لینے کا؟ کہاں پیر مست کا چیتل اور کہاں شاہ دین لنگڑے کا فائٹر! گویا شیر بکری کو ملا دیا۔ نور خاں کے پیپل کی چھاؤں میں بیٹھے تمام لوگوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔ حیات خاں کا تو خون ہی کھولنے لگ گیا۔

''او شاہ دین کے چوہے! تو نے سمجھا کیا ہے فائٹر کو؟ وہی جو مرغی کو دیکھ کر بھاگ اٹھتا ہے؟ اس سے تو نظام دین کی بکری دلیر ہے،'' ایک طرف سے شامو فوجی بولا، جو فوج سے بھگوڑا ہوا تھا۔

''واہ بھئی واہ شامو! شاہ دین کے فائٹر کو بکری سے مقابل کرنا آپ ہی کے لائق ہے!'' جلال احمد کہنے لگا۔ ''یوں کہو، جیسا گیدڑ شاہ دین ویسا اس کا فائٹر۔''

بس اسی پر شاہ دین کے بھانجے کو طیش آ گیا۔ اُس نے وہیں الٹے ہاتھ سے جلال کے سر پر گنکا جما دیا۔ پھر کیا تھا، کیا جوتے اور کیا لکڑیاں، جو جس کے ہاتھ میں آیا کھینچ مارا، اور پانچ ہی منٹ میں ہر بندہ رنگو رنگی۔ پھر آپ ہی آپ لڑائی بند کر دی کہ یہ ایک فضول کام تھا۔

خیر یہ سب تو ایک طرف، لیکن اگر سچ پوچھیں تو میں کہوں گا، پیر مست کے کتوں کا واقعی جواب نہیں تھا، اس لیے کہ پچھلا شکار میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ساڑھے تین تین فٹ اونچے چمکتے ہوئے بُولی نسل کے سیاہ کتے تھے۔ پاؤں میں چاندی کی جھانجھریں اور چاندی ہی کے زنجیر گلے میں تھے۔ شکار کے پیچھے دوڑتے تو چھن چھن کی آواز آسمانوں کو چڑھتی سنائی دیتی۔ گوشت اور شکار سے اتنے طاقتور ہو گئے تھے کہ ایک کتے کے زنجیر کو دو آدمی پکڑتے، پھر بھی گھسٹتے چلے جاتے۔ شکار کے وقت چھلانگ تو ایسی قیامت کی لیتے کہ نظر چکرا جاتی، گویا بجلی کی کوند آنکھوں کے آگے سے نکل گئی ہو۔ جب سے میں نے شکار دیکھا، آئندہ کا انتظار رہا۔ اور اب وہ موقع دوبارہ آ رہا تھا۔

معاملہ دراصل یہ تھا کہ پیر مست جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کے دادا نے مٹی کی دیوار پر بیٹھ کر حکم دیا کہ ''چل'' تو دیوار چل پڑی تھی، سیالکوٹ کے گاؤں میں رہتے تھے جہاں ان کی بڑی زمینیں تھیں اور پورے پنجاب میں ہزاروں مرید تھے۔

حضرت صاحب نے دو کتے پال رکھے تھے۔ وہ ہاڑ کے فوراً بعد اپنے قصبے سے پیدل چل

Scanned with CamScanner

نکلتے جس کا ایک مقصد تو شکار کرنا اور دوسرا اپنے مریدوں کے ہاں پھیرا لگانا ہوتا۔ قصبے سے نکلنے سے پہلے ایک آدمی رستے میں پڑنے والے تمام گاؤں کو اطلاع کر دیتا۔ پیر صاحب اپنے قصبے سے دو خلیفوں اور دونوں کتوں، چینل اور کالے، کے ساتھ نکلتے، شکار کرتے کرتے پیدل ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک جا پہنچتے۔ رات وہیں بسر کرتے، اگلے دن وہاں سے چار پانچ مرید مزید ساتھ ہو لیتے۔ یوں جیسے جیسے گاؤں در گاؤں فاصلہ طے ہوتا، قافلہ بڑھتا جاتا اور شکار میں رونق پیدا ہوتی جاتی۔ رات جس گاؤں میں قیام ہوتا وہاں پیر مست اور اُس کے کتوں کی اس طرح خدمتیں ہوتیں کہ لوگوں کو رشک آ جاتا۔ خوب مالشیں کی جاتیں، گرم پانی اور سرف پوڈر سے نہلایا جاتا۔ رات کو پیر مست انھیں اپنے ساتھ سلاتا، ایک کو دائیں اور دوسرے کو بائیں طرف۔ اسی طرح پچھلے گاؤں سے قافلے میں داخل ہونے والے مریدوں کی بھی کافی آؤ بھگت ہوتی۔ چونکہ ہر گاؤں میں پیر مست کے کئی مرید تھے، جن میں بہت سے شکار کے شوقین بھی تھے، لہٰذا ہمارے گاؤں پہنچنے تک قافلہ سینکڑوں مریدوں پر مشتمل ہوتا۔ اب جوں جوں ہمارے گاؤں میں پیر مست کے داخل ہونے کے دن قریب آ رہے تھے، جوش و خروش بڑھ رہا تھا۔

پیر مست ہمارے گاؤں میں دو دن قیام کرتا اور گاؤں کے جنوبی ٹیلوں کو شکار کے لیے منتخب کیا جاتا، جہاں کبھی دریائے بیاس پوری جولانی سے بہتا تھا۔ اب وہاں دور تک آک کے پودے، خاردار جھاڑیاں اور ببول کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ نیز کئی اونچے نیچے ریت کے ٹیلے تھے۔ انھی ٹیلوں اور جھاڑیوں میں خرگوش، سؤر، سیہہ اور اسی طرح کی ہزاروں بلیات پڑی پھرتی تھیں۔ بعض لوگوں کو سنا ہے وہاں اژدہے بھی نظر آئے۔ غرض شکار کے لیے یہ علاقہ ایک جنت کی حیثیت رکھتا تھا، اور سچ تو یہ ہے کہ چینل اور کالے کے جوہر بھی زیادہ یہیں کھلتے۔

خیر، خدا خدا کر کے ایک شام پیر مست گاؤں میں وارد ہو گئے۔ کوئی دو سو آدمی ڈھول بجانے والے کے ساتھ استقبال کی خاطر باہر نکل آئے۔ آگے آگے پیر مست اور اس کے کتے تھے جن کے پٹوں میں سونے کے کیل جڑے تھے اور چاندی کی لمبی لمبی زنجیریں خلیفوں نے پکڑی ہوئی تھیں۔ پیچھے سو آدمی اور تھے۔ کچھ آدمی ہمارے گاؤں کے بھی ساتھ تھے، جو ایک دن پہلے ہی آگے سے جا کر مل گئے تھے۔

جونہی پیر صاحب نزدیک آئے، لوگوں نے بھاگ کر پہلے پیر مست کے پاؤں کو بوسے دیے اور پھر کتوں کے منھ سر چومنے لگے۔ اس دھکم پیل میں ہجوم اس قدر بڑھا کہ پیر مست کتوں سمیت بوندلا گئے۔ دوسری طرف ڈھول کی تھاپ اور پٹاخوں کے شور نے سماعت چھین لی۔ بعض گلاب اور چنبیلی کے ہار پیر مست اور کتوں کے گلے میں ڈالنے لگے۔ پھولوں کی پتیاں بکھرنے لگیں۔ جو ہار بچ گئے انھیں خلیفوں کے گلے میں ڈال دیا۔ غرض بڑی دھوم دھام سے پیر مست کو حیات خاں کے چبوترے پر لایا گیا، جہاں چبوترے اور بازار میں دور تک چار پائیاں پہلے ہی بچھادی گئیں تھیں۔ پیر مست اور اس کے کتوں کی چار پائیاں سامنے ہی تخت کی طرح تھیں، جن میں سے ایک پر پیر مست اور دوسری پر چیتل اور کالا براجمان ہو گئے۔ باقی مجمع سامنے بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد تمام لوگوں کی شربت سے تواضع کی گئی، لیکن خاص پیر مست کے لیے صندل تیار کر کے پیش کیا اور کتوں کے سامنے صندل ملے دودھ کا بڑا کٹورا رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد گاؤں والوں کا تانتا بندھ گیا۔ جو آتا، پیر مست کے قدموں میں سر رکھ دیتا۔ پیر مست دو تین بار اسے تھپکی دیتے، پھر وہ کتوں کے منھ اور ہاتھ پاؤں مَس کرتا۔ بعض تو کتوں کو چومتے بھی۔ اس کے بعد بڑے ادب سے پچھلی چار پائیوں پر بیٹھ جاتے۔

رات دس بجے تک لوگ یونہی آتے جاتے رہے اور باتیں ہوتی رہیں۔ پھر اچانک پیر مست نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر جلالی انداز سے وعظ شروع کر دیا۔ مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"بس اللہ سے نزدیکی یہی ہے کہ اُس کی مخلوق سے محبت کرو۔ کسی کو تکلیف دینا بڑا عیب ہے، چاہے وہ کتا ہی کیوں نہ ہو۔ محبت تم پر فرض ہے۔ یہی تمھاری نماز ہے اور یہی زکوٰۃ، علاوہ اس کے روزہ نہ صلواۃ۔ بتاؤ مجھے، کہف کے کتے نے کتنی نمازیں پڑھیں؟ بولو، بلعم باعور کے گدھے نے کتنے روزے رکھے؟ (ہلکے سے توقف کے بعد) گئے دونوں جنت میں۔ کتا بھی اور گدھا بھی۔"

خلیفہ جو دائیں طرف کھڑا تھا، اونچی آواز میں پکارا، "حق ہے سرکار، حق ہے سرکار!"

(کچھ دیر خاموشی کے بعد) "جو محبت کرے گا جس سے، جائے گا وہ ساتھ اُس کے۔ چاہے بندہ کرے محبت ساتھ بندے کے، چاہے کرے محبت کتا ساتھ بندے کے۔"

حق ہے سرکار، حق ہے سرکار!" (خلیفہ مکرر بولتا ہے۔)

رات گیارہ بجے تک یونہی وعظ رہا۔ پیر مست کی رعب دار آواز نے پوری محفل کو اپنے سحر میں لیے رکھا۔

اگلے دن جنوبی ٹیلوں کی طرف روانگی ہوئی۔ دس ڈنڈا بردار آگے ہوے۔ وہ جھاڑیوں پر ڈنڈے مارتے اور عجیب وغریب آوازیں نکالتے، سیٹیاں بجاتے۔ جیسے ہی کوئی خرگوش یا سیہ نکل کر بھاگتا، کتوں کا کام شروع ہو جاتا۔ پیر مست ''حق مدد، ہو!'' کہہ کر کتوں کے زنجیر کھولنے کا اشارہ کرتا۔ پھر تو ایسا جوش وخروش بڑھتا کہ آنکھوں نے دیکھا ہو تو یقین آئے۔ ایسے ہی جھاڑیوں سے ایک گیدڑ نکل آیا جو سیدھا جھیل کی اور بھاگا، مگر دم کے دم میں چیتل نے آگے سے جا گھیرا۔ بچارا اُلٹے قدموں ہوا تو کالا آڑے آیا۔ پھر تو کمبخت نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا پیر مست کے کندھوں کے اوپر سے چھلانگ مارتا ہوا مشرق کو پھرا۔ اس اچانک حملے سے پیر صاحب ٹیلے سے لڑھکے اور کئی قلابازیاں کھا گئے، مگر ریت کی وجہ سے کوئی خاص چوٹ نہ آئی لہٰذا کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوے۔ اُدھر تماشائیوں کی بلے بازی اور ہاؤ ہو نے مزید ہنگامہ کر دیا۔ اِدھر کالا اور چیتل ہوا میں اڑتے ہوے آگے سے ہو لیے۔ اس افراتفری میں گیدڑ بچارا ایسا بدحواس ہوا کہ زمین تنگ ہو گئی۔ کبھی اس جھاڑی میں منھ چھپاتا، کبھی اُس جھاڑی میں۔ لیکن آئی کو کون ٹال سکے۔ جب چاروں طرف سے کتوں نے سمیٹ لیا تو بچارے نے بے بسی سے ایک گھورے میں اپنا منھ ٹھونس دیا۔

جیسے ہی چیتل کے دانت پیٹ میں گھسے، ایک قیامت کی چیخ ایسی بلند ہوئی کہ صحرا تھرا گیا۔ دوسرے ہی لمحے کالے نے ٹانگوں کو جبڑے میں لے کر باہر گھسیٹ لیا، لہٰذا دو ہی منٹ میں پیٹ کھال سے باہر نکل آیا۔ ساتھ ہی ''حق ہو! مدد غوث!'' کا غلغلہ بلند ہوا۔ اس کے بعد کچھ دیر کتے گیدڑ کی لاش سے شغل کرتے رہے، بالآخر ایک فاتحانہ چال سے پیر مست کی طرف مڑ آئے۔ پیر مست نے باری باری دونوں کو تھپکی دی اور عجیب سرشاری سے مسکرایا۔

غرض سہ پہر چار بجے تک ایک گیدڑ، دو سور، تین خرگوش اور ایک سیہ کا شکار کیا۔ پھر سارا مجمع کچھ دیر آرام کے لیے ببول اور جھاڑیوں کے سایوں میں بیٹھ گیا، جبکہ دو خلیفے چیتل اور کالے کی مالش کرنے لگے۔ اگرچہ پیر مست پہلے ہمارے گاؤں میں کئی دفعہ آیا، لیکن میں نے یہ شکار دوسری دفعہ

Scanned with CamScanner

دیکھا، اور ایسا دیکھا کہ آنکھوں میں نظارے بندھ گئے۔ رات دربار جما تو مزے کی گفتگوئیں سنیں۔

''پیر جی دیکھا، چیتل نے تیسرے ٹیلے سے کیسی چھلانگ دی!'' ایک خلیفہ بولا۔ ''حضور، میں نے تو سمجھا کہ میرے سر سے ہوائی جہاز اڑ گیا۔ ایک دم شاں کی آواز آئی۔''

دوسرا خلیفہ بولا، ''میری تو جان ہی ہوا ہو چلی تھی۔ دھم سے اوندھا جا گرا۔''

''حضرت، گیدڑ کو آپ سے گستاخی مہنگی پڑی،'' شامو کہنے لگا۔ ''میں دیکھ رہا تھا، جب آپ لڑھکے تو کالے کے تلووں میں جا لگی۔ میں نے تو سمجھ لیا تھا کہ اب تو گیدڑ کا مثلہ ہو کے رہے گا۔'' شامو کے اس جملے سے پیر مست تھوڑا سا کھسیانا ہوا۔ اُسی لمحے حیات خاں نے شامو کو گھور کے دیکھا۔

''بس پھر بابا جی، آپ نے بھی ایسی قلابازیاں لگائیں کہ ہم تو دنگ ہی رہ گئے،'' شامو نے فوراً ہی لہجہ بدلا۔ ''پہلی بار آپ کی تیزیاں دیکھیں۔''

''ہاں شامو، اگر میں اُسی وقت تیزی نہ دکھاتا تو حرامی کے پنجے آنکھوں میں گھس جاتے،'' پیر مست نے وضاحت کی۔

شیرو چوڑی والا جو ہر واقعے کو منظوم کر دیتا تھا۔ اُس نے گانا شروع کیا۔

ویکھی اج میں نے سگاں کی کمالاں
کالے کی دوڑاں چیتل کی چھالاں
جنگاں میں دیکھے ناں ایسے بہادر
موتاں، قضاواں کے لنگ جاویں باڈر
سوراں تے گیدڑ، سہواں تے گوشاں
رہیاں ناں چیتل کو ویکھ کے ہوشاں

چوڑی والا کی زوردار آواز نے ایسا سماں باندھا کہ جنگ کا نقشہ کھینچ دیا۔

خیر، جب رات کافی گزر گئی اور تھکے ہاروں کو اونگھ آنے لگی تو پیر مست نے اگلے دن کا پروگرام طے کر کے دربار برخاست کر دیا۔

اگلے دن گیارہ بجے تک تمام ٹیلے چھان مارے، ایک ایک کر کے جھاڑی کرید ڈالی، مگر چوہا

تک نہ ملا۔ خدا جانے کہاں گم ہو گئے۔ جیسے جیسے وقت گزرنے لگا، اکتاہٹ بڑھتی گئی۔ ایک بجے کے بعد تو پیر مست نے حوصلہ چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ واپسی کرو کیونکہ شکار صحرا کو چھوڑ کر کہیں کھیتوں میں جا چھپے ہیں۔ ابھی یہ کہہ کر واپس مڑے ہی تھے کہ پاس کی بڑی جھاڑی سے ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک دم سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔ سجان خلیفے نے ایک زور کا ڈنڈا جھاڑی پر مارا تو موٹا تازہ خرگوش فراٹے سے نکلا اور ہوا میں تیر گیا۔ فوراً چیتل اور کالے کے زنجیر کھول دیے۔ ہلا ہو، شور شرابہ شروع ہوا، گویا صحرا جاگ اٹھا۔

لیکن دو تین ہی منٹ میں پیر مست سمیت تمام لوگ حیران رہ گئے۔ چیتل اور کالا برابر کوشش کرتے رہے، مگر خرگوش ہے کہ گھیرے میں ہی نہیں آتا، بیس بیس فٹ کے جمپ مارتا ہے۔ ابھی اس ٹیلے پر، تو دوسرے ہی لمحے اگلے ٹیلے پر۔ دس منٹ بعد تو ایسا لگا کہ خرگوش چیتل اور کالے کے ساتھ مذاق پر اترا ہوا ہے۔ دو دفعہ تو پورے مجمعے کے اوپر سے ہوا کی طرح نکل گیا۔ جب بیس منٹ گزر گئے اور خرگوش نے چیتل اور کالے کو چکرا کے رکھ دیا، تو صلاح ٹھہری کہ لوگ تین طرف بکھر جائیں، ایک سمت خالی رکھی جائے، تاکہ خرگوش سیدھا بھاگے اور کتوں کو بھی کبھی نہ دکھائے۔ خرگوش چند لمحے کسی نہ کسی جھاڑی میں رک کر سانس لے لیتا۔ جب کتے پہنچتے تو پینترا بدل کے اُلٹے ہاتھ نکل جاتا۔ مگر پیر مست کی اس ترکیب نے خرگوش کو چونکا دیا۔ اب وہ پوری طاقت سے سیدھا بھاگنے لگا۔ لیکن کتے بھی اپنی آئی پر آئے ہوئے تھے۔ لحہ بہ لحہ فاصلہ کم ہونے لگا۔ پھر ایک دم کالے نے قیامت کا جمپ لیا۔ مگر قسمت کا کیا کیجیے کہ ہونی آئی تھی۔ خرگوش اسی لمحے رک کر زمین کے برابر ہو گیا۔ کالے نے اتنی تیزی سے قلابازی کھائی جیسے بجلی کا چھپا کا لگا ہو اور سامنے کھڑے ببول کی ایک موٹی سوکھی شاخ سے ٹکرا گیا۔ شاخ کی ایک نوک سیخ کی طرح نکلی ہوئی تھی، وہ کالے کے پیٹ میں اندر تک گھس گئی۔ کالا تو وہیں لٹک گیا، اُدھر خرگوش جھیل کی طرف بھاگ نکلا۔ چیتل، جو خود بھی قلابازیاں کھا گیا تھا، بڑی مشکل سے سنبھلا اور پیچھے ہوا۔

پیر مست اور دوسرے کئی لوگ دوڑ کر کالے کے پاس پہنچے، مگر اتنے میں وہ پورا ہو چکا تھا۔ بس ہلکے ہلکے سانس باقی تھے۔ پیر مست نے یہ دیکھا تو دنیا آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ وہیں غش کھا کر گر پڑا۔ مریدوں نے ہاتھ پاؤں مسلنے شروع کیے۔ کوئی پانی لینے دوڑا۔ ایک کھلبلی مچ گئی۔ لوگوں کے

Scanned with CamScanner

پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ بڑا مجمع پیر مست کے گرد لگ گیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا، کیا کریں۔ پیر کو سنبھالیں یا کتے کو دیکھیں۔

اِدھر تو یہ صورت تھی، اُدھر ہوا یہ کہ خرگوش مغربی سمت میں کیچڑ سے اچھلتا ہوا جھیل میں، اور پھر وہاں سے تیر کر آگے نکل گیا۔ چیتل پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے جیسے ہی تین چار جمپ مارے، سیدھا کیچڑ اور دلدل میں پھنس گیا۔ اب نہ واپس آیا جائے، نہ آگے جایا جائے۔ ناچار، اونچی آواز میں بھونکنا شروع کر دیا۔ اِدھر سے کچھ لوگ دوڑے۔ پگڑیوں سے پگڑیاں باندھیں۔ جب پگڑیوں کا لمبا رسا بن گیا تو مٹی کا ڈھیلا ساتھ باندھ کر چیتل کی طرف پھینکا۔ لیکن ڈھیلا کپڑے سمیت دور جا گرا۔ چیتل لحہ بہ لحہ نیچے دھنس رہا تھا۔ آخر تیسری کوشش پر کپڑا اس کے منھ کے قریب جا گرا۔ چیتل نے فوراً کپڑے کو جبڑے میں جکڑ لیا۔ چار آدمیوں نے زور لگایا۔ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ دلدل سے باہر کھینچا۔ باہر نکلتے ہی کتا نڈھال ہو کر گر پڑا۔

اب گاؤں میں ہر طرف سوگ کی حالت تھی۔ پیر مست رہ رہ کر کالے کو پکار رہا تھا۔ تمام مریدوں کو سانپ سونگھ گیا۔ کالے کی لاش حیات خاں کے چبوترے کے ایک طرف دفن کر کے پھول چڑھا دیے گئے۔ چیتل قبر کے پاس بیٹھا عجیب دردناک آوازیں نکالتا رہا۔ سینے چاک ہوئے جاتے تھے۔ تین چار دن تو سب پر خموشی چھائی رہی۔ آخر پانچویں دن سکوت ٹوٹا، جب پیر مست نے ٹھنڈا ہوکا بھر کر کہا، ''اچھا، کالے، جدائی مقدر میں تھی۔ تو نے جانے میں بڑی جلدی کی۔ اب زندگی بے لطف ہو گئی۔'' اتنا کہہ کر چیتل کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ جب پیار بھرا ہاتھ چیتل کے جسم سے لگا، وہ بے چین ہو کر پیر مست کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ پیر مست اور چیتل کے اس پیار سے لوگوں کے آنسو نکل آئے۔ آخر حوصلے بڑھے تو باتیں دوبارہ شروع ہوئیں۔

''بابا جی، میں نے تو اُسی وقت اندازہ کر لیا تھا کہ یہ خرگوش نہیں، اجل ہے اجل،'' شامو فوجی نے کہا۔ ''بس دن پورے ہو چکے تھے۔''

''حضور، جوڑی کیا ٹوٹی، آسمان ٹوٹا۔ ایسا صدمہ یا تو اُجاڑے کے وقت پہنچا تھا یا اب پہنچا، کالے کی جدائی کا!'' صدا حسین نے ٹھنڈی آہ کھینچی۔

''لطیف بھائی، مجھے تو ایک ہی دکھ ہے کہ اس سارے نقصان کے باوجود خرگوش سالم نکل

گیا۔" خلیفہ بولا۔

"سالم نہیں نکلے گا!" پیر مست ایک دم گرجا۔" چاہے وہ کوئی چڑیل اور بھوت ہی کیوں نہ تھا، چیتل اُسے پھاڑ کے دم لے گا۔"

پیر مست کی آواز میں اتنی کڑک اور لہجہ ایسا دوٹوک تھا کہ مریدین کا پورا حلقہ ایک ہی بار سہم گیا اور مکمل خموشی طاری ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد پیر مست، پھر بلند آواز میں کہنے لگا،" کالا میرا لنگڑا تھا۔ جب تک حرامی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ٹکڑے ہوتے نہ دیکھوں گا، واپس نہیں جاؤں گا، یہاں تک کہ میری قبر بھی کالے کے ساتھ بن جائے۔ تخم پلید میرے کالے کو کھا گیا۔ چیتل کو اکیلا کر دیا۔ حیات خاں! نور اُ بندے بھیج کر ٹیلوں کی ناکہ بندی کرو اور جھیل کے مغرب میں اپنے کتے پھیلا دو۔ حق غوث نے چاہا تو کل یا ہم نہیں یا خرگوش نہیں۔" اتنا کہہ کر پیر مست نے چیتل کو تھپکی دی۔" چیتل! کالے کا بدلہ لیے بغیر نہیں ٹلنا۔ یہ ہمارا اُس سے عہد ہے۔" پیر مست، کی آواز میں تحکم برقرار تھا۔

چیتل پیر مست کی تائید میں دم ہلانے لگا۔

پیر مست کے اس حتمی فیصلے اور جلالت پر شہاب خلیفہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر پیر مست سے کہا،" ویسے تو سرکار آپ کی مرضی، لیکن میں تو کہتا ہوں، واپس چلتے ہیں۔ آثار اچھے نہیں لگتے۔ لگتا ہے ستارے گردش میں ہیں۔ سینکڑوں شکار کھیلے، ایسی ہونی کبھی نہ ہوئی۔"

پیر مست نے کڑک کر کہا،" کیا بکتا ہے! تیرے ہوش تو ٹھکانے ہیں؟ خدا کے بندے عہد سے نہیں پھرتے۔ جب تک بدلہ نہ لوں گا، نیند حرام ہے۔"

"حضور سب ٹھیک،" شہاب دوبارہ جرأت کر کے بولا،" لیکن میں نے رات بُرے بُرے خواب دیکھے، کہ میں قبروں کا مجاور ہوں۔"

"شہابو! اپنی زبان بند رکھ۔ جب تک میں خرگوش کو پھاڑ نہیں دیتا، یہاں سے نہیں ٹلنا،" پیر مست ایک دم گرجا۔

یہ سنتے ہی شہاب خلیفہ سہم کر چپ ہو گیا۔

آج چار سو کے لگ بھگ آدمی اور چیتل کے علاوہ بیس کتے مزید تھے۔ جھیل سمیت تمام ٹیلوں

Scanned with CamScanner

کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور تلاش شروع ہو گئی۔ سہ پہر تک تین سؤر، چار گوہ، کئی ایک چھوٹے موٹے خرگوش شکار ہوئے لیکن مطلوبہ خرگوش کا کوئی اتا پتا نہ ملا۔ اسی طرح دوسرے اور تیسرے دن بھی اُس کی کچھ خبر نہ لگی۔ خدا جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ آہستہ آہستہ اکثر لوگوں کا جذبہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ کئی مرید اپنے گھروں کو چلے گئے، کیونکہ پیر مست نے اپنا اگلا سفر ملتوی کر دیا تھا۔ اس لیے کہ آج اُسے یہیں پر آٹھواں دن تھا اور مزید کئی دن تک تلاش جاری رکھنے کا عہد کیے ہوئے تھا۔ نویں دن شام کا دھندلکا ہو چکا تھا اور جھیل کے پار باجرے کے کھیت میں تلاش جاری تھی کہ اچانک ایک بڑا خرگوش پھر ظاہر ہوا۔ اب خدا جانے یہ وہی خرگوش تھا یا کوئی اور، مگر سب نے یک زبان ہو کر "المدد غوث حق ہُو" کا نعرہ مارا۔ چیتل کا زنجیر کھل گیا، مرا ہوا جذبہ ایک دم بیدار ہو گیا۔ پیر مست ہر لمحے پہلے سے بلند نعرہ مارتا۔ خرگوش نے جب اپنی جان پر بنتے دیکھی تو ایسی طاقت سے دوڑا کہ بھوت نے بھی ایسی تیزیاں نہ دیکھی ہوں گی۔ کوئی اُچھلتا ہوا بڈاوا تھا، کہ پل میں یہاں تو پل میں اُفق کنارے۔ ان کرتبوں سے ہر ایک کو یقین ہو گیا کہ یہ خرگوش وہی ہے جس نے پیر مست کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔ دوسری طرف چیتل کی پھرتیاں اپنا رنگ دکھانے لگیں۔ خرگوش مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا اور چیتل جگر توڑ دینے والے حوصلے سے اُس پر چڑھتا جا رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ اپنے دشمن کو پھاڑ کر دم لے گا۔ ایک کے بعد دوسرا اور پھر تیسرا ٹیلا سمٹتا چلا گیا، جھیل کا چکر کاٹ کر سبز کھیتوں میں داخل ہو گئے۔ ہر گزرتے لمحے میں فاصلہ کم ہوتا گیا اور قریب تھا کہ چیتل خرگوش کو دبوچ لے، لیکن اچانک ہی ایک مایوس کن صورت اُس وقت پیدا ہوئی جب خرگوش گنے کے لمبے چوڑے کھیت میں گھس گیا۔ مگر چیتل نے بھی ہار نہ مانی، پیچھے ہی چھلانگ لگا دی۔ مریدین نے، جو اب تعداد میں پندرہ سولہ ہی رہ گئے تھے، کھیت کو فوراً گھیرے میں لے لیا۔ تھوڑی دیر تک کھیت کے اندر کھڑکھڑاہٹ کی آوازیں آتی رہیں مگر اُس کے بعد خموشی چھا گئی۔ پیر مست سمیت سب لوگ بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ دس منٹ گزر گئے، پندرہ ہوئے، دھندلکا اندھیرے میں بدلنے لگا، مگر اندر سے کوئی ہلچل ہوتی نظر نہ آئی۔ پیر مست کا اضطراب بڑھ گیا۔ وہ بے چینی سے تڑپنے لگا اور اپنے چیتل کے لیے بہت فکر مند ہوا۔ پانچ چھ مرید زبردستی کھیت میں داخل کیے، لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ نامراد باہر نکل آئے کیونکہ ایک تو اندھیرا تھا اور دوسری بات یہ کہ چیتل کی گمشدگی نے ایک خوف پیدا کر دیا تھا۔

Scanned with CamScanner

آخر گاؤں میں آدمی دوڑایا گیا۔ سینکڑوں لوگ پھر اکٹھے ہو گئے، مگر کوئی بھی گنے کے کھیت میں گھسنے کو تیار نہ تھا۔ سب پر خوف طاری ہو چکا تھا۔ اُدھر چیتل ہے کہ اس کی خبر ملنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ جوں جوں رات گزرتی گئی، پیر مست کی حالت غیر ہوتی گئی۔

دن چڑھا تو کئی لوگ ہمت کر کے کھیت میں داخل ہوے۔ دو پہر تک تمام کھیت چھان مارا، لیکن چیتل کی کوئی خبر نہ ملی۔ یوں دوسرا دن بھی ناکام گیا۔ تیسرے دن کھیت کاٹنے کا فیصلہ ہوا، لہٰذا سب نے ٹوکے اور درانتیاں لے کر کھیت پر ہلہ بول دیا۔ ابھی آدھا کھیت کاٹا تھا کہ زمین میں ایک بڑا سوراخ نظر آیا۔ تھوڑا سا جھک کر دیکھا تو ایک دیو قامت اژدہا دور تک لیٹا ہوا پھنکار رہا تھا۔ سب ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔ اس لیے کہ ایسی بلا تو قصہ کہانیوں میں ہی سنتے آئے تھے، دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اژدہے نے غالباً پہلے دن کے شکار میں ہی ٹیلے چھوڑ دیے تھے۔ اُس نے خطرے کی دھمک محسوس کر کے گنے کے کھیت میں پناہ لے رکھی تھی۔ حیات خاں نے فوراً اُس پر دونالی سے ایل جی کے دو کارتوس داغ دیے جنھوں نے لمحے میں اژدہے کا کام تمام کر دیا، اور پھر ٹوچین لگا کر اسے باہر کھینچ لیا۔ پیر مست نے آگے بڑھ کر دیکھا تو چکرا کر گر پڑا۔ دراصل اژدہے نے چیتل کو نگل لیا تھا۔

پیر مست کے گرتے ہی مریدوں میں چیخ چگاڑا شروع ہو گیا۔ کچھ تو پیر کی محبت میں زمین پر لوٹنیاں لینے لگے اور اپنے سر میں خاک ڈالنا شروع کر دی۔ دو چار نے حواس بحال رکھتے ہوے پیر مست کو جلدی سے گاؤں کے ہسپتال میں پہنچایا، لیکن سب بے کار تھا۔ ڈاکٹر نے کہا، ''بابا جی کو دل کا زبردست اٹیک ہوا ہے۔''

اگلے دن صبح تک یہ بحث جاری رہی کہ آیا چیتل کی کوئی نشانی، پنجہ، کان یا کوئی ناخن وغیرہ ہے، جسے پیر مست اور کالے کے ساتھ دفن کر دیا جائے، لیکن کوشش کے باوجود چیتل کی کوئی چیز نہ ملی۔ بالآخر شامو نے کہا، ''کیوں نہ اژدہے کی قبر بھی پیر مست اور کالے کے ساتھ بنادی جائے۔ آخر کو چیتل اژدر کے اندر ہی تو ہے۔''

اب خلیفہ شہاب دین صبح اُٹھ کر روزانہ تینوں قبروں پر جھاڑو دیتا ہے مگر اُس کے دل سے ایک کسک نہیں جاتی کہ آیا تیسری قبر اژدر کی ہے یا چیتل کی؟

❀❀

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

مومن والا کا سفر

گھوڑے کی ڈلکی چال سے تانگے میں ایک ردھم پیدا ہو گیا اور وہ دھلکو دھلکو کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ نہر کی پٹڑی پر دونوں طرف کھڑے شیشم اور پیپل کے اونچے اونچے درختوں نے سورج کا راستہ اس طرح روکا کہ دھوپ کی ایک کرن بھی سڑک پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ بعض درختوں کی شاخیں جھک کر نہر میں چلتے پانی کو چھو رہی تھیں اور بارشوں کے باعث ہوا میں ایک سحر زدہ خنکی تھی۔ اگرچہ مومن والا دو ہی کلو میٹر کے فاصلے پر تھا، لیکن نذیراں کے برعکس میری اور اختر کی خواہش تھی کہ تانگا شام تک یونہی دھلکو دھلکو چلتا رہے اور ہم جھولے لیتے رہیں۔ درختوں کی بعض شاخیں اور پتے جب ہمارے چہروں سے ٹکراتے تو ٹھنڈک ہمارے سینے کے اندر تک اُتر جاتی۔ ہمیں نہ تو نذیراں کے مقصد سے سروکار تھا اور نہ ہی ان بگلوں کی کوئی پروا تھی جنھیں ہم ٹوکرے میں بند کر کے، تانگے پر لادے مومن والا لے کے جا رہے تھے۔ لیکن ٹھہریے، مناسب ہے کہ میں اس کہانی کے پس منظر سے تھوڑا سا آپ کو آگاہ کر دوں۔

ہمارا گاؤں انگریزی منصوبے کے تحت ماڈل ولیج تھا، جس میں ڈاکخانہ، اسکول، ہسپتال، یونین کونسل اور اسی طرح کی تمام شہری سہولتیں موجود تھیں۔ خاص ہمارے گھر کے سامنے یونین کونسل کا دفتر تھا، جس میں اونچے اونچے سینکڑوں درخت جھنڈ کے جھنڈ تھے۔ خدا معلوم کس وقت سارے جہان کے بگلوں نے انھیں اپنا مسکن بنا لیا۔ شروع شروع میں تو بگلوں کی آمد بڑی اچھی لگی۔ درختوں پر گویا برف کے سفید گالے جا بجا بکھرے پڑے ہوں۔ جب برسن اور دھان کو پانی لگتا تو یہ ٹولیوں

•

Scanned with CamScanner

کی ٹولیاں کھیتوں پر ایسے اترتیں جیسے پریوں کے اکھاڑے ہوں، اور رات کے وقت شاخوں پر ذرا سا ہلنے میں عجب طرح کی کھڑ کھڑاہٹ ہوتی جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ساز بجاتی چلی جاتی۔ لیکن رفتہ رفتہ ہمیں معلوم ہوا کہ ان کی ہمسائیگی اتنی بھی خوش کن نہیں جیسی ہم نے خیال کی تھی، بلکہ وہ زحمت ہی زحمت ہے۔ جدھر دیکھو بیٹیں ہی بیٹیں، اور بارشوں میں اس قدر بدبو پھیلتی کہ سانس لینا عذاب ہو جاتا۔ ایک طرف تو یہ وبال، دوسری طرف بال و پر اس قدر بکھرتے کہ آس پڑوس کے کھانے پینے کی اشیا بھی مشکوک ہو جاتیں۔ لہٰذا محلے والوں اور چیئرمین کونسل کے باہمی مشورے سے درختوں کی شاخیں کاٹنے کا فیصلہ ہوا تاکہ بگلے اپنا ٹھکانا بدل لیں۔ لیکن اس عمل میں ایک خرابی یہ تھی کہ بگلوں کے سینکڑوں بچے بارہ مہینے پیدا ہوتے رہتے جو اُڑ نہ سکتے تھے اور ان کی جان کو خطرہ تھا۔ مگر کب تک کوئی ان کے بارے میں سوچتا۔ یوں بھی اس دفعہ مون سون کی بارشوں نے وہ اُدھم مچایا کہ کچی دیواریں اور مکان ایک کر دیے، اور بگلوں کی بدبو اتنی پھیلی کہ الامان۔ بیماریاں پھوٹ پڑنے کا خدشہ ہو گیا۔ لہٰذا درختوں کی چھوٹی بڑی شاخیں کاٹ دیں جس کی وجہ سے تمام بگلے اُڑ گئے۔ گھونسلے بکھرے تو بگلوں کے بچے گر گر پڑے۔ بہت سے تو گرتے ہی مر گئے۔ جدھر دیکھتے، سینکڑوں پرندے بکھرے پڑے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لاشیں دور تک پھیلی ہوئی نظر آتیں۔ کیا سڑکیں اور کیا یونین کونسل کا صحن، ایک مقتل کا نقشہ دکھائی دیتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص گزرتا، انھیں دیکھ کر رو پڑتا، کہ اس سے پہلے گاؤں والوں نے ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا۔ جو بال و پر نکالے ہوئے تھے وہ اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے جیسے اپنی جانیں بچانے کے لیے کوئی ٹھکانا ڈھونڈتے ہوں۔

نذیراں کو خبر ہوئی تو بھاگتی ہوئی آئی، ایک بڑا ٹوکرا ہاتھ میں تھا۔ میں اور میرا چچا زاد نیکریں پہنے ننگ دھڑنگ کھیل رہے تھے۔ ہمیں حکم ہوا کہ جلدی سے بگلوں کے بچے پکڑ پکڑ کے ٹوکرے میں ڈالو۔ ہمیں تو کھیلنے کو ایک کام مل گیا۔ بھاگ بھاگ کر بگلے پکڑنے لگے، ہماری بلا سے کہ اس کا کیا مقصد ہے۔

اصل میں ہمارا گاؤں اردگرد کے دس پندرہ گاؤں کا مرکز تھا جس کی یونین کونسل کے لیے ایک چیئرمین بذریعہ ووٹنگ منتخب ہوتا۔ اس دفعہ مومن والا کا لال دین منتخب ہوا۔ مومن والا ہمارے گاؤں سے کوئی اڑھائی کلومیٹر دور، نہر کے کنارے واقع تھا۔ نذیراں، جسے تمام گاؤں نے ایسے ہی مفت کی

Scanned with CamScanner

ممبری دی تھی، گاؤں میں کوئی نہ کوئی شغل یا ہنگامہ کھڑا کیے رکھتی۔ ہر پنچایت میں کرسی بچھائے سب سے آگے بیٹھتی۔ کہیں شادی بیاہ ہو، میت اُٹھی ہو یا لڑائی جھگڑا، یہ برابر شریک ہوتی، اور میلے ٹھیلوں سے لے کر ناجائز بچے کی پیدائش تک میں ملوث رہتی۔ جھوٹ بولنے میں ایسی ماہر کہ آپ کسی کا نام لے لیجیے، یہ اس کی سات پشتوں تک اپنی رشتے داری گنوا دے گی۔ کہیں کوئی دعوت ہوتی، یہ بن بلائے جا دھمکتی اور اتنا کھاتی کہ گھر والے ہائے ہائے کہہ اٹھتے۔

لال دین چونکہ نذیراں کی مخالف پارٹی کا تھا، لہٰذا جب دفتر میں آکر براجمان ہوتا تو اس کی چھاتی پر سانپ پھر جاتا۔ جو اصل ممبر تھے انھیں تو تکلیف ہوتی مگر نذیراں کی 'مدعی سست اور گواہ چست' والی حیثیت تھی، بڑھ چڑھ کر اپنے کو پانچوں سواروں میں رکھتی۔ اب جو درختوں کی شاخیں کاٹی گئیں تو لڑائی کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔

''ہائے، کافر کے بچے نے مخلوقِ خدا پر کیا ستم ڈھایا۔ دیکھو تو کتنا ظلم ہوا! اب تو گاؤں پر عذاب گر کے رہے گا۔ میں کہتی ہوں، یا اللہ! جس طرح اس نے تیری ننھی ننھی جانوں کو مارا، تُو بھی اسے ایسے ہی دربدر کر کے مار۔''

غرض لال دین کو موٹی موٹی گالیاں دیے جاتی اور ہمارے ساتھ مل کے بگلوں کے بچے پکڑ پکڑ کر ٹوکرے میں ڈالتی جاتی۔ جب ٹوکرا بھر گیا تو تانگے والے کو بلا بھیجا۔ اُس وقت ہم کوئی دس برس کے ہوں گے۔ کہنے لگی، ''چلو لڑکو! بگلے لالو کے گھر چھوڑ کے آئیں۔ حرامی جب انھیں پالے گا تو مزہ آ جائے گا۔'' ٹوکرے کے اوپر بڑا سا کپڑا باندھ کر تانگے کی پچھلی سیٹ پر رکھ لیا۔ اگلی سیٹ پر نذیراں پسر گئی اور ہمیں ہودے میں بٹھا لیا۔

تانگا جیسے ہی نہر کے پل پر پہنچا تو نذیراں کی آواز تیز ہو گئی، جو پہلے ہی کافی اونچی تھی۔ یہاں تک کہ لال دین کے گھر کے سامنے تانگا رک گیا۔ ہم دونوں نے تو ایک ہی جھٹکے میں چھلانگ مار دی، جبکہ نذیراں کو اُترنے میں کافی دیر لگی کہ اس کا جسم ایک موٹی تازی بھینس کے برابر تو ضرور ہو گا۔ پھر بڑے آرام سے ٹوکرا کھول کر نیچے رکھا گیا اور لال دین کے دروازے پر دستک دے دی۔

کچھ ہی دیر میں لال دین دھوتی پہنے باہر آیا اور نذیراں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پھر بڑی

Scanned with CamScanner

گرمجوشی سے آگے بڑھ کر بولا، "اے نذیراں، تجھے خدا اُٹھائے! آج تو یہاں میرے گھر کیسے پہنچی؟"

نذیراں دایاں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے ایک دم بھڑک کے بولی، "لال دین، میں نے سوچا کہ آج تیرے ساتھ دو دو ہاتھ کر ہی آؤں۔ درختوں کی شاخیں کاٹتے وقت تجھے موت نہ آئی؟ ہائے اللہ، یہ ظلم تو میری جان کو کھا گیا۔ ہزار جانیں مر گئیں۔ کیا دودھ ایسے سفید فرشتوں کو مار دیا! خدا تیرا بیڑا غرق کرے۔ دیکھ، اب میں تیرے ساتھ کیا کرتی ہوں۔ خدا کی قسم، تجھے گاؤں میں گھسنے دوں تو شہاب دین کی بیٹی نہیں۔ تو تو بگلے مار کر آرام سے بیٹھا ہے، اُدھر ہمارے گاؤں پر خدا کا قہر نازل ہو گیا۔"

لال دین معاملے کی نزاکت کو بھانپ کر جلدی سے گھر میں داخل ہوا۔ اس کے جانے کے چند ثانیوں بعد ایک لڑکا اندر سے رنگین پایوں والی بڑی چارپائی اٹھا لایا۔ چارپائی ڈیوڑھی میں بچھا کر ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ڈیوڑھی کے سامنے سے صاف پانی کی ایک ندی گزرتی تھی جس کے کناروں پر نیم کے بڑے بڑے درختوں کی چھاؤں میں دور تک بھینسیں بندھی تھیں۔ شاید ان میں سے کچھ بھینسیں لال دین کی بھی ہوں۔ ابھی ہمیں بیٹھے پانچ ہی منٹ گزرے تھے کہ لال دین سفید کرتے اور جامنی رنگ کا لاچا باندھے حقہ لے کر دوبارہ باہر آ گیا۔

اس نے حقہ نذیراں کے آگے رکھ دیا مگر نذیراں کا پارہ سوڈگری سے اوپر تھا۔ مسلسل گالیاں دیتی رہی اور حقے کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔ لال دین تحمل سے گالیاں سنتا رہا لیکن بجائے غصے ہونے کے ہنستا رہا۔ جب نذیراں گالیاں اور طعنے دیتے دیتے تھک گئی اور خاموش ہوئی تو لال دین آہستہ سے بولا:

"نذیراں، یہ تو میں جانتا ہوں کہ ہماری پوری یونین کونسل میں تیرے جیسا عقلمند کوئی نہیں۔ جتنا کام گاؤں والوں کے لیے تو نے کیا اُس کی کوئی مثال نہیں۔ میں جس قدر تیری عزت کرتا ہوں وہ میرا دل جانتا ہے۔ اب تو جو چاہے سمجھ۔ البتہ درختوں کی شاخیں کاٹنے میں مجھ سے زیادہ تیرے اپنے گاؤں کے لوگوں کا ہاتھ ہے۔ لیکن پھر بھی تو جو سزا دینا چاہے مجھے قبول ہے۔"

لال دین نے بات کچھ ایسی ملائمت سے کی کہ نذیراں خود بخود نرم پڑ گئی۔ لیکن حقہ گڑگڑاتے ہوئے مسلسل بڑبڑاتی بھی رہی اور لال دین کو بھی کوستی گئی۔ لال دین مسلسل ہنس کے ٹالتا رہا، کہ اتنے

Scanned with CamScanner

میں وہی لڑکا میٹھی لسی کا ایک بڑا جگ لے آیا۔ اول تو نذیراں نے لسی پینے سے انکار کر دیا مگر لال دین کے مسلسل اصرار پر وہیں بیٹھے تین گلاس پی گئی، کہ ایک تو گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت، لسی کچھ زیادہ ہی مزہ دے گئی تھی۔ نذیراں کے بعد کوچوان اور پھر ہم دونوں لسی پر ایسے ٹوٹے کہ مزید دو جگ پی گئے۔

لسی پینے کے بعد دونوں طرف خاموشی چھائی رہی لیکن پھر نذیراں نے سکوت توڑا اور لال دین کی طرف منہ کر کے بولی جبکہ لہجہ پہلے کی نسبت دھیما تھا:

''دیکھ میاں لال دین، بگلوں کے پورے دو سو بچے میں اپنے گھر چھوڑ آئی ہوں۔ اگرچہ گناہ سارے کا سارا تیرا ہی ہے، لیکن پھر بھی ہمارے گاؤں کی بات ہے۔ آخر میں بھی تو گاؤں کی ممبر ہوں۔ سو جو میرا فرض بنتا تھا، میں نے ادا کیا۔ تھوڑے سے بگلے تیرے پاس لے آئی ہوں تاکہ ہم ان کی پرورش کریں۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹوکرے سے کپڑا کھول دیا۔ کپڑا کھلنے کے ساتھ ہی بگلے پھدک پھدک کر باہر نکلنے لگے، جنھیں ہم پھر بھاگ بھاگ کر پکڑ لائے، مگر آدھے کے قریب ٹوکرے کے اندر ہی دم گھٹنے سے مر گئے تھے۔

لال دین نے تمام زندہ بگلے گھر بھجوا دیے اور پھر بڑی مروت سے نذیراں کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ نذیراں نے دو تین دفعہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے اصرار کر کے بٹھالیا اور کہا کہ روٹی کھا کے جانا۔ تھوڑی دیر بعد میں اور میرا اچھا زادندی میں کود پڑے اور پانی میں نہانے لگے جو نیم کی چھاؤں اور خنک ہواؤں کی وجہ سے اور بھی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ لال دین اور نذیراں نہ جانے اس عرصے میں کیا باتیں کرتے رہے، کہ اُن دنوں سیاست، ممبری، عدالت جیسے الفاظ ہماری سمجھ میں نہ آنے والے تھے۔ لہٰذا وہ باتیں کرتے رہے اور ہم نہاتے رہے، جبکہ کوچوان بھینسوں کے آگے پڑی ہوئی گھاس اٹھا اٹھا کر اپنے گھوڑے کو کھلاتا رہا۔ آدھ گھنٹہ اسی طرح گزرا کہ چائے بن کر آ گئی۔ پھر ہم سب مزے سے چائے پینے لگے۔ چائے کے دوران بھی نذیراں اور لال دین باتیں کرتے رہے مگر ہم نے دیکھا کہ اب نذیراں لال دین سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، گویا کبھی کوئی مخالفت تھی ہی نہیں۔ چائے پینے کے بعد کچھ ہی دیر بیٹھے ہوں گے کہ اچانک لال دین نے کہا:

''نذیراں، تو نے میرا گھر تو اندر سے دیکھا ہی نہیں، چل دیکھ تو سہی میری بیوی نے کیا

Scanned with CamScanner

خوبصورت نقش ونگار بنائے ہیں۔ وہ بھی تمھیں ملنا چاہتی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ نذیراں بھی۔

جب نذیراں اور لال دین دوبارہ واپس آئے تو ایک بج چکا تھا۔ میں نے سوچا، کاش نذیراں لال دین کے گھر میں نہانے کی بجائے ہمارے ساتھ اسی ٹھنڈے پانی میں نہا لیتی تو اسے کتنا مزہ آتا۔ اور لال دین کو دیکھو، گھر کے سامنے اتنے ٹھنڈے پانی کی ندی جاری ہے اور یہ احمق نلکے کے گرم پانی سے نہا کے نکلا ہے۔

اب ہم سوچ رہے تھے کہ جانے کب واپسی ہوگی۔ بلکہ کوچوان نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو لال دین نے اسے پھر بٹھا دیا کہ روٹی کھا کے جانا، تھوڑی دیر میں ہی تیار ہو جائے گی، جبکہ نذیراں تو اب اُٹھنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں دو ایک چارپائیاں اور بچھ گئیں جس پر گاؤں کے پندرہ بیس لوگ مزید آ بیٹھے۔ اب بھلا نذیراں کی زبان کب رکتی تھی۔ چھوکریوں کے کیریکٹر سے ہوتی ہوئی سیاست اور پھر وہاں سے روم ومصر کے موضوعات لپیٹ دیے۔ بیچ میں ایسے ایسے لطیفے چھوڑے کہ بعض مرد تو شرم سے لال ہو گئے۔

اب نذیراں کے ساتھ کوچوان اور ہمیں بھی لال دین کا گھر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا، جسے دیکھ کر کم از کم مجھے بہت مایوسی ہوئی، کہ اس سے تو اچھا ہمارا اپنا گھر تھا، نہ جانے نذیراں ایک گھنٹہ کیا دیکھتی رہی۔ پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ اسے نہانے میں بھی تو وقت لگا ہوگا۔ برآمدے میں دو چارپائیوں کے درمیان ایک میز پر کھانا لگا تھا۔ کھانے میں حلوہ، بھنا ہوا گوشت اور تندور کی روٹیاں تھیں۔ ہم چاروں صبح کے بھوکے تو تھے ہی، سارا کچھ چٹ کر گئے۔ ہمارے کھانے کے دوران لال دین مسلسل حقہ پیتا رہا جبکہ نذیراں ہڑپ ہڑپ کھاتی گئی اور ہمیں کہتی جاتی، ''کھاؤ کھاؤ، آج ہی تو لال دین ہاتھ لگا ہے۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا کہ نذیراں سے پالا پڑا ہے۔'' گوشت اگرچہ اتنا مزے کا نہیں تھا مگر ہم نے برتن خالی کر دیے، اور پھر حلوہ بھی کھا گئے۔

کھانے کے بعد دوبارہ چائے بن گئی، جسے پینے میں ہمیں پہلے سے بھی زیادہ مزہ آیا۔ اس کے بعد نذیراں نے حقے کے دو چار مزید کش لیے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب چار بج چکے تھے اور ہم چلنے کے لیے بے چین تھے، باہر نکل کر تانگے پر بیٹھ گئے۔ مگر چلنے سے پہلے لال دین نے پچاس

Scanned with CamScanner

روپے نکال کر کوچوان کو دیے کہ یہ کرایہ میری طرف سے رکھ لو۔ نذیراں کی آنکھوں میں ایک تشکر آمیز چمک پیدا ہوئی۔

تانگا چلنے لگا تو نذیراں نے لال دین کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کیا اور کہا، "لال دین، اب شاید خدا تیرا گناہ معاف کر دے کہ تو نے ہماری بہت خدمت کی۔ اگرچہ تیری بیوی کو گوشت پکانا نہیں آتا کہ اس کا ذائقہ کچھ اچھا نہیں تھا۔"

لال دین گھر میں داخل ہوتے ہوئے رکا اور شرارت آمیز لہجے میں بولا، "نذیراں، بگلوں کے گوشت کا ذائقہ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بٹیرے لے آتی تو وہ پکوا دیتا۔"

یہ سن کر نذیراں لال دین کو دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگی جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو جبکہ ہمیں قے شروع ہو گئیں، اور کوچوان نے جلدی سے تانگا بھگا دیا۔

❋❋

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

شاہ مدار کی پازیبیں

''شاباش مونگیا، شاباش! مار ایک چونچ اور۔ پھڑکا دے اسی جگہ دُم کٹیے کو۔ واہ، ارے واہ وا، ہت ترے کی! مار ایک اور۔ ہا آ آ، واہ بھئی واہ!''

جوں جوں مرغوں کی لڑائی میں تیزی آتی گئی، بابے چراغ دین کی آواز بلند ہونے لگی۔ سینکڑوں آدمی ہوں گے کہ اردگرد جمگھٹا تھا۔ ہر چونچ کی ضرب پر داد کے ڈونگرے برستے۔ ''ارے واہ، شاباش، کاٹ دے کلغی، پھاڑ دے پوٹا!'' کی آوازیں کان بہرے کیے دے رہی تھیں۔

ادھر شریفے لٹھ باز نے جب اپنے مرغ کو پٹتے دیکھا تو تماشائیوں کے ساتھ اپنے مرغ کو بھی کوسنے لگا۔ ''او حرام کے پٹھے، گھر پھونک دیا تیرے باداموں کے عوض۔ بیوی میکے بھیج دی۔ اور تُو نے مُنہ کالا کروا دیا۔ ہت ترے حرام خور کی! اللہ قسم، آج ذبح کر کے نہ کھایا تو شریفا لٹھ باز نہیں۔''

لیکن مرغ نہ اٹھا۔ جب چونچوں پہ چونچیں کھانے لگا تو بابا چراغ دین نے آگے بڑھ کر اپنا مونگیا پکڑ لیا، جس کی اپنی کلغی بھی خون میں نہا رہی تھی۔ اچھے نے شریفے کو دلاسا دیا اور اس کا مرغ اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیا، جسے لے کر وہ چپکے سے نکل گیا۔

ادھر پورے کا پورا مجمع چراغ دین کے گھر میں جمع ہو گیا، اور لگے دور دور کی ہانکنے۔

''میں نہ کہتا تھا، مونگیے کی رگوں میں جلالی خون ہے۔ خدا کی قسم دو منٹ اور نہ پکڑتے تو پٹا پھاڑ دیتا۔''

''بھئی، چونچ میں کاٹ تو ذوالفقار ایسی ہے۔ مخالف کو تو گویا کافر سمجھ کے لیتا ہے۔ خدا

سلامت رکھے، بیسیوں لڑائیاں لڑیں اور برابر عزت رکھی۔"

"میاں، مونگیا کوئی ایسا ویسا مرغ تھوڑی ہے۔ لکڑ دادا نے جب واجد علی شاہ کا دربار چھوڑا تو وہاں سے ایک مرغ ہی ساتھ لیا تھا۔ مونگیا اسی کی نسل سے تو چلا آتا ہے،" بابے چراغ دین نے آرام سے کلغی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجمعے کو مخاطب کیا۔

پھر تمام لوگ رشک سے اسے دیکھنے لگے۔ آدھی رات تک وہاں مرغ بازی، بٹیر بازی اور کبوتر بازی پر ہی گفتگو رہی، اور گڑ کے میٹھے چاولوں کی ضیافت بھی۔

گاؤں میں یہ واحد ایسا گھر تھا جسے آپ پورے گاؤں کا گھر کہہ سکتے ہیں۔ دو کنال کا کھلا احاطہ، جس کے چاروں طرف دیوار نہیں تھی بلکہ کانٹے دار لکڑیوں کی باڑھ کر دی گئی تھی تاکہ ملکیت کا پتا چلتا رہے۔ اندر تین چار کمرے ہوں گے جن کی دیواریں گارے مٹی کی اور چھتیں گھاس پھوس کی تھیں۔ سردیاں آتیں تو بھینسیں بھی انھیں کمروں کے اندر بندھتیں۔ میں نے بابا چراغ دین کو کبھی کام کرتے نہیں دیکھا۔ جب بھی احاطے میں داخل ہوا، پہلے سیدھی نظر اسی پر رُکتی۔ بڑی کلغی کا ایک اصیل مرغ گود میں ہوتا۔

چراغ دین کے اوپر نیچے چھ بیٹے تھے، جو باپ کے نقش قدم پر پورے پورے چلے۔ انھوں نے گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا تھا۔ سینکڑوں کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کرتے پھرتے۔ ہر جھونپڑے کی چھت پر چار چار کبوتر اتارنے کی چھتریاں۔ جدھر دیکھو کنالیاں پڑی ہیں جن کے اندر کبوتروں کا دانہ پانی سوکھتا رہتا۔ اِدھر اُدھر بیسیوں کابکیں لٹک رہی ہوتیں اور ایک سے بڑھ کر ایک بٹیریں۔ شیشم کے پیڑ گھنا سایہ کیے رکھتے۔ گھر کے پہلو سے نالا گزرتا جہاں سے سہ پہر کو خوب چھڑکاؤ کیا جاتا۔ درختوں کے سائے میں جب ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتے تو بھیگی مٹی کی خوشبو دماغ میں اترتی چلی جاتی۔ سائے اتنے گھرے تھے جیسے سیاہ بادل امڈے ہوں۔

دن بھر جو چاہتا چلا آتا۔ حقہ پیتا، گپیں ہانکتا اور اٹھ جاتا۔ اجازت کیسی؟ جب دیکھو، بیس بیس لوگوں کا مجمع لگا ہے۔ کبوتر بازی اور کنکوّے پر بحث چھڑی ہے۔ گھر کاہے کو، ایک ڈیرہ کہہ لیجیے۔ چھ کے چھ بھائی صبح پانچ بجے اٹھتے۔ نو بجے تک، چار گھنٹے ریت ڈھونے والی ٹریکٹر ٹرالی پر

Scanned with CamScanner

مزدوری کرتے، جو دریا سے شہر میں ریت لے کر جاتیں۔ نو بجے سے لے کر دن بارہ بجے تک بھینسوں کا چارا تیار کر لیتے۔ یہ ان کا معمول تھا۔ دن کا بقیہ حصہ کھیل دھندوں اور کبوتر بازی میں نکلتا۔

میں چونکہ ان کا پڑوسی تھا، دیوار سے دیوار ملی تھی، اس لیے اکثر اُدھر ہی رہتا۔ بارہ ٹہنی، اڈّی کھڈی، شطرنج، کون سی گیم ہے جو ان سے نہیں سیکھی۔ ہاں تاش سے انھیں نفرت تھی، نہ جانے کیوں۔ یہ عمر بھر مجھے بھی نہ آئی۔

دن میں بیسیوں مرتبہ آپس میں لڑتے۔

''دیکھ، میں نے کہہ دیا نا! میرے کالسرے (کبوتر کا نام) کو ہاتھ نہ لگا، ورنہ سر پھوڑ دوں گا۔''

''ہاں، دیکھا میں نے تجھے۔ آیا کہیں نادر شاہ کا نطفہ! کالسرے کا تُو کیا لگتا ہے؟''

''میں کہتا ہوں تو مجھ سے ابھی قتل ہو جائے گا! (اپنی ماں کی طرف مخاطب ہوتے ہوے) مائی، جیدے کو سمجھا لے، ورنہ سمجھ لینا کہ تو نے ایک جنا ہی نہیں۔''

مائی چراغن نے بھی گالیاں دینی شروع کر دیں، اور ایک سے بڑھ کر ایک تیز۔ اِدھر یہ کلہاڑیاں اور درانتیاں اٹھا کر مقابل آ گئے۔ بس پھر کیا، پورا گھر دو حصوں میں بٹ جاتا۔ بابا چراغ دین کبھی ایک کے گدّی پر مارتا، کبھی دوسرے کے دھول جماتا اور آخر تھک کر بیٹھ رہتا۔ مگر یہ ہیں کہ چھوٹ چھوٹ پڑتے۔ گالیوں کا شور اس قدر بلند اٹھتا کہ پل میں سارا گاؤں اِن کے گھر ہوتا۔ کوئی ایک کو پکڑتا ہے کوئی دوسرے کو۔ بڑی مشکل سے چھوٹ چھٹا ہوتا۔ مگر اس سارے دنگے میں مجال ہے جو ایک چھڑی بھی کسی کو لگ جائے۔ خیر، ابھی تو یہ عالم تھا اور ابھی پھر کنکوے پر بحث جاری ہے۔

شروع شروع میں تو لوگ گھبرا جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ وہ ان کی لڑائی سے لطف لینے لگے۔ سچ پوچھیے تو اب وہ انتظار میں رہتے کہ دیکھیں کب تماشا لگتا ہے۔

لو بھائی، میرے بھی حیف ہے۔ میں نے ان کے نام تو ابھی بتائے ہی نہیں۔ وارث، جو سب سے بڑا تھا، کوئی بھی کام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس کے نیچے صادق عرف صادھا اور نیچے آیئے تو گاگڑ۔ اس کا اصلی نام مجھے بھی یاد نہیں۔ چوتھے درجے پر جیمل، اس کا بھی اصلی نام خدا جانتا ہے۔ پانچواں ارشد عرف اچھا اور جیدا (جاوید) چھٹا ہوا۔ پہلے تینوں شادی شدہ، اور میں نے ان گنہگار

آنکھوں سے تینوں کو بیویوں سے پٹتے دیکھا۔ دو چار دفعہ نہیں، یہ روز کا معمول تھا۔ گاگز جسم میں تو ہاتھی تھا مگر جب بیوی جھاڑو پکڑتی تو یہ دوسرے بھائیوں کی پناہ میں دوڑا آتا۔

گرمی اور جاڑے میں یہ آج تک امتیاز نہ کر سکے۔ جون جولائی کی دھوپ ہو یا کڑاکے کی سردی، لباس میں تبدیلی یا پاؤں میں جوتے کبھی نہ رکھے۔ لباس کیا، ایک دھوتی اور کرتا۔ اس سے آگے اللہ ہی اللہ۔ اس معاملے میں باپ بیٹوں کا دستور ایک ہی تھا۔

ہر فرد، چودھری سے لے کر مصلی تک، برابر ان کا دوست تھا۔ بارہا میں نے دیکھا، کوئی دو فرد آپس میں لڑے تو یہ آدھے ایک طرف ہو گئے اور آدھے دوسری طرف۔ خود بھی مخالف پارٹیوں کی طرف سے ہو کر لڑنے لگے۔ یہ ترکیب ایسی کامیاب رہتی کہ لڑائی لمحوں میں ختم ہو جاتی۔ ہمارے گاؤں میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو گا جو اِن سے بڑھ کر مفلس ہو، مگر یہ ہیں کہ تمام گاؤں کو اپنے سے زیادہ مفلس جانتے ہیں۔ سردی کا موسم نعمت تھا۔ دیسی سرسوں کا ساگ، جو وسطی پنجاب کے دیہاتوں میں عام ہوتا ہے اور بلا قیمت حاصل ہونے والی سبزی ہے، قریب قریب چار ماہ بلا ناغہ پکتا۔ جب دیکھو چولھے پر ہنڈیا چڑھی ہے۔ اس کے ساتھ روٹی کا تکلف بھی کم ہی کرتے۔ بس صبح، دوپہر، شام ساگ کھائے جاتے ہیں اور گنے چوستے ہیں، کہ اس علاقے میں یہ بھی عام اور مفت ہیں۔ گرمی کا موسم اِن پہ اگرچہ مشکل گزرتا، مگر کسی نہ کسی زمیندار سے ایک کنال زمین لے کر سبزیاں اگا لیں اور تمام گرمیاں گزار دیں۔

کوئی مانگنے والا آیا تو کمال نیازمندی سے ایک دوسرے کو کہتے، دو یار اِسے، بیچارا غریب ہے، اور اٹھا کر کچھ دے دیتے، یوں کہ حاتم کے سر پر جوتے۔ سونے کے لیے کھلے صحن اور تاروں کی چھاؤں میں چارپائیاں لگ جاتیں۔ پھر آدھی رات تک ایسے ایسے بول اٹھاتے کہ مزہ ہی تو آ جاتا۔

پانی چِنک کے جاندیے تارے، نی لگ لوے بُلارے
تینوں سدّا یار غلاما تے کھڑی ہو کے گل سُن جا

غرض دوہے، ٹپے اور ہیر وارث شاہ ایسے سُر میں پڑھتے کہ واہ کہتے ہی بنتی۔ ادھر ایک بھائی نے دوہا بولا، دوسرے نے گرہ لگائی۔ دور کی نکڑ میں پڑی چارپائی پر لیٹے ہوئے تیسرے نے اگلا مصرعہ اٹھا دیا، اور دوہا مکمل۔ باپ سمیت ساتوں ایک کے بعد ایک دوہے اور ٹپے اونچی آواز میں بولتے اور

Scanned with CamScanner

لوگ اپنے اپنے گھروں میں پڑے سنتے۔

چور اچکے ان کی وجہ سے گاؤں میں آتے ہوئے ڈرتے۔ ذرا کوئی آدمی بازار سے گزرا نہیں کہ انھوں نے چور چور کا شور مچایا۔ لیجیے، اب تو گاؤں کے مُردے بھی جاگ اٹھے اور چور کو بھاگتے ہی بنی۔

کبوتر باز چاہے ولی ہو مگر ایک عیب ان میں ضرور ہوتا ہے، اور یہ ایک عیب ہزار عیبوں کی جڑ، کہ جا و بے جا دیواریں پھلانگتے پھرنا۔ اس میں اچھے کو کمال حاصل تھا۔ چار میل پر اڑتا کبوتر بھی اس کی نگاہ سے نہ بچتا۔ بس ایک دفعہ نظر آنے کی دیر ہے، پھر تو یہ جا وہ جا۔ آخر پکڑا جاتا، چاہے دشمن کی دیوار پر کیوں نہ بیٹھا ہو۔ اس معاملے میں بہت دفعہ سُبکی بھی ہوئی۔ سردار نبی احمد سیال کی بیوی صحن میں چارپائی کھڑی کرکے اور اس کی ایک طرف سے اوٹ لے کر نہا رہی تھی کہ اچھا ایک کبوتر کے تعاقب میں دیوار پھلانگ کر سیدھا اس کے سر پر آ کھڑا ہوا۔ وہ بیچاری کپڑے ڈھونڈتی رہ گئی اور یہ چارپائی کے پائے پر بیٹھے کبوتر کو دبوچ کر انھی قدموں واپس دوڑ آیا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔ شام کے وقت خوب ہنگامہ ہوا۔ دونوں طرف سے لاٹھیاں نکل آئیں، مگر حاجی لطیف نے بیچ پڑ کر معاملہ دبا دیا اور معافی شافی سے بات ختم ہوئی۔ اسی طرح بہت دفعہ پنچایتیں ہوئیں مگر یہاں عادت کی مجبوری، کہ ایک بار کبوتر پکڑنا ضرور ہے۔ جس دن آسمان صاف اور نیلا ہوتا، جو گاؤں میں اکثر ہوتا ہے، اس دن تو دو چار کبوتر ضرور پکڑے آتے۔

یوں تو کون سا قصبہ یا دیہات ہے جو کبوتر بازی سے ماورا ہے، مگر جیسا شوق اس کا ہمارے علاقے میں تھا، اُودھ میں کہاں ہوگا۔ خاص کر چراغ دین کا گھر تو اس واسطے موزوں ترین تھا۔ ہمارا گاؤں جس کے اردگرد تیس پینتیس گاؤں اور تھے، ان میں کوئی پانچ سو کے لگ بھگ کبوتر باز ہوگا، جو ہمارے گاؤں کے اسکول میں ہر سال پندرہ جون کو اپنے اپنے کبوتروں کے ساتھ جمع ہو جاتے۔ اسکول کی بڑی گراؤنڈ، جو پانچ ایکڑ پر محیط تھی، اس کام کے واسطے جگہ قرار پاتی۔ صبح آٹھ بجے شرطیں بندھ جاتیں اور کبوتروں کی پالیاں فضا میں بلند ہو جاتیں۔

کالسرے، چٹے، چینے، غلوے، جونسرے، دُم چیرے، ڈبے، اُنٹے اور نہ جانے کن کن نسلوں کے رنگ برنگے ہزاروں کبوتر آسمان کی نیلگوں فضاؤں میں حسین رنگ بکھیر دیتے۔ آسمان

ایک دلہن کی طرح نکھر جاتا۔ پتا نہیں اس دن گرمی کی شدت کہاں چلی جاتی۔ ننگے پاؤں دوڑتے پھرتے۔ کبوتر باز تو ایک طرف کہ وہ تو اپنے کبوتروں کا پیچھا کرنے کے لیے دوڑتے ہی تھے، خود ہم لڑکے بالے جس کبوتر میں دلچسپی لیتے اسے دیکھنے کے لیے کوسوں فاصلہ بغیر تھکے طے کر جاتے۔ اس کے علاوہ کبوتر بازوں کے چٹکلے۔

''دیکھ خان محمد، تیرا ڈبا بیٹھیں کر رہا ہے۔ زمین پر ابھی آیا کہ آیا،'' اچھے نے کہا۔

''جالنڈورے، اپنا کام کر۔ پانچ من بادام کھلائے ہیں، زمین پر آنے والا نہیں۔ آسمان پر جائے گا آسمان پر۔ تُو اپنے جونسرے کی خبر لے۔ اس کی دُم خدا کی طرف ہو گئی،'' خان محمد آنکھ ٹیڑھی کر کے بولا، ''ابھی آدھ گھنٹے میں قصہ فیصل ہو جائے گا۔''

دوسری طرف سے شفیع چبوترے والا بولا، ''خان محمد، یہ ڈبا تو نرا مرغی کی نسل سے ہے، تیرے بادام تو آج حلال کرنے سے رہا۔ البتہ چاقو میں لے آیا ہوں۔ یہ لے، گرتے ہی اس کے پھیر دینا۔''

''ہاں دیکھا ہے میں نے تیرے غلوے کو۔ کبوتر کاہے کو، بطخ پال رکھی ہے بطخ۔ دیکھ تو سہی، ایسے اڑ رہا ہے جیسے تپ دق کا مریض ہو۔''

ادھر شیدا مصری نے ہانک لگائی (اس کی جیب میں ہر وقت مصری ہوتی)، ''ابا کی قسم، کبوتر نہیں، ہمارا کالسرا شکرا ہے شکرا! دیکھو تو، ہر چکر میں پندرہ فٹ اوپر نکل جاتا ہے۔ نیچے اڑنا تو اس کے لیے شرم کی بات ہے۔''

''ہاں، اللہ میاں سے کچھ دنیاوی معاملات طے کرنے جا رہا ہے!'' جمیل نے ایک طرف سے پھبتی کس دی۔ ''دیکھنا ایک نہیں بجے گا اور یہ زمین چاٹ لے گا۔''

اِدھر تو یہ نوک جھونک جاری، اُدھر حمید امراثی ڈھول بجائے جاتا ہے۔ کچھ لونڈوں کا اس کے گرد حلقہ جما ہے۔ سارے دن کی گہما گہمی عید کا سماں باندھ دیتی۔ (ہائے وہ دن کیا ہوئے!) الغرض دن کا نصف حصہ تو انھی لطیفوں میں گزرتا اور داد کے ڈونگرے برستے، مگر ایک بجے کے بعد کبوتروں کے ساتھ کبوتر بازوں کے چہروں کا رنگ بھی اڑنا شروع ہو جاتا۔ جس کا کبوتر بیٹھ جاتا وہ کبوتر باز بھی بیٹھ جاتا۔ پھر تو ایک کے بعد ایک، کوئی یہاں گرا، کوئی وہاں گرا والی صورت حال پیدا ہو جاتی۔ نعروں اور پٹاخوں کی گونج کان پھاڑے دیتی، گویا ہمارے گاؤں میں جنگ کا ہنگامہ ہو۔ ایسے حالات میں

Scanned with CamScanner

اچھے اور جمیل کا نیلے پروں والا فضاؤں کو عقاب کے جذبے سے چیرتا دکھائی دیتا۔ آخر کوئی چھ بجے منتیں کر کے اتارتے۔ شام میٹھے چاولوں کی دیگیں پکتیں اور بازی کے جیتے ہوئے پیسے اُدھر نکل جاتے۔ یہ ویسے کے ویسے، کہ مال جس راہ سے آیا تھا اسی راہ نکل گیا۔ پچھلے کئی برسوں سے یہی معمول تھا۔

چودھری لطیف اپنے بیٹوں کے ساتھ لندن گیا تو اس نے اپنی چھ ایکڑ زمین اچھے کے حوالے کر دی اور ہدایت کی کہ جو حصہ آئے، سال بہ سال میرے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا۔ گاؤں چونکہ زرعی حیثیت سے بہت آگے تھا، دو نہریں گاؤں کو کاٹتی ہوئی گزرتیں اور ان سے نکلنے والے بیسیوں ندی نالے زمین کو سیراب کرتے، اسی لیے گاؤں سرسبز و شاداب اور سایہ دار درختوں سے بھر گیا۔ جدھر کو نظر کیجیے، برگد، پیپل، جامن اور آم کے درختوں کا ایک سلسلہ تھا۔ زمین کا ارشد کے ہاتھ لگنا تھا کہ یہاں چکر ہی اور ہو گئے۔ چھ بھائیوں نے وہ محنت کی، وہ پسینہ بہایا کہ پہلے سال ہی فصل دُگنی ہوئی۔ پھر کیا تھا، باداموں کے توڑے اور سُچے موتیوں سے پیالے بھر گئے۔

مکان کا اور اپنا نقشہ تو کیا بدلنا تھا، البتہ کبوتروں، بٹیروں اور مرغوں کے مزید دن پھر گئے۔ اس سے اگلی فصل پر نئی کابکیں اور چھتریاں بن گئیں۔ ایک بڑا ٹیپ ریکارڈر خریدا گیا۔ اب سارا سارا دن اس پر عالم لوہار، مہدی حسن اور نور جہاں سُنے جاتے۔ مزید دو سال گزرے تو ایک وی سی آر لے لیا گیا، جس پر سلطان راہی کی فلمیں چلتیں۔ ہر شام ایک جشن کا سماں ہوتا۔ کوئی دو سو آدمی اکٹھا ہو جاتے۔ حاجی کی فلم لگتی (سلطان راہی کو حاجی کہتے تھے) اور اس کے ہر ایکشن پر اچھا اٹھ اٹھ کے گرتا۔ دوسرے دن فلم کی اسٹوری ہر اس شخص کو سناتا جس نے رات فلم نہ دیکھی ہوتی، اور یوں ایکشن بنا بنا کے سناتا کہ مزہ آ جاتا۔ میں نے بہت دفعہ جی میں چاہا کہ کاش میں فلم نہ دیکھتا، اچھے سے اسٹوری سن لیتا۔ کبوتر بازی کے مقابلے بھی مزید زور و شور سے ہونے لگے۔

زمین کاشت کرتے چار سال گزر گئے۔ چودھری سال بعد آتا تو یہ اس کا حصہ اس کی جھولی میں لا رکھتا۔ چودھری بجائے خود ایک نیک انسان تھا۔ وہ بھی سب وہیں غریبوں میں بانٹ دیتا۔

لندن میں اس کے بیوی بچے عرصے سے رہ رہے تھے۔ وہاں اپنا گھر تھا اور سوائے ایک تنگی

Scanned with CamScanner

کے اُدھر کوئی مشکل نہ تھی، کہ گھر کے کام کرنے والا ڈھنگ کا کوئی ملازم نہ ملتا تھا۔ اول تو مہنگے ہوتے، دوسری ان میں خرابی یہ ہوتی کہ کام بھی ادھورا کرتے۔

پچھلے سال چودھری گاؤں آیا تو عجیب خبر لایا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ ارشد کے لیے لندن سے ویزا لایا ہے۔ خبر کیا تھی، جنت کا پروانہ تھا۔ تمام گھر ناچنے لگا۔ خوشی میں آکر کئی کبوتر اڑا دیے (شام کو دوبارہ پکڑ لیے جب جوش ٹھنڈا پڑا) اور ایک بھینس بیچ کر سارے گاؤں کی دعوت کی۔ نیا لباس خریدا گیا، جسے ارشد ''شنٹ پینٹ'' کہتا۔ گاؤں میں کون گھر ہوگا جہاں نہ گیا ہو۔ برا بھلا معاف کروایا اور ایک ایک کبوتر اور بٹیر کو ہاتھ پھیرا، سو سو بار چوما، ایسے کہ خود ہمارے بھی آنسو نکل آئے۔ بارہ فروری کو لندن کے لیے رخصت ہوا تو پورے گھر پر یوں نظر ماری جیسے مرنے والا ہو۔ آدھا گاؤں رخصت کرنے آیا اور دھاڑیں مار مار کے روئے۔ خود میں اسے شہر تک چھوڑنے گیا۔

''میاں، سب سے پہلے میں تو اپنے شاہ مدار (مرغے کا نام) کے لیے پانچ تولے سونے کی پازیبیں بناؤں گا، باقی کام بعد میں،'' بابے چراغ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

عارف جو بھینس کا دودھ دوہ رہا تھا، بولا، ''لو اور سنو، یہ صرف پانچ تولے کو روتا ہے! میاں جی، یہاں تو اب مرغے کے مرغے سونے کے آئیں گے۔''

''اونھ! مرغے سونے کے آئیں گے!'' جیدا پھنکارا۔ ''ریت ڈھوتے ڈھوتے سینے میں ریت کی فیکٹری لگ گئی اور یہ مرغے خریدیں گے۔ میں تو اب پندرہ دن سے زیادہ کام نہیں کروں گا۔ پہلے اپنی تین چار ٹریکٹر ٹرالیاں خریدیں گے، اس کے بعد باقی سب کچھ دیکھا جائے گا۔''

جیمل جو ایک طرف کلھاڑے سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا، کہنے لگا، ''ٹریکٹر چلائے گا تیرا باپ؟ تجھے تو گدھی ہانکنا نہیں آئی۔ سب سے پہلے جونسرے کی گانی خریدی جائے گی۔''

''بکواس بند کراوئے اونٹ کے تھوبڑے والے! گدھی ہانکے تیرا باپ، یہاں تو ایں جانب چاند گاڑی تک چلا لیتے ہیں،'' جیدا دوبارہ بولا۔

''صاحب، میرا تو ایک ہی فیصلہ ہے،'' عارف کہنے لگا۔ ''پہلے تو خریدیں گے کوئی دو ہزار ایکڑ

زمین۔ پھر اس میں تربوز بوئیں گے اور جی بھر کے کھائیں گے۔ اس کے بعد لاہور کا چڑیا گھر خریدیں گے، جہاں پر اپنی مرضی کے جانور رکھیں گے۔''

''پتر، مجھے تو بس ایک ہیرے کا کوکا اور سونے کا کنٹھا بنوا دینا۔ اس آخری عمر میں ہی سہی، کچھ تو شوق پورا کر لوں،'' مائی چراغن آٹا گوندھتے ہوئے لجاجت سے بولی۔

''مائی، تو فکر نہ کر،'' صادق نے باپ کے ہاتھ سے حقے کی نے پکڑتے ہوئے کہا،'' تیرا تابوت بھی سونے کا بنائیں گے، بلکہ مصر سے خریدلیں گے۔ سنا ہے ان کے ہاں بڑے عمدہ تابوت پڑے ہوئے ہیں۔''

''تابوت خرید اپنی ساس کے لیے، اپنے سُسر کے لیے! تابوت خرید اپنی اس چڑیل بیوی کے لیے!'' اور چمٹا پکڑ کر مارنے کو دوڑی۔ ادھر وہ ہنستے ہوئے باہر بھاگ گیا۔

الغرض بڑے بڑے منصوبے طے ہوئے جس کے لیے برطانوی حکومت کا پورا بجٹ بھی کم پڑ جاتا۔ ہر تیسرے دن خط لکھا جاتا۔ اس میں روزانہ کی ڈائری، کبوتروں کا احوال، بٹیروں اور مرغوں کی تفصیل بتائی جاتی۔ اُدھر سے بھی بغیر تعطل کے برابر جواب آتا جس میں بار بار اپنے کبوتروں کا ایک ایک کر کے حال پوچھا جاتا۔ اور جب مئی کے پہلے ہفتے پچاس ہزار روپیہ آیا تو پورا گھر باؤلا سا ہو گیا۔ پیسے خرچ کرنے کی جگہ نہ سوجھتی تھی۔ اسکیمیں بننے لگیں اور طرح طرح کے موضوع زیرِ بحث آئے۔ گاؤں کے ایک دو چودھریوں سے بھی مشورہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ ابھی تو ابتدا ہے۔ صرف یہ پچاس ہزار ہی تو نہیں، اس کے بعد بھی تو اب پیسے آتے رہیں گے، لہٰذا ان پیسوں سے تمام کبوتر بازوں کی دعوت کی جائے اور اب کے جون میں جو کبوتر بازی کا مقابلہ ہو، اس میں ایک شاندار جشن بھی منایا جائے، جس میں کسی اچھے گلوکار کو سنا جائے۔ بس پھر کیا، پندرہ جون تو سر پر آ گیا تھا، جشن کے اشتہار چھپ گئے۔ ارد گرد کے تمام گاؤں میں اطلاعیں کروا دیں، اور تمام تفصیل اچھے کو پہنچا دی گئی کہ اس دفعہ ایسا شاندار مقابلہ ہو گا جو اِن کانوں نے سنا نہ آنکھوں نے دیکھا۔ پھر دوسری طرف سے بھی خط پہ خط آنے لگے۔ یوں کرو اور ووں کرو۔ جیسے جیسے دن قریب آتے گئے، اضطرار بڑھتا گیا۔ بابے چراغ دین کے گھر میں رونق دُگنی ہو گئی۔ ایک اٹھتا تو چار آ بیٹھتے اور وہ وہ قصّے کہتے کہ پیشہ ور داستان

Scanned with CamScanner

گوؤں کے کان کاٹتے۔

صبح چھ بجے ہی کبوتر باز اسکول کی گراؤنڈ میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔(اسکول میں ان دنوں تعطیلات ہوتی تھیں۔) حمید امراثی ڈھول لے کر آ گیا اور اس نے زور سے ڈھول پر تھاپ لگانی شروع کردی۔ سایہ دار درختوں کے نیچے ماشکی نے چھڑکاؤ کر دیا اور چارپائیاں بچھ گئیں۔ دیگوں کا سامان بہم پہنچایا جانے لگا۔ ساڑھے سات بجے تک تمام خلقت جمع ہوگئی۔ بابا چراغ دین سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شاہ مدار مرغ گود میں تھا۔ آج گاؤں کے چودھری بھی صبح ہی سے آ بیٹھے۔ ہر طرف اتنی گہما گہمی اور زور شور تھا جیسے شاہ کبیر کا میلا ہو۔

بابے چراغ دین نے سوچا، اے کاش کوئی کیمرا لگا ہوتا تو یہ سارا سماں اچھا لندن میں بیٹھا دیکھتا اور کتنا خوش ہوتا۔ بہر حال، اگلے سال جب چھٹی پر آئے گا تو پھر ایسا ہی ایک جشن اور کرا دیں گے، بلکہ اب تو ہر سال ایسا ہی جشن کرائیں گے۔

پورے آٹھ بجے ریگلے سے ایک پٹاخہ چھوڑا اور اس کے ساتھ ہی ڈھول پر تھاپ پڑنے لگی۔ پھر نعروں کی گونج اٹھی۔ ایسا شور بلند ہوا کہ کان پھٹنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی تمام کبوتر فضا میں بلند ہو گئے۔ اس پر ڈھول کی تھاپ اور نعرے مزید زور پکڑ گئے، پٹاخے اور ہوائیاں چھوٹنے لگیں۔ یوں کہ ہر طرف شور ہی شور۔ کان جیسے کچھ سنتے ہی نہ ہوں۔

پھر اچانک اس شور میں رکشے کی پھٹ پھٹ نے مزید اضافہ کر دیا، جس میں سے نکلتے ہوئے اچھے نے ''یا علی مدد!'' کا نعرہ لگایا اور بھاگ کر اپنے جونسرے کو اڑتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اچھے کا نعرہ سُن کر بابے چراغ دین کا دل بیٹھ سا گیا۔ اس نے حسرت سے اپنے شاہ مدار کے پاؤں کی طرف دیکھا جو پازیبوں سے خالی تھے۔

❁❁

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

تابوت

مجھے دیکھتے ہی آفتاب بولا: ''یار علی دو منٹ پہلے آجاتا تو کیا اچھا تھا۔ اس کمینے نے آج مجھے تیسری دفعہ مات دی۔ یہ اتنا بڑا سور ہے— ''اگلا لقمہ ڈاکٹر نے اچک لیا:— ''کہ ایک کتے سے قابو نہیں آتا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر منور بیگ ہم دونوں کی نسبت اچھا شاطر تھا، پھر بھی میں اور آفتاب مل کر اس پر حاوی ہو جاتے۔ منور بیگ کا کلینک گاؤں کے چوک میں واقع تھا جس کے ایک طرف جامع مسجد تھی اور سامنے پکی اور صاف ستھری سڑک گزرتی تھی جس پر ٹریفک بالکل نہ تھا مگر سارا دن اکا دکا آدمی ضرور گزرتے رہتے۔ سڑک کے دوسری طرف پارک تھا جس میں کھجور کے چھ سات اونچے درخت بھی تھے جو دیکھنے والے کو بھلے لگتے۔ سڑک اور پارک دونوں ویران تھے۔ غالباً گاؤں کے لوگوں کا ایسی چیزوں میں دھیان نہیں رہتا۔ میرا اور آفتاب کے دن کا بڑا حصہ کلینک پر ہی گزرتا۔ ڈاکٹر اچھا شاطر ہونے کے علاوہ حاضر جواب اور بذلہ سنج آدمی تھا۔ اس سے بات کر کے آسان نکل جانا مشکل تھا۔ ہر فن مولا ایسا کہ گھر کا چولھا بنانے سے لے کر مریضوں کی دوائیاں تک خود تیار کر لیتا۔

آفتاب کے پاس امریکہ کا گرین کارڈ تھا۔ گرمیوں میں چلا جاتا، چھ سات مہینے مزدوری کرتا، اور نومبر چڑھے لوٹ آتا۔ پچھلے بیس سال سے یہ اس کا معمول تھا۔ سرطان کا مریض بھی تھا، لہٰذا ڈاکٹروں نے اسے سگریٹ منع کیے ہوئے تھے۔ گھر سے باہر آتا تو بیگم چھوٹا لڑکا ساتھ کر دیتی کہ ابا کا خیال رکھے اور سگریٹ پینے پر اسے خبر کرے۔ اِدھر اس نے بچے کو رشوت پر لگا دیا تھا کہ ہر سگریٹ

کے پانچ روپے لے لیا کرے مگر اپنی امی کو نہ بتائے۔

ہم آفتاب سے اکثر امریکی معاشرے پر بات کرتے، جس پر وہ مزے لے لے کر سناتا کہ ایک دفعہ فلاں سے عشق کیا تو یہ گزری، فلاں سے عشق ہوا تو یہ بیتی۔ ہمیں بتاتا کہ امریکیوں کا دل اتنا کھلا ہے کہ ایک لڑکا جو میرے ساتھ کام کرتا تھا اسے میں نے کہا، یار، تمھاری بہن کیا غضب کی خوبصورت ہے۔ بولا، آپ کی اس سے بات کراؤں؟ میں نے کہا، نیکی اور پوچھ پوچھ کر، بھلائی میں دیر کیسی؟ میاں جلدی کرو۔ لیکن پتا چلا کہ پہلے ہی اس کا ایک بوائے فرینڈ ہے۔ جس کا ہم دونوں کو بہت افسوس ہوا۔

امریکی قانون پر بات کرتے ہوئے اس نے کہا، ''قانون سخت ہے لیکن امریکی ڈاکو اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔'' میں نے پوچھا، ''اُدھر کبھی لٹنے کی سعادت حاصل ہوئی؟'' بولا، ''مجھے کسی نے نہیں لوٹا، البتہ ان کے ہاتھوں فائدہ ہوا۔ قصہ یہ کہ میں ایک پٹرول پمپ پر ملازم تھا۔ میرے پاس پٹرول کے تقریباً چار ہزار ڈالر جمع ہو گئے تھے کہ اتنے میں ڈاکو آ گئے۔ انھوں نے تمام افراد کو لوٹ لیا۔ خوش بختی سے میں پیسوں سمیت ٹائلٹ میں جا گھسا۔ ڈاکو چلے گئے تو باہر نکل آیا اور لٹنے والوں میں شامل ہو گیا۔ افراتفری میں کسی کو پتا نہ چلا۔ یوں میں اس رقم کا مالک بن گیا۔ اس دن، خدا کی قسم، مجھے پاکستانی ہونے پر فخر ہوا۔''

ایک دن حسبِ معمول ہم شطرنج اور چائے میں مشغول تھے کہ ایک مریضہ کو اس کے لواحقین تانگے پر لاد کر لائے۔ مریضہ بے ہوش تھی اور لواحقین گھبرائے ہوئے۔ ڈاکٹر نے شطرنج جلدی سے میز کے نیچے چھپا دی اور مریضہ کو دیکھنے لگا۔ میں اور آفتاب اٹھ کر باہر آ گئے اور پارک میں آ کر کھجوروں کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ہم آپس میں باتیں کرنے لگے کہ مریضہ نے کام خراب کر دیا ورنہ اس گیم میں ڈاکٹر پھنس گیا تھا۔ ڈاکٹر منور بیگ کچھ دیر مریضہ کو دیکھتا رہا لیکن اس کی سمجھ میں غالباً کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر پریشانی کے عالم میں اسؔ نے لواحقین کو جواب دے دیا۔ ان سے کہا کہ مریضہ کو دل کا زبردست اٹیک ہوا ہے لہٰذا اسے جلدی سے شہر لے جاؤ۔ ڈاکٹر کے جواب دینے پر لواحقین گھبرا گئے۔ وہ اس گومگو کی کیفیت میں تھے کہ اتنی جلدی کیا کیا جائے۔ مریضہ کو دوبارہ تانگے پر رکھا گیا۔ تانگا چلنے ہی کو تھا کہ آفتاب نے بھاگ کر مریضہ کی نبض پکڑ لی، پھر ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔ ڈاکٹر نے پاس

آ کر مریضہ کو دوبارہ دیکھا اور سر جھکا لیا۔ اس کیفیت میں میں دور ہی کھڑا رہا۔ غالباً یہ میری نفسیاتی کمزوری ہے کہ کسی کی تکلیف کو قریب سے نہیں دیکھ سکتا۔ خیر، ڈاکٹر اور آفتاب کو پریشان دیکھ کر ورثا سمجھ گئے اور دہاڑیں مار کر رونے لگے۔ دراصل مریضہ فوت ہو چکی تھی۔ کچھ راہ چلتے بھی کھڑے ہو گئے اور دلاسے دینے لگے۔ بہر حال، پانچ چھ منٹ میں تانگا رخصت ہو گیا اور دس منٹ کے اندر لوگ بکھر گئے، یہاں تک کہ ہم تینوں رہ گئے اور سنجیدہ ہو کر بیٹھ گئے۔

کچھ توقف کے بعد ڈاکٹر نے مجھے دیکھا اور بولا، ''کیوں علی صاحب، بندہ کس صفائی سے مرتا ہے؟'' میں چپ رہا مگر آفتاب نے سامنے سڑک کے اس پار پارک میں بارش کے پانی میں تیرتی بطخوں کو دیکھتے ہوئے کہا، ''کم از کم مجھے اس طرح کا مرنا پسند نہیں۔ یہ کیا کہ مریض کو پتا بھی نہ چلے اور وہ مر جائے، وہ بھی سڑک کے عین بیچ۔ امریکہ میں انسان اور حیوان دونوں ہسپتال میں مرتے ہیں اور اس صفائی اور آرام سے کہ تکلیف کا احساس نہیں رہتا۔ یوں تانگوں میں ذلیل نہیں ہوتے۔''

اس بات پر منور بیگ نے سرد آہ کھینچی اور میں نے فقط سر ہلا دیا۔

ہمیں متاثر ہوتے دیکھ کر وہ مزید بولا، ''بس یار، زندہ رہنے کا، مرنے کا اور مرنے کے بعد تک کا مزہ امریکہ میں ہے۔ یہاں تو (ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے) نیم حکیم ہیں، تانگے ہیں یا جوہڑ کے گندے پانی جن میں بطخیں تیرتی ہیں۔'' میں نے کہا، ''اگر جینے مرنے کا مزہ امریکہ میں ہے تو بالکل ہی اُدھر کیوں نہیں چلا جاتا؟ اِدھر کیا رکھا ہے؟'' بولا، ''سوچا تو میں نے بھی ہے، لیکن میری دو بیٹیاں ہیں۔ سوچتا ہوں، گوروں سے آنکھ لڑا بیٹھیں تو کیا ہوگا؟ اور قانون یہ ہے کہ والد تھپڑ مارے تو جیل جائے۔ البتہ ان کو بیاہ کر جاؤں گا اور پھر نہ آؤں گا۔'' اس گفتگو نے ہماری افسردگی دور کر دی اور ہم یہ بھی بھول گئے کہ ابھی ابھی ہمارے سامنے کسی کی موت واقع ہوئی ہے۔

کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے آفتاب کو پھر چھیڑا۔ ''یار، یہ تو پتا چل گیا کہ جینے اور مرنے کا مزہ مغرب میں ہے، لیکن مرنے کے بعد تک کے مزے سے تمھاری کیا مراد ہے؟ یعنی یہ کہ امریکی خدا سے بھی ہاتھ کر گئے اور جنت بھی لے اڑے؟''

آفتاب میری طرف دیکھ کر ہنسا۔ پھر بولا، ''جہاں تک جنت کا سوال ہے، امریکی تو ایک طرف، ہم بھی فارغ ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ وہ کھاتے ہوٹل میں ہیں، رہتے ٹھنڈ میں، مرتے

Scanned with CamScanner

ہسپتال میں اور دفن تابوت میں ہوتے ہیں۔ جبکہ یہاں کھاتے کچھ نہیں، مرتے سڑکوں پر ہیں اور دفن نہیں ہوتے بلکہ دابے جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر نے کہا، "کیا تابوت مٹی میں نہیں جاتا؟"

"جاتا ہے، مگر تو نے تابوت نہیں دیکھا،" آفتاب کہنے لگا۔ "ایک اعلیٰ پائے کی لکڑی کا صندوق جس کے اندر ایلومینیم کا ایک اور صندوق، اس کے اندر شاندار کپڑا، جاڑے اور گرمی میں مردے کا محافظ۔ بندہ صدیوں سوتا ہے اور مٹی کا منہ چڑاتا ہے۔ مجال ہے کفن کا تار بگڑے۔ اور یہاں؟ خدا کی پناہ، مذہبی فوجدار، غسال اور گورکن مردے سے گویا انتقام لیتے ہیں۔ ایک تو وہ بیچارہ مرتا ذلت سے ہے، اور رہی سہی کسر یہ نکالتے ہیں۔ چھ فٹ گہرا گڑھا کھودا، زمین پر چت لٹایا اور اوپر مٹی بھر دی۔ یعنی لاش اگر کل خراب ہونی ہے تو آج ہی ہو جائے۔ گرمیوں میں پسینے چھوٹیں اور سردیوں میں جاڑا مار دے۔ بھائی، میرا تو یہاں مرنے کو دل نہیں کرتا۔ جہاں تابوت نہیں وہاں بندہ کیا خاک مرا، بلکہ ذلیل ہوا۔"

"بس کرو میاں،" ڈاکٹر کہنے لگا، "ہمیں تو افسوس ہوتا ہے کہ ابا انگریز کیوں نہ ہوے۔ کاش امریکی ہوتے، چاہے موچی ہوتے۔ اب تابوت سے بھی رہے اور خوف آنے لگا ہے کہ ابھی مرے، ابھی خاک ہوے۔ بھائی، اب کے جاؤ تو دو تابوت بھجوا دینا، ہم پر احسان ہوگا۔" اسی چھیڑ چھاڑ میں مغرب کی اذان ہوگئی۔ میں اور آفتاب اٹھ کر چلے آئے۔

دوسرے دن میں کسی ملازمت کے حصول کے سلسلے میں شہر چلا گیا۔ وہاں دو ماہ رہا۔ اس دوران ڈاکٹر اور آفتاب سے ملاقات نہ ہو سکی، البتہ دو چار بار فون پر بات ضرور ہوئی۔ ملازمت چونکہ اچھی نہ تھی اور دوسری وجہ یہ کہ گاؤں یاد آنے لگا، لہٰذا جلد ہی لوٹ آیا۔ چار بجے کلینک پر گیا تو دونوں گپیں ہانک رہے تھے۔ میرے جاتے ہی منور بیگ نے بساط پر مہرے لگا دیے۔

کھیل کے دوران ڈاکٹر بولا، "چلو یار، آج تمھیں جان بوجھ کر جتوا دیتا ہوں کیونکہ کل آفتاب چلا جائے گا۔ کیا کہے گا، جاتے جاتے بھی ہار گیا۔"

میں نے کہا، "بعض لوگ جا کر بھی ہار جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر کہنے لگا، "یہ لوگ (آفتاب کی طرف اشارہ کر کے) نہایت کمینے ہیں، ہار کر بھی کچھ نہ

کچھ لے اڑتے ہیں۔''

''اور آپ سیّد زادے ہیں،'' آفتاب نے شاہ کو شہ دیتے ہوئے کہا،'' کہ ہر طرف عنایات کی بارش ہے۔''

''بھڑوے، تجھے شاطر کر دیا۔ سگریٹ، چائے اور کھانسی ہمارے لطف کا نتیجہ ہے،'' ڈاکٹر ہنستے ہوئے بولا۔'' ہماری صحبت میں ہی بیٹھنے سے تمھیں عقل آئی۔ اب لوگ تجھے اچھا بھلا دانشور سمجھتے ہیں۔ گویا اب تُو چلتا پھرتا کامریڈ ہے۔'' اس پر آفتاب ڈاکٹر کو ٹک ٹک دیکھنے لگا۔

یوں ہم سارا دن ہنستے رہے جبکہ گاہے گاہے ڈاکٹر مریض بھی دیکھتا رہا۔ دوسرے دن ہم آفتاب کو ایر پورٹ پر چھوڑ آئے کیونکہ یہ اس کا امریکہ جانے کا دن تھا۔

آفتاب کے جانے کے بعد میں اور ڈاکٹر گاؤں میں ہم مجلس رہ گئے۔ چار پانچ دن بعد آفتاب کا فون بھی آ جاتا اور کافی دیر تک ہماری باتیں ہوتی رہتیں۔ ڈاکٹر فون پر ہی اس کی اچھی بھلی خبر لے لیتا۔ دو ماہ اسی طرح نکل گئے۔ مگر پچھلے کوئی بیس دن سے اس کا فون نہ آیا۔ ہم تھوڑے سے پریشان ہوے کہ ایسا بے مہر آدمی تو نہ تھا، خدا جانے کیا بنی۔

ایک دن میں نے آفتاب کے بیٹے شہزاد سے پوچھا،'' تیرے ابا کا فون نہیں آیا؟'' اس نے کہا،'' وہ اُدھر ہسپتال میں داخل ہیں۔ آج پندرہ دن ہو گئے، تکلیف اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ وہ بات نہیں کر سکتے۔'' یہ بتاتے ہوئے وہ رو پڑا۔ میں نے اسے دلاسا دیا اور ڈاکٹر کو آ کر بتایا۔ لہٰذا اس دن ہم باتیں ہی کرتے رہے۔ شطرنج کھیلنا ویسے ہی بھول گئے۔

پارک میں کھڑا بارش کا پانی اب خشک ہو چکا تھا اور بطخوں کی جگہ آوارہ کتوں نے لے لی تھی جو ایک دوسرے پر غرا رہے تھے۔

اگلے دن رات کوئی ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا، اعلان ہوا کہ آفتاب جو امریکہ میں کسی ہسپتال میں داخل تھا، آج رات نو بجے فوت ہو گیا۔ میں دوڑ کر آفتاب کے گھر کی طرف گیا۔ ڈاکٹر پہلے ہی وہاں موجود تھا۔ آفتاب کے بیوی بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گھر میں داخل ہوئے تو آفتاب کے بچے ہم سے لپٹ گئے اور چیخ چیخ کر رونے لگے۔ ہمارے پاس دلاسا دینے کو الفاظ نہ تھے۔ فقط آنسو نکل آئے۔ دوسرے دن آفتاب کے بھائی اور رشتہ دار بھی آ گئے جن میں سے ایک

Scanned with CamScanner

ملک کا مشہور فلمی ایکٹر بھی تھا۔ تیسرے دن لاش آگئی۔ جسے دیکھ کر ہم ایک دم چونک گئے۔

لاش ایک بڑے اور خوبصورت تابوت میں تھی۔ میں اور ڈاکٹر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مگر چپ رہے۔ لاش آنے پر پورا گاؤں امڈ آیا۔ جونہی تابوت کھولا گیا، ایک کہرام مچ گیا۔ رونے کی آوازیں دردناک تھیں۔ اس کے بیوی بچے لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہے تھے۔ ہم پر بھی رقت طاری ہوگئی اور آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ فضا اس قدر بوجھل اور ماحول ایسا دردناک تھا کہ ہم زیادہ دیر تک لاش کے قریب نہ ٹھہر سکے۔ علاوہ ازیں، رفتہ رفتہ عورتوں کا ہجوم بڑھنے لگا تھا۔ لہٰذا ہم لاش سے دور ہٹ کر کھڑے ہو گئے اور تعزیت میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگے، جو پلٹتے ہوئے تابوت کا ذکر ضرور کرتے کہ کتنا خوبصورت اور چاندی سے زیادہ سفید ہے۔ عورتیں اس کے اندر کے کپڑے پر تبصرہ کر رہی تھیں۔

نوجوانوں اور بچوں کا الگ ہجوم فلمی اداکار کے گرد جمع ہو چکا تھا۔ وہ اتنے بڑے فلم اسٹار کو پہلے سکرین پر ہی دیکھتے رہے تھے لیکن آج اسے عین آنکھوں کے سامنے دیکھ رہے تھے۔ آفتاب کی لاش سے انھیں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ اس کی موت نے انھیں یہ موقع فراہم کیا۔

اِدھر آفتاب کے بھائیوں اور رشتے داروں کو یہ فخر حاصل تھا کہ ان کی وجہ سے امریکی تابوت اور معروف اداکار کو لوگ دیکھ سکے۔ اس عالم میں آفتاب کے بیوی بچے ہی صرف وہ لوگ تھے جنھیں تابوت دکھائی نہ دیا، خاص کر پانچ روپے رشوت لینے والے بیٹے کو، جو بالکل لاش کے اوپر لیٹا چیخ رہا تھا۔

شام چار بجے جنازہ اٹھایا گیا۔ جنازہ پڑھا گیا تو لوگوں نے باری باری آفتاب کا چہرہ دیکھا۔ جب تمام لوگ چہرہ دیکھ چکے تو آفتاب کا بڑا بھائی ارشد اچانک کھڑا ہو گیا اور لوگوں سے مخاطب ہو کر بولا، ''اے گاؤں والو! تابوت چونکہ ہر ایک کو بہت پسند آیا ہے، لہٰذا ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ تابوت گاؤں والوں کو دے دیں تاکہ وہ اپنے مرنے والوں کو اس میں ڈال کر قبرستان لے آیا کریں، اور آفتاب کو بغیر تابوت کے دفن کرتے ہیں۔'' ارشد کے اس اعلان پر تمام لوگوں نے خوشی کا اظہار کیا اور اسے تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھا، بلکہ مولوی صاحب نے اس بات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرمایا، ''ارشد نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے، کیونکہ ویسے بھی لاش کو ایلومینم کے تابوت میں دفن کرنا شرعاً جائز

Scanned with CamScanner

نہیں۔ منکر نکیر کو دقت پیش آتی ہے۔'' ارشد کے اس اعلان اور مولوی کے فتوے کی وجہ سے میرے اور ڈاکٹر کے سر پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جی چاہا کہ آگے بڑھ کر ان کا منھ نوچ لیں مگر ایسا نہ کر سکے۔

خیر، جنازہ پڑھنے کے بعد اکثر لوگ چلے گئے، چند ایک رُکے رہے۔ یہاں تک کہ تابوت کو قبر کے نزدیک لے جا کر کھولا گیا۔ تین لوگوں نے مل کر آفتاب کی لاش باہر نکالی۔ دوسرے لوگوں نے کلمۂ شہادت بلند کیا۔ اس کے بعد دو شخص قبر میں اترے اور کلمۂ شہادت کے ورد کے ساتھ قبر میں اسے ننگی زمین پر لٹا دیا۔ پھر مٹی ڈالی جانے لگی۔

اس تمام عمل کے دوران میں اور ڈاکٹر تماشا بنے کھڑے رہے۔ ہم نے نہ تو کلمۂ شہادت پڑھا، نہ لاش کو ہاتھ لگایا اور نہ ہی مٹی ڈالی، جیسے مرنے والا کوئی اجنبی ہو۔

❄❄

Scanned with CamScanner

علی اکبر ناطق

شریکا

''یہ سکھڑا اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟ حرامزادہ سوٗر کی طرح اکڑ کے چلتا ہے، اوپر سے گھورتا بھی ہے۔'' شوکا اس وقت غصے میں تھا۔

''شوکے! ذرا تحمل سے کام لو اور ٹھنڈے دل سے سوچو،'' دارا بولا۔

''دارے خاں! اب صبر نہیں ہوتا۔ بات حد سے نکل گئی،'' جاگیرے نے اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے کہا۔

''آخر یہ عاقل خاں ہماری ساری برادری سے طاقتور تو نہیں؟ کل کھوہ سے آتے ہوئے ٹانگیں توڑ دو۔''

''لیکن...''

''لیکن ویکن کچھ نہیں،'' غفارے نے دارے کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہم اتنے بے غیرت بھی نہیں ہوئے کہ عاقل خاں دن دیہاڑے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالے۔ اور اب تو بات کمیوں کے منہ پر بھی آ گئی ہے۔''

ڈیرے میں بیٹھا ہر شخص آج طیش میں تھا، اس لیے بات دارے کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لڑائی ہو اور بات آس پاس کے گاؤں میں بھی پھیل جائے، مگر رات کے بارہ بجے ایک فیصلہ ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

سردار نتھا سنگھ کی قلعہ نما حویلی گاؤں کے مرکز میں تھی، جس میں سکھوں کے پچاس گھر آباد تھے جن کی اکثریت زمینداروں کی تھی۔ گاؤں میں زمین تو چودھری سردار محمد عرف دارے خاں اور سردار احمد بخش کی بھی کافی تھی، لیکن رعب داب نتھا سنگھ کا ہی تھا۔ سکھ مسلمان کا تعصب بالکل نہیں تھا۔ گاؤں والے دکھ درد کے سانجھے اور صدیوں سے ایک دوسرے کے مددگار تھے۔ الغرض، زندگی امن سے چل رہی تھی کہ اچانک تقسیم کا عذاب آپڑا۔ ساری فاختائیں اڑ گئیں۔ نتھا سنگھ کو بھی حویلی چھوڑنا پڑی۔ چھکڑوں پر سامان لد گیا اور سارا قبیلہ لدھیانے کے لیے بیل گاڑیوں پر سوار ہو گیا۔ چلنے سے پہلے افراد گنے گئے تو معلوم ہوا کہ شیر سنگھ غائب ہے۔ ہزار ڈھونڈا مگر پتا نہ چلا۔ آخر کار نذیرے تیلی نے خبر دی۔

''سردار جی! شیر سنگھ مسجد میں بیٹھا مولوی جان محمد سے کلمہ پڑھ رہا ہے۔''

یہ سن کر سردار جی کے ہوش اڑ گئے۔ خبر دھویں کی طرح اٹھی تو مائی دھیراں نے دو ہتڑ پیٹا اور بین کرنے لگی۔ نتھا سنگھ نے جلدی سے دلبیر کو بھیجا کہ بھائی کو لے کے آئے۔ اس نے لاکھ منتیں کیں مگر اس کو نہ آنا تھا، نہ آیا۔

قافلہ تین دن رکا رہا۔ مائی باپو نے کیا کیا نہ سمجھایا، مگر شیر سنگھ ٹس سے مس نہ ہوا۔ کیس کٹوا، کڑا کرپان نتھا سنگھ کے منہ پر ماری اور مُسلا ہونے کا اعلان کر دیا۔ آخر سردار جی نے بیٹے کی ہٹ دھرمی کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ حویلی کی چابیوں کے علاوہ سوا یکڑ زمین کے کاغذات بھی اس کے حوالے کیے، روتی پیٹتی دھیراں کے ساتھ باقی اولاد کو لیا اور لدھیانہ چلا گیا۔

اِدھر گاؤں میں شادیانے بجنے لگے۔ مولوی جان محمد نے شیر سنگھ کا نام عاقل خاں رکھ دیا کہ اس نے مسلمان ہو کر بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ دوزخ اور ہجرت دونوں سے بچا۔

نتھا سنگھ کی حویلی جو اب عاقل خاں کے پاس تھی، اس کی دیوار دارے خاں کے چھوٹے بھائی جمال دین کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ شیداں اسی جمال دین کی بیٹی، ناک نقشے کی درست، بے باک طبیعت کی مالک تھی۔ ادھر یہ بیس سال کا خوبصورت جوان تھا۔ لہٰذا کبھی یہ دیوار سے اُدھر، کبھی وہ دیوار سے اِدھر۔ تقسیم کو تین سال ہو گئے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یوں آرام سے نبھ رہی تھی کہ ایک دن عاقل خاں نے جانے کیا سوچ کر جمال دین سے رشتہ مانگ لیا۔ اس وقت چودھری بدکے اور انھیں

Scanned with CamScanner

معاملے کی سنجیدگی کا احساس ہوا۔ فوراً انکار کر دیا بلکہ لین دین بھی ختم کیا۔ اس نے بڑا زور مارا لیکن کوئی بس نہ چلا۔ لاکھ زمینوں والا سہی، آخر ہے تو سکھ کا بیٹا۔ چودھری رشتہ دے کر زمانے کو کیا منہ دکھاتے۔

بالآخر شیداں دارے خاں کے بیٹے شوکے سے بیاہ دی گئی۔ مگر یہ بھی نچلا نہ بیٹھا، برابر ملتا رہا۔ پانچ سال ہونے کو آئے، اُس کے دو بچے ہو گئے، مگر اِدھر وہی جذبہ، بلکہ اب تو احتیاط بھی کچھ باقی نہ رہی اور بات دور تک نکل گئی۔ کچھ لوگ تو یہاں تک کہنے لگے کہ بچے شوکت سے نہیں، عاقل خاں سے ہیں۔

شوکے نے شیداں کو لاکھ مارا پیٹا، کئی دفعہ عاقل خاں کو بھی دھمکایا، لیکن نتیجہ سوائے بدنامی کے کچھ نہ نکلا۔ کئی دفعہ چودھریوں کی نیت بدلی مگر عملی کارروائی نہ کر سکے۔ اس طرح کچھ وقت اور گزر گیا۔ آخر چودھری کہاں تک برداشت کرتے، اس لیے انھیں اب حتمی فیصلہ کرنا پڑا۔

وہ کھوہ پر پہنچا تو شبیرا بھینسوں کو چارا ڈال رہا تھا۔ اس نے اپنی چھوی، جس کا دستہ چھ فٹ لمبے بانس کا تھا، شرینہہ کے تنے کے ساتھ لگا دی اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس نے سوچا، میں بھی کوئی بزدل نہیں، آدھ سیر دیسی گھی تو میری ایک دن کی خوراک ہے۔ گاؤں میں بس یہ شبیرا ہی ایک ایسا ہے جو میرے مقابلے کا ہے۔ لیکن یہ بھی میرا ہی آدمی ہے۔ ویسے بھی جب یہ فیروز پور سے آیا تھا تو میں نے ہی اس کی مدد کی، رہنے کو اپنے کھوہ پر جگہ دی۔ آج سات سال ہو گئے، میری ہی زمین کاشت کرتا ہے۔

اس نے سوچا، یہ بھی اچھا ہی ہوا جو شبیرا میرے پاس ہی چلا آیا۔ گاؤں میں کوئی تو ایسا ہے جو میرا اپنا ہے۔ ابھی خیالوں میں گم تھا کہ شبیرا پاس آ بیٹھا۔ شبیرے کو دیکھ کر عاقل خاں اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر عاقل خاں کی طرف دیکھتے ہوئے شبیرا بولا، ''بھائی عاقل خاں، آج کل چودھریوں کے تیور ٹھیک نظر نہیں آتے۔''

''لگتا مجھے بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟'' عاقل خاں اٹھتے ہوئے بولا۔

''کرنا کیا ہے؟ میں تو کہتا ہوں، شیداں کا پیچھا اب چھوڑ ہی دے۔ کہیں کوئی نقصان نہ ہو

جائے۔'' شبیرے نے دھیمے سے کہا۔

''شبیرے، یہ نہیں ہوسکتا!'' عاقل خاں بولا۔

''آخر کیوں نہیں ہوسکتا؟'' شبیرے نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اسی بے چاری کی خاطر تو میں نے واہگرو سے بے وفائی کی، دین دھرم بدلا اور ساری برادری سے لعنتیں لے کر مُسلا ہوا۔ جب سارا قبیلہ لدھیانے چلا گیا تو میں نے اسی کی خاطر گاؤں نہ چھوڑا اور شیر سنگھ سے عاقل خاں بنا، بے بے روتی پیٹتی چلی گئی۔''

کچھ دیر رک کر بولا،'' پھر تو بھی تو میرے ساتھ ہے۔ ان کو پتا ہے کہ دو شیر سنبھالنے مشکل ہیں۔''

شبیرا یہ سن کر کچھ دیر چپ رہا۔ پھر کہنے لگا،'' بھائی عاقل خاں، ٹھیک ہے میں تیرے ساتھ ہوں۔ آخر تجھے بڑا بھائی سمجھتا ہوں۔ لیکن پھر بھی احتیاط سے۔''

جب آٹھ دس دن فیصلے کو ہو گئے اور چودھریوں کی طرف سے کوئی کارروائی نہ ہوئی تو عاقل خاں پھر حوصلے میں آ گیا۔ دوسرا غضب یہ ہوا کہ سردار احمد بخش نے پیغام بھیج دیا، جس کا دارے خاں سے شریکا تھا۔

''عاقل خاں، کوئی بات نہیں۔ حوصلہ رکھنا۔ ہم تیرے ساتھ ہیں۔ آخر سردار نتھا سنگھ کو میں نے بھائی کہا تھا۔ آج اس کے بیٹے کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں گا۔''

ان باتوں سے عاقل خاں پہلے سے بھی شیر ہو گیا اور کھل کھیلنے لگا، اور بات یہاں تک پہنچی کہ چودھریوں کے محلے سے گزرتے ہوئی اونچی اونچی کھانستا اور طرح طرح کے آوازے بھی کسنے لگا۔

''سن دے سی گے، میدان لگنا وا۔ پر چپ چاند ای ہوگئی آ۔ بیبا! شیراں نال میدان لانے کوئی سوکھی گل آ۔ پن سیری کلیجہ چاہی دا، پن سیری۔''

آج نو چندی تھی۔ گاؤں کی غریب عورتیں اور بچے عاقل خاں کے کھوہ پر جمع تھے۔ عاقل خاں بھینسوں کا دودھ ان میں تقسیم کرنے لگا۔ ہر نو چندی کو دودھ تقسیم کرنے کی رسم اس کے دادے سردار موہن سنگھ سے چلی آتی تھی۔ جب شام کا جھٹپٹا سا ہو گیا، عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھروں کو

Scanned with CamScanner

چلے گئے تو عاقل خاں کچھ دیر بیٹھ کر حقہ پیتا رہا، پھر اس نے ایک ہاتھ میں اپنی چھوی اور دوسرے میں کتیا کی زنجیر پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جاتے جاتے شبیرے کو آواز دی (آج اس نے رہٹ چلایا ہوا تھا)۔

"لے شبیرے، رب راکھا، میں چلیا۔ تو اج کماد نوں پانی لا کے سونا۔"

شبیرے نے ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ بے فکری سے چلتا ہوا جیسے ہی چودھریوں کے محلے کے نکڑ پر پہنچا، کچھ جوانوں نے راستہ روک لیا۔

شوکا سب سے آگے تھا۔ اس نے کہا، "لے عاقل خاں! ہم نے آج پن سیری کلیجہ کر لیا اور میدان میں بھی آ گئے۔ تو سنبھل لے۔"

عاقل خاں ایک دفعہ تو گھبرا گیا لیکن جلد ہی خود کو سنبھالا۔ کتیا کی زنجیر کھول دی اور چھوی کو مضبوطی سے پکڑ کر ڈٹ گیا۔

ڈانگوں اور چھویوں کا مینھ برسنے لگا۔ عاقل خاں بے جگری سے لڑ رہا تھا۔ ڈانگوں کے کھڑکنے کی آواز دور تک سنائی دینے لگی جس کی دھمک شبیرے کے کان میں بھی جا پڑی۔ اس نے سوچا، ہو نہ ہو، چودھری عاقل خاں سے بھڑ گئے ہیں۔ اِس نے جلدی سے اپنی ڈانگ پکڑی اور امداد کو بھاگا۔

لڑائی تو دو منٹ میں ہی ختم ہو جاتی، مگر عاقل خاں کی کتیا غضب کی نکلی، اچھل اچھل کر چودھریوں کو کاٹنے لگی۔ اِدھر عاقل خاں کے ساڑھے چھ فٹ قد اور لمبے دستے والی چھوی نے بھی بڑا کام کیا، دو تین چودھری زخمی کر کے گرا دیے، مگر کہاں تک۔ آخر پانچ منٹ بعد ہی عاقل خاں بھی گر گیا۔ شبیرا پہنچا تو چودھری جا چکے تھے، باقی خلقت موجود تھی۔ شبیرا چودھریوں کو گالیاں دیتے ہوئے جب عاقل خاں کے نزدیک آیا اور اسے اٹھانے کی کوشش کی تو وہ اٹھ نہ سکا۔ اِس نے دیکھا کہ دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور کتیا پاس کھڑی زخمی حالت میں شدت سے بھونک رہی تھی۔

خیر، دس بجے کے قریب شبیرے نے عاقل خاں کو شہر کے ہسپتال پہنچایا۔ علاج شروع ہو گیا۔ دوسرے دن رپٹ درج کرا دی اور مقدمہ چل پڑا۔

Scanned with CamScanner

ادھر شبیرے کی توجہ اور گھی دودھ کی بدولت عاقل خاں کے زخم جلد ہی بھرنے لگے، یہاں تک کہ چند ماہ میں ہی دوبارہ چلنے پھرنے لگا مگر ٹانگوں میں ایک لنگ سا پیدا ہو گیا کہ دور سے ہی عیب ظاہر ہو جاتا تھا۔ یعنی وہ پہلی سی بات نہ رہی۔ پھر بھی اس نے بد دلی ظاہر نہ ہونے دی اور بجائے پیدل چلنے کے گھوڑے پر بیٹھ کر کھوہ پر آنے جانے لگا۔

دوسری طرف چودھریوں نے ٹانگیں تو توڑ دیں مگر شبیرے اور احمد بخش نے انھیں کیس میں ایسا الجھایا کہ جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ مقدمہ طول پکڑ گیا حتیٰ کہ سالوں لمبا ہو گیا۔ اِدھر رفتہ رفتہ عاقل خاں کا عشق بھی سرد پڑ گیا، کیونکہ ایک تو جسم میں وہ تاب نہ رہی اور دوسرا مقدمے کے الجھاوے نے توجہ بانٹ دی۔ مگر ایک کسک سی دل میں اب بھی باقی تھی۔

پھر ایک دن کچھ لوگوں نے دونوں پارٹیوں میں صلح کرا دی، جس میں چودھریوں کو کچھ تاوان پڑ گیا۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ نہ جانے کیوں عاقل خاں اب بجھا بجھا سا رہنے لگا۔ بات بھی کم کم ہی کرتا۔ بڑی دفعہ شبیرے نے حوصلہ بھی دیا مگر اس پر ایک اداسی چھائی رہتی۔ اب وہ رات کو اکثر گاؤں آنے کے بجائے شبیرے کے پاس کھوہ پر ہی رہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی چپکے سے رو بھی لیتا۔ اس طرح کئی سال مزید گزر گئے۔ آخر ایک دن شبیرے سے کہنے لگا، ''شبیرے! کچھ دنوں سے بے بے بہت یاد آ رہی ہے۔ اس کا جاتے وقت کا روتا ہوا چہرہ آنکھوں سے نہیں ہٹتا۔ جانے کیوں، آج میرا دل کرتا ہے، پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ اب تو کئی سال خط آئے کو بھی ہو گئے۔ پتا نہیں چھوٹی جیناں کا کیا حال ہو گا۔ بختاں ماری بیاہ دی گئی ہو گی۔ جانے لگی تو میری ٹانگوں سے چمٹ گئی کہ ویرے کو ساتھ لے جاؤں گی وا ہگرو کی سونہہ، رات کو نیند نہیں آتی۔''

کچھ دیر رک کر آنسو پونچھتے ہوئے پھر بولا، ''شبیرے! کوئی سب کچھ مجھ سے لے لے، پر مجھے باپو اور بے بے تک پہنچا دے۔''

عاقل خاں کی باتیں سن کر شبیرے کے بھی آنسو نکل آئے۔ اسے بھی اپنے ماں باپ یاد آ گئے جو اٹھارہ سال پہلے فیروز پور سے آتے ہوئے بلوے میں مارے گئے تھے۔

پھر ایک دن عاقل خاں نے تحصیل جا کر دس ایکڑ زمین شبیرے کے نام کر دی اور لدھیانے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ عاقل خاں اپنی زمین بیچ کر لدھیانے جانا

Scanned with CamScanner

چاہتا ہے۔ بات جونہی احمد بخش کے کان تک پہنچی، اس نے زمین خرید نے کا ارادہ کرلیا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اتنی اچھی اور نئے کی زمین ہاتھ آنے کا اس سے اچھا اور سستا موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس نے عاقل خاں سے کہا، ''عاقل خاں! سردار نتھا سنگھ میرا بھائی بنا تھا اس لیے پہلا حق میرا ہے۔'' خیر، عاقل خاں احمد بخش کے ہاتھ زمین بیچنے کو تیار ہو گیا۔ ادھر چودھریوں کو پتا چلا تو وہ پیچ و تاب کھانے لگے۔ احمد بخش کا عاقل خاں سے زمین خریدنا انھیں بالکل گوارا نہ تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ عاقل خاں دارے خاں کو زمین کبھی نہ دیتا۔ یہ دارے خاں کو بھی پتا تھا۔

مغرب کی نماز کے بعد تو مسجد کے دروازے پر اس زمین کے معاملے میں چودھری دارے خاں اور احمد بخش کے درمیان کافی لے دے بھی ہوئی اور دارے خاں نے احمد بخش کو یہاں تک دھمکی دے دی کہ تُو ہمیں نہیں جانتا، شریکے کے معاملے میں ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ زمین ہماری زمینوں کے ساتھ پڑتی ہے، اس لیے زمین اگر خریدیں گے تو ہم ہی۔ اس پر سردار احمد بخش تمسخرانہ انداز میں ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔ دوسرے دن احمد بخش رقم اور گواہ لے کر تحصیل پہنچ گیا کہ شام اس کے ساتھ عاقل خاں کی بات پکی ہو گئی تھی، لیکن اس نے دیکھا کہ دارے خاں کچھ آدمیوں کے ساتھ پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا اور پھر یہ سن کر تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچا کہ عاقل خاں نے کچھ ہی دیر پہلے زمین دارے خاں کے ہاتھ بیچ دی ہے۔ احمد بخش نے عاقل خاں کی طرف مڑ کر بگڑتے ہوئے پوچھا، ''یہ تو نے کیا کیا، تجھے حیا نہ آئی؟''

اس پر عاقل خاں نے سر جھکا کر کہا، ''چاچا احمد بخش! رات دارے خاں کے ساتھ وہ آئی تھی — اب تو ہی بتا، میں شیداں کی بات کیسے ٹال دیتا؟''

❋❋

Scanned with CamScanner

آج کی کتابیں

کہانیاں

آئینۂ حیرت اور دوسری تحریریں	سید رفیق حسین	Rs. 375
عطرِ کافور	نیر مسعود	Rs. 80
زبدا اور دوسری کہانیاں	اسد محمد خان	Rs.180
خطِ مرموز	فہمیدہ ریاض	Rs.100
ایک اور آدمی	حسن منظر	Rs.85
عاقبت کا توشہ	نکہت حسن	Rs.85
دور کی آواز	فیروز مکرجی	Rs.150
صحرا کی شہزادی	سکینہ جلوانہ	Rs.120

کہانیوں کے ترجمے

ایرانی کہانیاں	انتخاب اور ترجمہ: نیر مسعود	Rs.90
عربی کہانیاں	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 1)	ترتیب اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 2)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
ہندی کہانیاں (جلد 3)	ترتیب: اجمل کمال	Rs.180
کارل اور اینا	(منتخب ترجمے) محمد سلیم الرحمن	Rs.80
گم شدہ خطوط	(منتخب ترجمے) محمد عمر میمن	Rs.90
مہرِ سکوت	(منتخب ترجمے) زینت حسام	Rs.120
کلی منجارو کی برفیں	(منتخب ترجمے) محمد خالد اختر	Rs.120

Scanned with CamScanner

انتخاب

منتخب تحریریں	گابریئل گارسیا مارکیز	ترتیب: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
منتخب تحریریں	نرمل ورما	ترتیب: اجمل کمال	Rs.280
منتخب کہانیاں	ویکوم محمد بشیر	ترتیب: مسعود الحق	Rs.180
پریم وانی	میرا بائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395

ناول

بیس سو گیارہ	محمد خالد اختر	Rs. 70
گنگا جمنی میدان	اختر حامد خاں	Rs.120
دائرہ	محمد عاصم بٹ	Rs.100
نمبردار کا نیلا	سید محمد اشرف	Rs.60

ناولوں کے ترجمے

تمس	بھیشم ساہنی	ترجمہ: شہلا نقوی	Rs.180
قلبِ ظلمات	جوزف کونریڈ	ترجمہ: محمد سلیم الرحمن	Rs.80
بوفِ کور	صادق ہدایت	ترجمہ: اجمل کمال	(زیرِ طبع)
خیمہ	میرال طحاوی	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.75
نوکر کی قمیض	ونود کمار شکل	ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال	Rs.100
پہلی بارش	خولیولیا مازاریس	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.95
سرزمین مصر میں جنگ	یوسف القعید	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.125
درخت نشین	اتالو کلوینو	ترجمہ: راشد مفتی	Rs.175
شہزادہ احتجاب	ہوشنگ گلشیری	ترجمہ: اجمل کمال	Rs.70
انگی کے دیس میں	ولاس سارنگ	ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال	Rs.150
امید اور دوسرے خطرناک مشاغل	لیلیٰ العلمی	ترجمہ: محمد عمر میمن	Rs.100

Scanned with CamScanner

شاعری

پریم وانی	میرابائی	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کبیر بانی	کبیر	ترتیب: سردار جعفری	Rs.395
کلیات اختر الایمان	اختر الایمان	ترتیب: سلطانہ ایمان، بیدار بخت	Rs.350
مٹی کی کان	افضال احمد سید	(کلیات)	Rs.500
روکوکو اور دوسری دنیائیں	افضال احمد سید		Rs.50
آدمی کی زندگی	فہمیدہ ریاض		Rs.70
ساری نظمیں	ذی شان ساحل	(کلیات)	(زیر طبع)
جنگ کے دنوں میں	ذی شان ساحل		Rs.125
ای میل اور دوسری نظمیں	ذی شان ساحل		Rs.150
نیم تاریک محبت	ذی شان ساحل		Rs.100
رات	سعید الدین		Rs.50
سائے چراغ کے	احمد عظیم		Rs.150
مٹی کا مضمون	فرخ یار		Rs.150
سویرے کا سیاہ دودھ	پاؤل سیلان	ترجمہ: آفتاب حسین	Rs.150
بارہ ہندوستانی شاعر	(انتخاب)	ترتیب: اجمل کمال	(زیر طبع)
خودکشی کے موسم	زاہد امروز		Rs.120

Scanned with CamScanner

نئی کتابیں

آج

(پہلی جلد)

ترتیب: اجمل کمال

Rs.795

ثقافتی گھٹن اور پاکستانی معاشرہ

ارشد محمود

R s.200

تیسری جنس

سندھ کے خواجہ سراؤں کی

معاشرت کا ایک مطالعہ

مؤلف: اختر حسین بلوچ

Rs.200

شہزادہ احتجاب

(ناول)

ہوشنگ گلشیری

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

Rs.70

ریت پہ بہتا پانی

(شاعری)

قاسم یعقوب

Rs.160

اردو کا ابتدائی زمانہ

(تنقید و تحقیق)

(تیسرا ایڈیشن)

شمس الرحمٰن فاروقی

Rs.250

امید اور دوسرے خطرناک مشاغل

(ناول)

لیلیٰ العلمی

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن۔

Rs.100

اِنگی کے دیس میں

(ناول)

ولاس سارنگ

مراٹھی سے ترجمہ: گوری پٹوردھن، اجمل کمال

Rs.150

Scanned with CamScanner

سہ ماہی ادبی کتابی سلسلے ''آج'' کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 65 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ ''آج'' کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابریئل گارسیا مارکیز، ''سرائیوو سرائیوو'' (بوسنیا)، نرمل ورما، اور ''کراچی کی کہانی'' کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

''آج'' کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور ''آج کی کتابیں'' اور ''سٹی پریس'' کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 600 روپے
بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ ''شب خون'' الٰہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

۶۷

قیمت

۲۵۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،
صدر، کراچی ۷۴۴۰۰